

نیا اضافہ شدہ ایڈیشن

زیر و پویش

جاوید چودھری



WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM

ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN



PAKSOCIETY1



PAKSOCIETY

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

زیر پوائنٹ 1

زیر پوائنٹ 1

جاوید چودھری
Kashif Azad @ OneUrdu.com

علم و عرفان پبلشرز
الحمد مارکیٹ 40۔ اردو بازار، لاہور
فون: 7352332-7232336

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ

نام کتاب	زیرِ پلاست 1
مصنف	جادیہ چودھری
ناشر	گل فرازا احمد
طبع	علم و عرفان پبلشرز، لاہور
پروف ریڈنگ	زاہدہ نوحہ پرنٹرز، لاہور
کمپوزنگ	ملک محمد زاہد
من اشاعت	انیس احمد
قیمت	اکتوبر 2009ء
	500/- روپے

بہترین کتاب چھپوانے کے لئے رابطہ کریں۔ 0300-9450911

کاشف آزاہ © OneUrdu.com
علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔ اردو بازار، لاہور
فون: 7352332-7232336

کتاب گھر
اقبال روڈ، سیمٹی چوک، راولپنڈی
خزینہ علم و ادب
انکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور
اشرف بک ایجنسی
اقبال روڈ، سیمٹی چوک، راولپنڈی
ولیم بک پورٹ
اردو بازار، کراچی

ادب و علم و عرفان پبلشرز کا مقصد اس کتاب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ سیارہ کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی مٹی آدھری یا کسی کو قصہ بن بیچنا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جہت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم، انسانی طاقت اور ربط کے مطابق کچھ نئے مضامین جمع اور جلد سازی میں ہماری امتیازی کمی ہے۔ ہماری تقاضے سے اگر کوئی غلطی یا منوعات درست نہ ہوں تو ان کو واکرم مطلع فرمادیں۔ انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائے۔ (عشر)

انٹرنیٹ

اپنے ابا جی

Kashif Azad @ OneUrdu.com

ترتیب

11	مجرم حاضر ہے
14	ہم وکھڑی ٹاپ کے بھکاری ہیں
17	ہم سب کوئی ہیں
20	ہم امریکہ کے غلام نہیں ہیں
23	ہم انٹرمیم بھگودیں گے
26	عورت
29	کچھ اپنے بارے میں
32	فرسودہ لوگ
35	نجات دہندہ
38	ایک زندہ شخص
41	سر دیوں کی شاموں میں کرم دو پہر کی یاد!
44	دی لیبرل پریذیڈنٹ
47	ایک سوئس صدی کا ولی
50	ٹھنڈے سائے والا
53	باغی
55	مقناطیس کا پہاڑ
58	دولائیں
61	لارنس آف عربیہ
64	قلش
68	طیفا بد معاش
71	تیسرا ڈنگ
74	مدینے کا شہید
76	نقب زن
79	احتجاج نہ احتساب

Kashif Azad @ OneUrdu.com

82	پرائم فیسٹر سیکرٹریٹ
86	کاش یہ سوینن ہوتا
88	شخص کی دکان میں ہاتھی
91	مینڈل سن شرمندہ تھا
94	بنیاد سے اکھڑی تو میں
97	معاف کیجیے گا
100	بارود کا لباس
103	ذات کے خلا
106	کافد کی حکومت
109	این کاؤنٹر نو
112	ایک روٹی کا سوال ہے بابا
116	فکری لو لے لنگڑے
119	بھوسے میں دبی آگ
123	ویڈیو جزییشن
126	گارے کی دیوار
129	بھیریں
132	آف دی ریکارڈ
136	خانہ بدوش
139	ہے گناہ
142	مولوی ڈلا
145	موتجو داڑو کے کلرک
148	کیریمٹ فارمولا
151	گواہ
154	خربوزے کی چھریوں سے دوستی
157	سونی
160	وہاں کوئی ٹم نہیں تھا
163	کینگر و پھر جنگل سے باہر تھا

Kashif Azad @ OneUrdu.com

- 165 علاج
- 167 "چی چی ٹھک"
- 170 کچھ وقت تو لگے گا
- 173 مکمل سوال
- 176 تو کیا ہوگا؟
- 178 جاگنے والے
- 181 پوچھنے والا کوئی نہیں
- 184 آقا
- 187 "دو گھنٹے"
- 190 کہیں ایسا نہ ہو جائے
- 193 چیلوں کے گھونسلے
- 196 تکیس چوری
- 199 پا جوج ما جوج
- 202 دمی ٹرین
- 205 کی کری جانا اے
- 208 کنا دور بانہ صیں
- 211 روکو، روکو
- 214 انہیں ٹھک چاہیے
- 216 شیدا چور
- 219 کنسنٹ
- 222 چائے بیٹھی نہیں ہوتی
- 224 "بالٹیاں"
- 227 مردہ فردشوں کی منڈی
- 230 زندہ عداوتوں سے ایک مردہ سوال
- 234 عداوتیں یا باد بانی کشتیاں
- 237 زمین چاٹ جائے گی
- 239 جھکڑیاں

Kashif Azad @ OneUrdu.com

242

میل

245

چاروں اور پانچ راتیں

248

تم استحان پر پورے نہیں اترے

250

ٹریا کا کیا بنتا

252

بندر آنکھیں مانگتا ہے

254

یزید کے دور میں حسین کی ضرورت

257

موجو داڑو میں زندگی کی تلاش

260

بچے روئی مانگتے تھے

262

مگدھوں کے شہر میں انسان کی موت

264

خودکشی

267

یہ بات اچھی نہیں

270

مرنے کا حق

273

معافی یا رسول اللہ ﷺ معافی

276

نیک مینی

280

قرباد

283

ہذا حرام

287

اعتماد

291

معجزے

294

نئے پاؤں

297

ماچس کی تیلی

300

محبت اور آزادی

303

ہیلپ می گاڈ

306

مجھے بچائیں

309

تھینک یو ملک صاحب

312

روشنی ہی روشنی

315

قوم تو بری نہیں

318

آئیے سوچیں

Kashif Azad @ OneUrdu.com

مجرم حاضر ہے

شاید سردیاں تھیں یا گرمیاں میری ماں کو میری تاریخ پیدائش یاد نہیں۔ میں نے اس سے جب بھی پوچھا، اس کا جواب حریت، بے بسی اور تاسف ہی تھا۔ میرے سوالوں پر میری ماں کا یہی رد عمل ہوتا چاہیے تھا کیونکہ اس نے مجھے گہرات کے جس پہرے گاؤں میں جنم دیا تھا وہاں صرف پیدائش ہوتی ہے تاریخ پیدائش نہیں۔ بلکہ نہیں ٹھہریے وہاں شاید تاریخ بھی نہیں ہوتی کیونکہ تاریخ کے لیے کیلنڈر بدلنا، مہینوں کا گزرتا اور برسوں کا بیتا ضروری ہوتا ہے جبکہ وہاں میرے گاؤں میں پچھلے آٹھ دس ہزار سال سے ایک ہی مہینہ، ایک ہی سال، ایک ہی تاریخ ہے وہاں اشوکا عہد کا "خیلو" اور اکیسویں صدی کا "فضلو" ایک ہی چارپائی پر بیٹھے حق مگر گزارتے اور ماہیے گاتے ہیں۔

Kashif Azad @ OneUrdu.com

میری ماں بچپن میں مجھے ایک لمبا کرتا پہنا دیتی تھی۔ اس کرتے نے اس وقت تک میرا ساتھ دیا جب تک یہ سکڑتا سکڑتا میری ناف تک نہ آپہنچا۔ (یہ مسئلہ آج تک حل طلب ہے کہ میں پھیلتا رہا تھا یا کرتا سکڑتا رہا تھا) یہ کرتا میرا پہلا استاد تھا کیونکہ اسی کرتے نے مجھے پہلا لفظ سکھایا تھا، وہ لفظ تھا "شرم"۔ میں جب کبھی بچپن میں ناک صاف کرنے کے لیے سرعام کرتا اوپر اٹھاتا تھا تو میرے قریب سے گزرتے میرے چاچے مائے "اوائے، اوائے شرم کر، شرم کر" کا نعرہ لگا کر مجھے شرمندہ کر دیتے تھے۔ بچپن کے اس "درس نظامی" نے مجھے بہت ہی چھوٹی عمر میں کرتے اور شرم کا تعلق سمجھا دیا لہذا میں نے آنے والی زندگی میں کرتے کا دامن اٹھایا اور نہ ہی کبھی پھیلتا یا۔ مجھے یقین ہے میں آئندہ زندگی میں بھی ان علتوں سے محفوظ رہوں گا کیونکہ میرا رب شرم والوں کی شرم محفوظ رکھتا ہے۔

اڑھائی برس تک میرے والدین نے میرا نام نہیں رکھا۔ ان کا خیال تھا نام کی ضرورت تو بڑوں کو ہوتی ہے، بچے بچے ہوتے ہیں انہیں اوائے کہہ کر پکار لیا جائے یا کا کا، بچو یا سنا کہہ دیا جائے کام چل جاتا ہے۔ یہ کام کا کے، بچو اور سننے کی دود سے مزید دس بارہ برس تک چل سکتا تھا لیکن پتہ نہیں کیوں میری ماں نے ایک روز مجھے بیٹھے بٹھائے "جاوید" کہہ دیا۔ میرے والد کو یہ حرکت پسند نہ آئی۔ ان کا کہنا تھا لوگ "جاوید" کو بڑی آسانی سے بگاڑ کر جیدی، جیدا یا جیدو بنا دیں گے لہذا ہمیں گاؤں میں رائج کسی ایسے نام کا انتخاب کرنا چاہیے

جس میں اللہ رسول ﷺ کا ذکر آتا ہو۔ میرے والد کا خیال درست تھا۔ ہمارے گاؤں میں لوگ ایسے ناموں کو بگاڑنا جن میں اللہ رسول ﷺ کا لفظ آتا ہو شرک سے بڑا گناہ سمجھتے تھے۔ اسی لیے ہمارے گاؤں میں جتنے اللہ دتے، اللہ رکھے اور اللہ وسائے ملتے ہیں اتنے شاید مجموعی طور پر پورے کرہ ارض پر نہ پائے جاتے ہوں لیکن، لیکن صرف میرے والد نہیں میری ماں کا کہنا بھی درست تھا۔ اس کا کہنا تھا اگر میرا بیٹا کرماں والا ہوا تو اسے جیدی، جیدا اور جیدو سے جاوید بننے دیر نہیں لگے گی، نالائق نکلا تو ہم اس کا نام کچھ بھی رکھ لیں لوگ بگاڑنے سے باز نہیں آئیں گے۔ میرے والد نے میری ماں کی بات مان لی۔ یہ گھر کے میدان میں میرے والد کی آخری شکست اور میری ماں کی پہلی اور آخری فتح تھی۔

میں بڑا ہوا تو ایک طویل عرصے تک اس گونگوں میں رہا کہ میں ”محمد جاوید“ ہوں یا ”جاوید اقبال۔“ آنے والی زندگی میں یہ تھی بھی دوسری تھیوں کی طرح مجھے ہی سلجھانا پڑی۔ یوں میٹرک کے بعد سے میں ”محمد جاوید“ ہوں اور اخبار کی دنیا میں داخل ہونے کے بعد سے ”جاوید چودھری“ آپ پوچھ سکتے ہیں، میں ”محمد جاوید“ یا ”محمد جاوید چودھری“ کیوں نہیں لکھتا۔ بات بہت واضح ہے، میں نہیں چاہتا میرے ناراض دوست جب میرا نام لے کر اپنی نفرت کا اظہار کریں تو لفظ ”محمد“ کے باعث ان پر بخشش کے دروازے بند ہو جائیں ہاں البتہ میں نے جب بھی اکاؤنٹ کھلوا یا تو ”محمد جاوید چودھری“ کے نام ہی سے کھلوا یا اس لیے کہ جب زندگی مجھے سمجھوتے پر مجبور کرنے لگے تو میرے نام میں شامل دنیا کی سب سے بڑی پائیزنگ ”محمد“ مجھے لوٹ جانے، واپس لوٹ جانے کا حکم دے سکے۔

آج یہ سطوریں لکھتے ہوئے مجھے اپنی ان پڑھ، بھولی بھالی ماں بہت یاد آ رہی ہے، وہ اس وقت مجھ سے ڈیڑھ دو سو میل دور ہے لیکن مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے وہ میرے سامنے صوفے پر بیٹھی ہے۔ اس احساس کی دو وجوہات ہیں، ایک تو اس کا ماں ہونا اور دوسری اس کی وہ دلیل جس نے کبھی میرے والد کو ہارنے پر مجبور کر دیا تھا اور آج مجھے شکست دے دی ہے۔ جب یہ کتاب مکمل ہوئی اور بھائی آصفؑ اس کتاب کے پبلشر، نے مجھے کسی نامور دانشور سے دیباچہ لکھوانے کا حکم دیا اور میں نے بجا آوری کے لیے اپنے تمام بزرگوں اور دوستوں کی فہرست بنائی جن کی ذات کے سورج میری شخصیت کے میلے دھندلے آئینے میں چمکتے ہیں تو میری ماں نے میرا ہاتھ تھام کر کہا ”نہیں پتر نہیں، تم کسی بزرگ، کسی دوست کو تکلیف مت دو، تم اس کتاب کو اسی طرح زندگی کے دریا میں اتار دو جس طرح میں نے تمہیں دھکیل دیا تھا۔ اگر یہ کرماں والی ہوئی، اگر اس میں کچھ ہوا تو یہ لوگوں تک پہنچ جائے گی اور لوگ اس تک۔ اگر اس میں کچھ نہ ہوا تو پھر دنیا کے سارے دانشور اس کی تعریف میں اپنا سارا لبو، اپنا سارا ہنر صرف کر دیں تو بھی اسے زندہ نہیں رکھ سکتے۔“

مجھے اعتراف ہے یہ شاید میری زندگی کی انتہائی قیمتی خواہشوں میں سے ایک خواہش تھی کہ میری اس کتاب کے پہلے پبلشرز ہے۔

کتاب کا دیباچہ جناب نسیم انور بیگ لکھتے۔ وہ نسیم انور بیگ جن کا ہر لفظ تعویذ اور ہر فقرہ دعا ہوتی ہے۔ جناب ارشاد احمد حقانی لکھتے جن کے کلم کو اللہ تعالیٰ نے آنکھیں بھی دے رکھی ہیں اور دماغ بھی۔ جناب منو بھائی لکھتے جن کے تحقیق کیے گئے فقروں پر خود اردو زبان فریضہ ہو جاتی ہے۔ جناب مجیب الرحمن شامی لکھتے، لفظ جن کے حضور یوں سر جھکا کر بیٹھتے ہیں جیسے عقیدت میں جیسے مرید مرشد کے سامنے۔ جناب عبدالقادر حسن لکھتے جن کی نثر پہاڑی ندی کی طرح ہے جب اس میں طغیانی آتی ہے تو پھر وہ بہتی چلی جاتی ہے، بہاتی چلی جاتی ہے۔ جناب نذیر ناجی لکھتے جن کے کلم نے لفظوں کو کہنے کا، بولنے کا سلیقہ سکھایا۔ جناب فیاض شاہد لکھتے جن کی اگھویں میں پہنچ کر لفظ، لفظ نہیں رہتے، احساس بن جاتے ہیں، جذبہ ہو جاتے ہیں۔ کلام کے مسج استاد ہارون الرشید لکھتے جو قبروں میں لیٹے ٹھنڈے، بے جان لفظوں کو چھو لیں تو وہ اٹھ کر چلنے لگتے ہیں، پھرنے لگتے ہیں، بولنے لگتے ہیں۔ صحافت کے امام طغیانی جناب حسن ثار لکھتے جنہوں نے ناں سے ہاں اور ہاں سے ناں کی آواز پیدا کر کے دکھائی۔ جو بائسری کے پیٹ سے تھوڑا نکالنا جانتے ہیں۔ جناب عطاء الحق قاسمی لکھتے جنہیں برف کو آگ لگانے اور آگ سے برف کی ملیں بنانے کا منتر آتا ہے اور جناب امجد اسلام امجد لکھتے جن کی نثر میں شعر کا ذائقہ اور شاعری میں نثر کا چمک ہے لیکن انیسویں صدی میں میرا ہاتھ تمام لیا۔ مجھے روک دیا اور یوں میری خواہش در خواست بننے سے پہلے ہی دم توڑ گئی۔

میں اپنی یہ کتاب دلت کے حوالے کر رہا ہوں، اس یقین کے ساتھ کہ اگر اس میں کوئی نئی بات، کوئی انوکھی واردات ہوئی تو یہ اپنا وجود خود منوالے کی بصورت دیگر جناب ارشاد حقانی سے امجد اسلام امجد تک میرے استادوں، میرے محسنوں اور میرے بزرگوں کے سارے لفظ، ساری نیک تمناؤں اس راکھ کے دھیر کو زندگی نہیں بخش سکتیں۔

میں خود کو آپ کی عدالت میں پیش کر رہا ہوں۔ مجرم حاضر ہے، اسے بے گناہ سمجھیں تو با عزت بری کرویں، گناہگار جانیں تو معافی دے دیں۔

بری کرنا آپ کا انصاف ہوگا، اور معافی دینا آپ کی اعلیٰ ظرفی۔

جاوید چودھری

ہاؤس نمبر 491، سٹریٹ 17

شہزادہ گاون (اسلام آباد)

کاشف آزاد



ہم وکھری ٹائپ کے بھکاری ہیں

سعودی معاشرے میں بھی تبدیلی اگڑائیاں لے رہی ہے، تیل نے سعودی عرب میں چالیس برس قبل انڈسٹری کی شکل اختیار کی تھی جس کے بعد سعودی عرب میں ارب پتیوں کی کلاس نے جنم لیا، ان ارب پتیوں کو رئیس بنے ہوئے چالیس سال گزر چکے ہیں اس مرحلے میں ان کی تیسری نسل جوان ہو گئی، یہ بزرگوں کے مقابلے میں لبرل اور روشن خیال نسل ہے چنانچہ یہ بھی دنیا کی دوسری خوش حال اور ماڈرن نسلوں کی طرح لذتوں کی تلاش میں سرگرداں ہے، سعودی عرب ایک بند اور بڑی حد تک مذہبی معاشرہ ہے اور اس معاشرے میں ابھی تک ان لذتوں کی گنجائش پیدا نہیں ہوئی لہذا جب سعودی عرب کے مہربانوں نے چند میل کے فاصلے پر گزدیکھا تو ان ریاستوں نے معاشی کھیاں بننے کا فیصلہ کر لیا، دوسری نے پہلا قدم اٹھایا، دوسری کے شیخوں نے سعودی عرب کی ریکس کلاس پر اپنے دروازے کھول دیئے، انہوں نے پب بنائے، ڈسکو کھولے اور عسرت کدے آباد کر دیئے چنانچہ سعودی عرب کی دولت دوسری کے دروازے پر دستک دیئے گئی، ہر ویک اینڈ پر شہزادے، ریکس اور شیخ دوسری پہنچ جاتے اور لاکھوں کروڑوں ڈالر لٹا کر اتوار کی رات واپس آ جاتے، دوسری کی دیکھا دیکھی دوسری ریاستیں بھی آگے بڑھیں اور یہ بھی بہتے دریا میں ہاتھ دھوئے لگیں، بحرین روشن خیالی کا تازہ ترین چشمہ ہے، بحرین نے سعودی عرب کی مدد سے دلوں ممالک کے درمیان سڑک بنادی، یہ کار و سہ عرف عام میں "وکی پل" کہلاتی ہے، بحرین یورپ اور امریکہ کی طرح روشن خیال اور اعتدال پسند ہو چکا ہے چنانچہ اب ویک اینڈ پر سعودی شہری بحرین کا رخ کرتے ہیں، سعودی عرب میں جنڈ کو چھٹی ہوتی ہے چنانچہ اس مناسبت سے بدھ کی شام "ویک اینڈ" بن جاتی ہے، اس روز یوں محسوس ہوتا ہے جیسے سعودی عرب کی یہ سڑک بحرین کی طرف مڑ گئی ہے، ریاض میں سات ہزار کے قریب شہزادے اور شہزادیاں موجود ہیں، یہ لوگ ویک اینڈ پر جب شہر میں نکلتے ہیں تو نہ صرف ٹریفک کا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے بلکہ ریاض لندن کی ٹریفک سکوائر اور لاہور کی لبرٹی کا منظر پیش کرنے لگتا ہے مجھے بے شمار پاکستانی فیملیز نے بتایا یہ لوگ بالخصوص ان کی خواتین ان دنوں باہر نہیں نکلتیں کیونکہ قانون کی مضبوطی اور ریاست کے آہنی ہاتھوں کے باوجود ابھی تک سعودی عرب کے شاہی خاندانوں کو بے شمار رعایتیں حاصل ہیں اور بعض اوقات غریب ممالک کے شہری ان رعایتوں کی زد میں آ جاتے ہیں

ٹریفک پولیس بھی ویک اینڈ پر شہزادے اور شہزادیوں کی بدتمیزی پر آنکھیں بند کر لیتی ہے ہاں البتہ شاہی خاندان کا کوئی فرد اگر کسی سنگین جرم میں اندر ہو جائے یا عدالت کی نظر میں آ جائے تو شاہی خاندان اسے بچانے کی کوشش نہیں کرتا لہذا وہ شخص کیفر کروار تک ضرور پہنچتا ہے۔

سعودی عرب پاکستان کا بے انتہا مخلص دوست ہے اور اس نے ہر تازک موقع پر پاکستان کی مدد کی میاں نواز شریف نے 1998ء میں انہی دھماکے کئے تو سعودی عرب پہلا ملک تھا جس نے پاکستان کو مبارک باد پیش کی تھی پاکستان کے انہی پروگرام کو شاہ فہد اپنی نجی محفلوں میں ہمارا انٹیم بم اور اسلامی بم کہتے تھے مجھے 15 اپریل کی رات ایک سعودی باشندے نے بتایا شاہ فہد جہازوں کے امراض میں مبتلا تھے وہ کئی برس تک اپنی ٹانگوں پر کھڑے نہیں ہو سکے لیکن انہی دھماکوں کے بعد جب میاں نواز شریف ان سے ملاقات کیلئے شاہی محل پہنچے تو انہیں دیکھ کر شاہ فہد ویل چیئر سے کھڑے ہو گئے سعودی عرب اور شاہی خاندان کو پاکستان سے اس قدر محبت ہے لیکن ہم لوگ بد قسمتی سے اس محبت سے استفادہ نہیں کر سکے سعودی عرب ایک نو دولت سیٹھ ہے اور اسے ہر شعبے میں ہنرمندوں کی ضرورت ہے گو سعودی عرب کے بے شمار شیعوں کے اعلیٰ عہدے پاکستانیوں کے پاس ہیں لیکن اس کے باوجود سعودی عرب میں ہمارے پانچ لاکھ کے قریب مزدور آباد ہیں ہماری حکومت اگر ان پانچ لاکھ لوگوں کو ہنرمند بنا دے تو یہ لوگ سعودی عرب کی معیشت کا زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں میں اس سلسلے میں بنگلہ دیش کی مثال دیتا ہوں بنگلہ دیش کے لوگ سعودی عرب میں تیسرے درجے کے شہری سمجھے جاتے تھے یہ لوگ سعودی باشندوں کی گاڑیاں دھوتے تھے بوٹ پالش کرتے تھے لائوں کی صفائی کرتے اور گھروں میں کام کرتے تھے لیکن پھر گرامین بینک کے سربراہ ڈاکٹر یونس سعودی عرب آئے انہوں نے پورے سعودی عرب میں بنگلہ دیشی باشندوں کے سیمینار کرائے اور انہیں سمجھایا تم لوگ کب تک کئی کمینوں کی طرح زندگی گزارتے رہو گے تم ہنرمند بنو کہ تمہاری زندگی آسان ہو سکے ڈاکٹر یونس نے بعد ازاں بنگلہ دیشی حکومت کے ساتھ مل کر بنگلہ دیش میں ٹریننگ کے ادارے بنائے ان لوگوں کو سعودی عرب سے واپس بلایا انہیں چھ ماہ کے ٹیکنیکل کورسز کرائے اور انہیں دوبارہ سعودی عرب بھجوانا شروع کر دیا ڈاکٹر یونس کی مہربانی سے بنگلہ دیشی کمپنی نے اب سعودی عرب میں سرانجام شروع کر دیا ہے ہماری حکومت بھی اگر اس ماڈل پر عمل کرے سید خورشید شاہ اور ڈاکٹر فاروق ستار پاکستان میں ٹیکنیکل ادارے بنائیں اور سعودی عرب میں کام کرنے والے بے ہنر پاکستانیوں کو واپس بلا کر انہیں کوئی ہنر سکھادیں تو پاکستانیوں کے حالات بدل سکتے ہیں میں اس سلسلے میں تھائی لینڈ کی مثال بھی دیتا ہوں سعودی عرب میں ہیلی کاپٹر باقاعدہ انڈسٹری کی شکل اختیار کر رہی ہے چنانچہ سعودی عرب کو ہسپتالوں ڈسپنسریوں اور ایسیوینس سروسز کیلئے ٹیکنیکل شاف ورکار تھا تھائی لینڈ نے سعودی عرب کی اس ضرورت کو سمجھا اس نے فوری طور پر چھوٹے چھوٹے میڈیکل انسٹیٹیوٹ بنائے تھائی لو جوانوں کو ٹریننگ دی اور سعودی عرب بھجوا دیا اس فیصلے کی وجہ سے آج سعودی عرب کی میڈیکل کیئر میں

تھائی لینڈ کی مثال پر قائم ہو چکی ہے ڈاکٹر منصور مین سعودی عرب کے مشہور پاکستانی ڈاکٹر ہیں وہ سعودی عرب کے ایک بہت بڑے میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں "کی پوسٹ" پر تعینات ہیں انہوں نے چند برس پہلے سعودی گورنمنٹ کو قائل کیا کہ وہ پاکستان سے میڈیکل سٹاف منگوا کر سعودی حکومت نے رضا مندی شوکر دی اس کے بعد سعودی عرب کے دو اعلیٰ افسر پاکستان پہنچ گئے لیکن ہماری بیوروکریسی نے ان افسروں کی مت مار دی وہ واپس گئے اور انہوں نے توہ کر لی اسی قسم کی ایک اور مثال کنگ سعود یونیورسٹی میں اردو چیئر ہے 'کنگ سعود یونیورسٹی میں مختلف زبانوں کی چیئرز تھیں پاکستانی کمیونٹی نے سعودی حکومت کو قائل کیا کہ وہ یونیورسٹی میں اردو چیئر بھی قائم کرنے حکومت نے اجازت دے دی لیکن پاکستان نے مطالبہ کر دیا اس کا نام اردو چیئر کی بجائے اقبال چیئر رکھا جائے سعودی حکومت نے جواب دیا ہم نے صرف زبانوں کے نام پر چیئر قائم کی ہیں شخصیات پر نہیں سعودی عرب میں فریج، جاپانی، انگلش اور چائینز چیئرز ہیں، ماڈر ٹیکسیپرز یا سارنر چیئر نہیں ہیں لہذا آپ اردو چیئر کیلئے اپنا کوئی سکالر نامزد کر دیں لیکن پاکستانی حکومت نے اس کا کوئی مثبت جواب نہیں دیا اس دوران یہ معاملہ بھارت کے نوٹس میں آ گیا چنانچہ بھارت نے اردو چیئر کے لئے اپنا نمائندہ بھیجا دیا آپ اب ستم ملاحظہ کیجئے کنگ سعود یونیورسٹی کی اردو چیئر پر بھارتی سکالر تعینات ہے اسی قسم کی ایک مثال بھارتی یونیورسٹیاں ہیں نائن الیون کے بعد سعودی عرب کے طالب علموں کو یورپ اور امریکہ میں اعلیٰ تعلیم کے حصول میں مشکلات درپیش تھیں حکومت نے اپنے طالب علموں کیلئے نئے راستے تلاش کرنا شروع کر دیئے سعودی حکومت نے اس سلسلے میں جن یونیورسٹیوں کا انتخاب کیا ان میں علی گڑھ یونیورسٹی بھی شامل تھی بھارت کو پتہ چلا تو بھارت کے وزیر تعلیم فوراً ریاض پہنچے اور انہوں نے سعودی حکومت سے بھارت کی بارہ یونیورسٹیوں کی منظوری لے لی یوں اب بھارت کی بارہ یونیورسٹیوں میں سعودی عرب کے طالب علم تعلیم حاصل کر رہے ہیں جبکہ پاکستان کی کوئی یونیورسٹی اس فہرست میں شامل نہیں ہم اگر تھوڑی سی دانشمندی سے کام لیں تو میرا خیال ہے ہم سعودی عرب کی محبت کا کہیں زیادہ فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

مجھے سعودی عرب کے ایک اعلیٰ افسر نے بڑا دلچسپ واقعہ سنایا اس نے بتایا پچھلے سال جب پاکستان نے سعودی عرب سے امداد کی اجیل کی تو پاکستان کا ایک نمائندہ شاہ عبداللہ سے ملاقات کیلئے ریاض آیا یہ صاحب صدر آصف علی زرداری کے خصوصی طیارے پر ریاض آئے تھے یہ بات جب شاہ کے نوٹس میں آئی تو وہ شدید ناراض ہوئے اور انہوں نے پاکستانی حکومت کو کہلا بھیجا "ہم آپ کی مدد کیلئے تیار ہیں لیکن پہلے آپ لوگ کم از کم یہ عیاشی تو بند کریں" سعودی افسر کا کہنا تھا "یہ وہ حرکت تھی جس کی وجہ سے سعودی عرب نے پاکستان کی امداد سے ہاتھ کھینچ لیا" میں نے یہ واقعہ سننا تو میں نے قہقہہ لگایا اور اس سے عرض کیا "ہم ذرا دکھری تانبے کے بھکاری ہیں ہم ہمیشہ کنالی کا سوٹ پہن کر کرشن ڈیور کے کٹھنول میں بھیک مانگتے ہیں۔"



سلسلہ انوار

ہم سب کو فی ہیں

سید الشہداء حضرت امام حسینؑ کی ذات کے ان گنت پہلو ہیں آپ کی شخصیت میں ایسے ایسے رنگ موجود ہیں جن کا احاطہ سورہین چودہ سو سال سے کر رہے ہیں لیکن حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہیں ہو رہا۔ آپ دس محرم کے دن ہی کو لے لیجئے یہ دن آپ کی شہادت سے قبل مختلف حوالوں سے پہچانا جاتا تھا مثلاً اللہ تعالیٰ نے عرش زمین کرسی سورج چاند ستارے اور جنت دس محرم کو تخلیق کی تھی حضرت آدمؑ اور بی بی حواؑ نے بھی دس محرم کو آنکھ کھولی تھی دس محرم وہ دن تھا جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ اور بی بی حواؑ کی توبہ قبول کی تھی اس دن حضرت ابراہیمؑ پیدا ہوئے تھے اس دن حضرت ابراہیمؑ کو آتش نمرود سے نجات ملی تھی اسی دن فرعون کا لشکر پانی میں غرق ہوا تھا اسی دن حضرت موسیٰؑ کو فرعون سے نجات ملی تھی اسی دن حضرت یونسؑ کو شکم مچھلی کے پیٹ سے برآمد ہوئے تھے اسی دن حضرت یوسفؑ کو کنوئیں سے نکالا گیا تھا اسی دن حضرت یعقوبؑ کو بیٹائی لوٹائی گئی تھی اسی دن حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے تھے اور اسی دن حضرت عیسیٰؑ دنیا سے زندہ اٹھائے گئے تھے غرض کائنات کے بڑے فیصلے دس محرم کو ہوئے تھے لیکن پھر حضرت امام حسینؑ نے دس محرم کو شہادت قبول فرما کر اس دن کا حوالہ بدل دیا اور 10 اکتوبر 680ء اور دس محرم 61ھ کو آپ کی شہادت کے بعد دس محرم حضرت امام حسینؑ کا دن ہو گیا چنانچہ آج نوزی لینڈ سے لے کر سامیریان تک کر بلا سے لے کر آئس لینڈ تک اور نیپلز کے ساحلوں سے لے کر ایس لینڈ اور انارکینکا سے لے کر جیکاک تک پوری دنیا دس محرم کو حضرت امام حسینؑ کا دن سمجھتی ہے۔ یہ انسانی کیلنڈر کا وہ واحد دن ہے جس روز دنیا کی ہوائیں فضا میں لہریں خوشبوئیں اور گرمیوں تک مغموم ہو جاتی ہیں جس دن پانی کا ایک قطرہ خوشبو کی ایک لہر آسمان کی ایک ایک پرت اور ریت کا ایک ایک ذرہ ادا اس ہو جاتا ہے جس دن ہوا کی آنکھوں میں آنسو بادلوں کے دل میں ٹیس زمیں کے جگر میں خراش اور آسمان کے خمیر پر درد جاگ اٹھتا ہے اور کائنات کے آخری سرے تک درد کی شام غریباں بچھ جاتی ہے۔ یہ دن کیلنڈر کے 360 دنوں کا توحہ چمچ اور سسکی ہے اور اس دن دنیا کی ہر تخلیق سارے حیوانات نباتات اور بمادات دکھ میں غرق ہو جاتے ہیں۔

یہ دن حقیقتاً حضرت امام حسینؑ کا دن ہے لیکن یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے حضرت امام حسینؑ کا وہ کون

سا کارنامہ تھا جس کے صدقے دس محرم کے سارے حوالے تبدیل ہو گئے جس نے حضرت آدم، حضرت ابراہیم، حضرت یونس، حضرت یعقوب، حضرت یوسف، حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کے دن کی دراشت بدل دی۔ کیا وہ کارنامہ حضرت امام حسین اور ان کے اہل بیت کی قربانی تھا؟ کیا وہ کارنامہ آپ اور آپ کے صاحبزادوں آپ کے خاندان اور کثیر رسول کی شہادت تھا؟ ہاں یقیناً آپ کی شہادت نے تاریخ اسلام میں مرکزی کردار ادا کیا تھا مگر دس محرم کے پلو میں اس کے علاوہ بھی بے شمار زاویے پوشیدہ ہیں اور ان زاویوں میں ایک زاویہ اسلام کی سپرٹ ہے اسلام دنیا کا پہلا اور واحد مذہب تھا (اور ہے) جس نے برائی کے خلاف جدوجہد کو جہاد کا نام دیا تھا جس نے اپنے ماننے والوں کو حکم دیا تھا برائی کو ہاتھ سے روکنا نہ روک سکو تو اسے من سے برا بھلا کہو نہ کہہ سکو تو دل میں اس کی مذمت کرو لیکن یہ ایمان کا کم ترین درجہ ہے۔ یہ دنیا کا واحد مذہب تھا جس نے تعداد کے بجائے جذبے کو فوقیت دی اور جس نے نیت کو وسیلہ پر اہمیت دی۔ یہ وہ مذہب تھا جس نے اپنے ماننے والوں کو حکم دیا کہ تمہارے پاس اگر تلواریں نہیں ہیں تو کوئی بات نہیں تمہارے پاس اگر ترکش نہیں ہیں تیر بھالے اور نیزے نہیں ہیں تمہارے پاس گھوڑے اونٹ اور خچر نہیں ہیں تم نیچے پاؤں بھوسے پیٹ اور بے چست ہو اور اگر تم تعداد میں بھی کم ہو تو بھی کوئی پرواہ نہیں بس تم اللہ کے نام پر بدر کے میدان میں پہنچو اللہ کے حضور دعا کرو اور دین کے دشمنوں سے بجز جاؤ اللہ کی نصرت تمہاری تلاش میں نکل کھڑی ہوگی اور یہ دنیا کا واحد مذہب تھا جس نے کہا تھا گلہ پڑھنے سے لوگوں کا دل مسلمان نہیں ہوتا نماز پڑھنے روزہ رکھنے اور حج کرنے والے لوگ بھی فرعون شہاد اور عمرو ہو سکتے ہیں اور تم پر ان لوگوں کے خلاف بھی اتنا ہی جہاد فرض ہے جتنا کافروں، مشرکوں اور اللہ کے دشمنوں سے فرض ہے۔ جس نے کہا تھا تم صرف اس شخص کی امارت تسلیم کرو جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکامات سے روگردانی نہ کرے جو اس کے دین میں ذاتی انا، ضد اور تکبر کی ملاوٹ نہ کرے اور جو اللہ کے احکامات میں نظریہ ضرورت کی آمیزش نہ کرے اور سید المرشد امام اسلام کے اس نظریے اس فکر اور اس فلسفے کے امام تھے اور انہوں نے اسلام کی سپرٹ پر عمل کرتے ہوئے نکلے گوتہ حریت کے خلاف طعن بلند کر دیا انہوں نے یہ بھی ثابت کر دیا اسلام میں تعداد کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی آپ نے یہ بھی ثابت کر دیا اسلام میں دنیاوی کاسیالی اہمیت نہیں رکھتی اور آپ نے ثابت کر دیا اسلام قول اور اقرار کا مذہب ہے اور اس میں جب کسی سے وعدہ کر لیا جائے تو اس پر قائم رہتے ہیں خواہ کوفہ کے سارے شہری "کوئی" ثابت کیوں نہ ہو جائیں۔ آپ نے ثابت کر دیا اسلام میں کر بلا میں داخل ہونے کے ہزاروں دروازے ہیں لیکن اس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں اور اسلام میں شہادت سب سے بڑا اعزاز ہوتی ہے۔

میں آج جب یہ نظریہ لکھ رہا ہوں تو اس وقت غزوہ میں اکیسویں صدی کا کر بلا برپا ہے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا نام لینے والوں پر اسرائیل کے میزائل کی طرح برس رہے ہیں شہر کے اندر بم پھٹ رہے ہیں گولیاں چل رہی ہیں اور اسرائیلی ٹینک زندہ انسانوں کا قیہ بنا کر جا رہے ہیں اور امریکہ اور یورپ

اس ظلم پر نہ صرف تالیاں بجا رہے ہیں بلکہ وہ اسرائیلی جارحیت کو درست بھی قرار دے رہے ہیں اور پورا عالم اسلام اس ظلم پر کوفہ بن کر خاموش بیٹھا ہے۔ آپ یاد کیجئے دس محرم 61ھ کو جب کربلا میں نواسہ رسول کا سر قلم کیا جا رہا تھا جب آپ کا سر مبارک شمر نے نیزے پر ٹانگہ دیا تھا جب شہدائے کربلا کی نعشوں پر گھوڑے دوڑاے جا رہے تھے اور جب اہل بیت کے نعشوں کو آگ لگائی جا رہی تھی اور وہ بیٹیاں جن کے چہروں تک پہنچ کر سورج کی کرنیں بھی پردہ کر لیتی تھیں اور ہوائیں چھونے سے پہلے ہزار بار آب زم زم سے غسل کرتی تھیں وہ بیٹیاں جب بچے سر پہنکے پاؤں نعشوں سے باہر نکلیں تو اس وقت کوفہ کے لوگ کیا کر رہے تھے؟ یہ بد بخت لوگ اس وقت خلافت کا جشن منا رہے تھے کولیوں نے اس وقت اپنے گھروں میں چراغاں کیا ہوا تھا اور وہ دھمیں چڑھا کر بیٹھے تھے اور آج ساڑھے تیرہ سو سال بعد بھی وہی منظر بے غرہ کی گلیوں میں سینکڑوں فلسطینی بچوں کی نعشیں پڑی ہیں اسرائیلی ٹینک عفت تاب بچیوں کی نعشوں کو پھیل رہے ہیں اور فلسطینی مسلمان یا اللہ مدد یا رسول اللہ کے نعرے لگا کر آسمان کی طرف دیکھ رہے ہیں لیکن 62 اسلامی ملک کوفہ بن کر بیٹھے ہیں۔ آپ بے حس اور بے ہسی ملاحظہ کیجئے غرہ کی پٹی کے گرد 22 عرب ملک ہیں اور ان 22 عرب ملکوں کو اسرائیلی جارحیت کے خلاف احتجاج تک کی توفیق نہیں ہوئی غرہ میں چوبیس گھنٹے موت اتر رہی ہے اور لوگ اپنے اپنے گھروں میں اطمینان سے بیٹھے ہیں۔ ہماری اس بے بڑی ہمتی کیا ہو گی کہ ہم نے حضرت امام حسینؑ کے فلسطینیوں کی فکر اور ان کی جدوجہد کو فراموش کر دیا؟ کیا ہم فلسطینی مسلمانوں کی نعشیں دیکھ کر بھی مگر حسینؑ کے وارث کہلانے کے قابل ہیں۔

حضرت امام حسینؑ ایک جدوجہد کا نام ہیں وہ ایمان، جرات اور جہاد کی عملی شکل ہیں میں دل کی اتھاہ گھبراہٹوں سے یہ سمجھتا ہوں اگر دنیا میں حضرت امام حسینؑ نہ ہوتے اگر وہ کربلا میں اپنے خاندان کی قربانی نہ دیتے تو شاید دنیا میں کوئی شخص برائی کے خلاف اکیلا کھڑا ہونے کی جرات نہ کرتا یہ حضرت امام حسینؑ کی قربانی تھی جس نے لوگوں کو لانے، نکلانے اور وقت کے فرعونوں کے سامنے کھڑا ہونے کا حوصلہ دیا جس نے تاریخ عالم کو سمجھایا دنیا کی ہر شکست وقتی اور ہر فتح عارضی ہوتی ہے اور دنیا میں صرف سچ اور حق کو مستقل حیثیت حاصل ہے جس نے اقوام عالم کو بتایا اے نبی اکرمؐ کو حق کا ساتھ دو اور باطل سے نکل جاؤ لیکن ہم نے حضرت امام حسینؑ کا یہ پیغام فراموش کر دیا چنانچہ آج فلسطین کے مسلمان ہماری آنکھوں کے سامنے سر رہے ہیں ہم روزانہ نیلی وین سکرین پر انہیں جلتے اور مرتے ہوئے دیکھتے ہیں اور کروٹ بدل کر سو جاتے ہیں۔ آپ دل پر ہاتھ رکھ کر جواب دیجئے کیا ہم دنیا کے ایک ارب 51 کروڑ مسلمان کو قہری نہیں ہیں اور کیا ایران سے لے کر مصر تک 62 اسلامی ملک کوفہ نہیں ہیں۔ کیا ہماری خاموشی یہ ثابت نہیں کرتی ہم مگر حسینؑ کے وارث نہیں ہیں بلکہ ہم شمر کے نظریاتی بھائی ہیں؟ حضرت علیؑ نے فرمایا تھا "ظلم پر خاموشی ظالم کا ہاتھ مضبوط کرنے کے مترادف ہے" اور ہم سب ظالموں کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں چنانچہ ہم حضرت امام حسینؑ کا نام تک لینے کے حق دار نہیں ہیں۔



”ہم امریکہ کے غلام نہیں ہیں“

آج کل وزیراعظم یوسف رضا گیلانی بیانات دینے کے معاملے میں پاکستان کے تمام سابق اور موجودہ سیاستدانوں کو پیچھے چھوڑ گئے ہیں وزیراعظم کا ہر بیان معرکۃ الآراء ہوتا ہے اور کئی کئی دنوں تک زیر بحث رہتا ہے مثلاً وزیراعظم صاحب نے چند دن پہلے قومی اسمبلی میں کھڑے ہو کر فرمادیا تھا ”اگر کوئی دوسرا شخص ملک کے مسائل حل کر سکتا ہے تو وہ آگے آئے میں اقتدار چھوڑ دیتا ہوں“ وزیراعظم صاحب کے اس بیان کو قاضی حسین احمد سے لے کر ڈاکٹر ابدرحمان تک ملک کے بے شمار رہنماؤں نے بنجیدہ آفریجیو لیا اور یہ احباب آج کل پاکستان کے بڑے بڑے مسائل کی فہرست بنا رہے ہیں۔ اسی طرح وزیراعظم صاحب نے گزشتہ روز فرمادیا ”میرا چیف جسٹس ملک کا کاغذیں ہے“ وزیراعظم صاحب نے جب سے یہ فرمایا ہے تو اس وقت سے پریشان ہے کیونکہ یوسف رضا گیلانی کے آئین میں تو مترہیں ترسیم بھی شامل ہے اور اس ترسیم میں وہ 58 نو۔ بی بھی قائم ہے جس کی موجودگی میں صدر آصف علی زرداری اور صدر جنرل رٹنا رٹو پرویز مشرف میں کوئی فرق نہیں اور وزیراعظم یوسف رضا گیلانی اس ترسیم کے باعث سابق وزیراعظم شوکت عزیز کا آئینی تسلسل محسوس ہوتے ہیں اور وہ کل تک افتخار محمد یونس و دھری کو اپنا چیف جسٹس کہا کرتے تھے یہ تمام بیانات اپنی جگہ بہت شاندار ہیں لیکن وزیراعظم کا شاہکار بیان وہ تھا جس میں انہوں نے فرمایا تھا ”ہم امریکہ کے غلام نہیں بلکہ ہم کسی کو اپنی فضا کی یا زمین کی حدود کی خلاف ورزی کی اجازت نہیں دیں گے“ میں نے جب وزیراعظم کے منہ سے یہ بیان سنا تھا تو پاکستان کی ساری حالیہ تاریخ میرے سامنے کھل گئی تھی اور یہ تاریخ چیخ چیخ کر قوم کی توجہ ان تمام واقعات کی طرف مبذول کرا رہی تھی جن سے غلامی کی باقاعدہ و آتی تھی مثلاً آپ ابو الفراق کا واقعہ یاد کیجئے ابو الفراق القاعدہ کا ایک سرگرم رکن تھا پاکستان نے اسے 2 مئی 2005ء کو مردان سے گرفتار کیا اور امریکہ کے حوالے کر دیا جس کے بعد 6 مئی 2005ء کو امریکہ کے ایک اخبار میں ایک کارٹون شائع ہوا کارٹون میں ایک امریکی فوجی دکھایا گیا ”فوجی کے ہاتھ میں ایک کتا تھا“ کتے کے اوپر پاکستان لکھا تھا اس کے منہ میں ابو الفراق تھا اور امریکی فوجی کتے پر ہاتھ پھیر کر کہہ رہا تھا ”شاہنشاہ تم نے بہت اچھا کیا“ چلو اب دونوں مل کر اسامہ بن لادن کو تماشہ کرتے ہیں“ یہ کارٹون 8 اور 9 مئی کو پاکستانی اخبارات میں بھی شائع ہوا تھا جس کے

بعد معاملہ قومی اسمبلی میں پہنچا اور قومی اسمبلی نے حکومت کو حکم دیا وہ امریکی اخبار کو معذرت کرنے پر مجبور کرنے حکومت نے دفتر خارجہ کی ذمہ داری لائی دفتر خارجہ نے امریکہ میں پاکستانی سفارتخانے کو لکھا اور پاکستانی سفارتخانے نے امریکی اخبار کو خط لکھ دیا لیکن امریکی اخبار نے معذرت کرنے سے انکار کر دیا جس کے بعد ہماری حکومت خاموش ہو گئی یہ واقعہ ثابت کرتا ہے ہم امریکہ کے غلام نہیں ہیں۔ اسی طرح صدر فاروق احمد لغاری کے دور میں حکومت نے رمزی یوسف کو امریکہ کے حوالے کیا تھا اس وقت امریکہ اور پاکستان کے درمیان مجرموں کے تبادلے کا کوئی معاہدہ نہیں تھا امریکی حکومت نے جب رمزی یوسف کو عدالت میں پیش کیا تو جج نے سرکاری وکیل سے پوچھا "پاکستان نے رمزی یوسف کو کس قانون کے تحت امریکہ کے حوالے کیا" وکیل نے قہقہہ لگایا اور شہادت کی انگلی پر انگوٹھا رکھ کر بولا "پیسے کے قانون کے تحت" اگر پاکستانیوں کو پیرہے دیا جائے تو یہ اپنی ماں کو بھی بیچ دیتے ہیں" امریکی وکیل کی اس گستاخی پر بھی پوری قوم نے شدید احتجاج کیا اس احتجاج سے مجبور ہو کر حکومت پاکستان نے امریکی وکیل سے معافی کا مطالبہ کیا لیکن اس وکیل نے آج تک ہم سے معافی نہیں مانگی لیکن ہم امریکی غلام نہیں ہیں۔ تاہم ایون کے بعد چرچہ آرمیٹج نے صدر پرویز مشرف کو دھمکی دی تم لوگ ہمارا ساتھ دو ورنہ ہم پاکستان پر بمباری کر کے تمہیں پتھر کے زمانے میں دھکیل دیں گے صدر مشرف نے فوراً چرچہ آرمیٹج کے سامنے ہتھیار ڈال دیے لیکن ہم امریکہ کے غلام نہیں ہیں۔ تاہم ایون کے بعد امریکہ نے ہم سے سات مطالبے کئے امریکہ کا خیال تھا صدر پرویز مشرف ان میں سے تین یا چار مطالبے مان لیں گے مگر صدر مشرف نے فوراً امریکہ کے ساتوں مطالبات تسلیم کر لئے لیکن ہم امریکہ کے غلام نہیں ہیں۔ نیو فورسز نے 29 جنوری 2008ء سے لے کر 14 نومبر 2008ء تک پاکستان کے قبائلی علاقوں پر میزائلوں کے 24 حملے کئے ان حملوں میں 345 معصوم لوگ شہید ہوئے ہم نے ہر حملے کی مذمت کی اور امریکہ نے ہماری ہر مذمت کا جواب حملے کی شکل میں دیا لیکن ہم امریکہ کے غلام نہیں ہیں۔ 17 ستمبر کو امریکہ کے جوائنٹ چیفس آف سٹاف کمیٹی کے چیئرمین ایڈمرل مائیک مولن نے وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی اور آری چیف کو یقین دلایا "امریکہ پاکستان کی خود مختاری کا احترام کرے گا" مگر اسی شام امریکہ کے جاسوس طیاروں نے جنوبی وزیرستان میں میزائل داغ دیا لیکن ہم امریکہ کے غلام نہیں ہیں۔ امریکی صدر بارک اوباما نے 29 جولائی کو وزیر اعظم یوسف رضا گیلانی اور 24 ستمبر کو صدر آصف علی زرداری کو یقین دلایا "امریکہ پاکستان کی خود مختاری کا احترام کرے گا" مگر آج 17 نومبر تک کسی جگہ یہ احترام دکھائی نہیں دے رہا لیکن ہم امریکہ کے غلام نہیں ہیں۔ 22 اکتوبر کو ہماری پارلیمنٹ نے امریکی حملوں کے خلاف مشترکہ قرارداد پاس کی قرارداد کے تین گھنٹے بعد امریکہ نے شمالی وزیرستان میں میزائل داغ دیا لیکن ہم امریکہ کے غلام نہیں ہیں۔ 29 اکتوبر کو ہم نے امریکی سفیر کو دفتر خارجہ میں طلب کر کے حملوں کے خلاف احتجاج کیا امریکہ نے اس احتجاج کے دو گھنٹے بعد اپنے جاسوس طیارے پاکستانی فضائی حدود میں مجبوراً بیٹھے لیکن ہم امریکہ کے غلام نہیں ہیں۔ 2 نومبر کو

رجہ ڈیاؤچہ اور ڈیوڈ پیٹریاس نے ہمیں تسلی دی 4 نومبر کو وزیراعظم نے اعلان کیا "امریکہ نے حملے روکنے کی ضمانت دے دی ہے" مگر 5 نومبر کو واشنگٹن پوسٹ نے انکشاف کر دیا "صدر زرداری اور امریکہ کے درمیان خفیہ اندر سینڈنگ موجود ہے" پاکستان احتجاج کرتا رہے گا اور امریکہ حملے کرتا رہے گا۔ "لیکن ہم امریکہ کے غلام نہیں ہیں۔ 11 نومبر کو وزیراعظم نے بیان دیا ہم امریکہ کے غلام نہیں ہیں مگر 12 نومبر کو لاہور میں امریکی قونصل جنرل نے انکشاف کر دیا "امریکی حملے پاکستانی معلومات کے تحت ہو رہے ہیں" لیکن ہم امریکہ کے غلام نہیں ہیں۔ پاکستان اب تک اس جنگ میں 21 کھرب روپے کا نقصان کر چکا ہے ہمارے قبائلی علاقوں میں 1562 فوجی شہید اور ساڑھے تین ہزار زخمی ہو چکے ہیں اور قبائلی علاقوں میں ہمارے ایک لاکھ 20 ہزار جوان لڑ رہے ہیں لیکن ہم امریکہ کے غلام نہیں ہیں۔ ہم پچھلے چار ماہ سے امریکی حملوں کی مذمت کر رہے ہیں لیکن 14 نومبر تک پاکستان پر امریکی حملے ہو رہے ہیں اور ظاہر ہے ان حملوں کے باوجود بھی ہم امریکہ کے غلام نہیں ہیں۔

ہمارے وزیراعظم بہت سادہ ہیں وہ یہ تک نہیں جانتے ہم جب امریکہ کی جنگ کو اپنی جنگ قرار دے رہے ہیں ہم امریکہ سے جنگ کا بل وصول کر رہے ہیں ہم ادا لینے کیلئے امریکہ کے دروازے پر بیٹھے ہیں ہم پر امریکہ بدنامی حملے کرتا ہے ہم ان حملوں پر احتجاج کرتے ہیں اور اس احتجاج کا نتیجہ مزید حملوں کی صورت میں نکلتا ہے پاکستان میں امریکی ایٹمی پارہینئرز کو برسرِ جنگ کیلئے دعوت نامے جاری کرتی ہے اور پاکستان کی وزارت خارجہ کو اطلاع تک نہیں دی جاتی 'پاکستان آئی ایم ایف سے قرضہ لینے کیلئے امریکہ کی سفارش کراتا ہے اور پاکستان میں امریکی سفارتکاروں کو وائسرائے کا سٹیشن حاصل ہو گا تو کیا وہ قوم امریکہ کی غلام نہیں ہوگی؟ ہم تسلیم کریں یا نہ کریں ہمارے عسکران امریکہ کو اپنا آقا مان چکے ہیں کیونکہ غلامی اور آزادی کا تعلق انسان کے ذہن، ضمیر اور دل سے ہوتا ہے اور جب کسی انسان اور کسی قوم کی سوچ اس کا ضمیر اور اس کے دل کی دھڑکن آزاد ہو تو وہ نہ صرف آزاد ہوتی ہے بلکہ دنیا کی کوئی طاقت اس کو غلام نہیں رکھ سکتی لیکن اگر آپ کی سوچ، آپ کا دل غلام ہے تو پھر آزادی محض رسی کا ایک ٹکڑا رہ جاتی ہے۔ آپ کی رسی جتنی لمبی ہوگی آپ بس اتنے ہی آزاد ہوں گے اور یہ حقیقت ہے ہم نے دو وقت کی روٹی اور چار دن کے اقتدار کیلئے اپنی سوچیں غلام کر دی ہیں چنانچہ امریکہ سے لے کر بھارت تک دنیا کا ہر ملک اب ہمارا آقا ہے لوگ اب ہمیں ہمارے جسے کا پانی تک دینے کیلئے تیار نہیں ہیں اور دنیا میں بے بسی اور بے چارگی سے بڑی کوئی غلامی نہیں ہوتی اور ہم بے بسی بھی ہو چکے ہیں اور بے چارے بھی لیکن اس بے چارگی اور بے بسی کے باوجود ہم امریکہ کے غلام نہیں ہیں۔



ہم ایمم بھم کھو دیں گے

ہم لوگ ابھی سعودی عرب ہی میں تھے کہ مولانا صوفی محمد کا بیان آ گیا۔ مولانا نے اپنے بیان میں جمہوریت کو غیر اسلامی پاکستان کے عدالتی نظام کو غیر شرعی اور ہائی کورٹس اور سپریم کورٹ میں ایبلوں کو حرام قرار دے دیا۔ مولانا نے نظام عدل ریگولیشن کو چاروں صوبوں میں پھیلانے کا اعلان بھی کیا۔ مولانا کہے اس بیان کے بعد ایمم کیو ایم کے خدشات درست ثابت ہو گئے۔ ایمم کیو ایم پاکستان کی واحد سیاسی جماعت تھی جس نے 13 اپریل کو قومی اسمبلی میں نظام عدل ریگولیشن 2009ء کی مخالفت کی تھی ایمم کیو ایم کا کہنا تھا طالبان اب ملک کے دوسرے علاقوں کی طرف بھی بڑھیں گے ہم لوگوں نے اس وقت ایمم کیو ایم کے اس خیال کا مذاق اڑایا تھا ہمارا خیال تھا ایمم کیو ایم سیاسی سودے بازی کیلئے یہ "ایجنڈا" کر رہی ہے لیکن ایک ہی ہفتے میں ایمم کیو ایم کے خدشات درست ثابت ہو گئے۔ میں اس وقت مکہ معظمہ میں تھا جب مولانا صوفی محمد منکوروہ میں 50 ہزار لوگوں سے خطاب کر رہے تھے مولانا کے خطاب کے مندرجات ہم تک پہنچے تو میں نے اپنے ایک ساتھی سے عرض کیا "طویل جدوجہد کے بعد سوات میں قیام امن کی ایک صورت نکلی تھی سوات میں شریعت کے نفاذ کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا تھا لیکن اسوس مولانا کے بیان کے بعد صورتحال دوبارہ ورنی درس ہو جائے گی"۔ میرے ساتھی نے تائید میں سر ہلا دیا۔

بیس ماننا پڑے گا مولانا صوفی محمد کے بیان نے چادلوں کی کچی پکانی دیگ ریت پرالت دی ہے اور اگر مولانا اور ان کے ساتھی اس قسم کے بیانات کے بجائے نبی اکرم ﷺ کی سنت پر عمل کرتے یہ لوگ نبی اکرم ﷺ اور خلفائے راشدین کی سلطنت کی طرح سوات میں ایسی ریاست کی بنیاد رکھنے کی کوشش کرتے جس میں امن ہوتا روزگار ہوتا سکون ہوتا مساوات ہوتی عدل ہوتا خوشحالی ہوتی علم ہوتا اور دنیا کی تمام سہولتیں لوگوں میں مساوی تقسیم ہوتیں تو اس نظام کو کراچی تک پہنچتے دیر نہ لگتی یہ لوگ اگر سوات کو ملک کا کرائم فری زون بنا دیتے مستند اور پرسکون علاقہ بنا دیتے تو اسلام کے تمام داعیوں کا سرجمی فخر سے بلند ہو جاتا اور یہ ماؤں بھی آگے بڑھتا لیکن ان لوگوں نے سوات پر توجہ دینے کی بجائے ملک کے دوسرے حصوں کو دھرم کا شرع کر دیا۔ انہوں نے مرکزی نظام کو لگا کر شروع کر دیا چنانچہ اس کے نتیجے میں وہ لوگ بھی ان سے دور ہو گئے جو 20 اپریل تک ان کے حامی تھے۔ میں اس سلسلے میں میاں نواز شریف اے این بی اور میڈیا کی مثال دوں

گاہ میں نواز شریف نفاذ شریعت کے حامی تھے یہ سوات اور فاطما میں امن بھی چاہتے ہیں اور اس سلسلے میں علاقے کے عوام کے جائز مطالبات ماننے کے بھی حامی تھے لیکن مولانا صوفی محمد کے بیان کے بعد میاں نواز شریف نے 20 اپریل کو انٹرویو دیتے ہوئے پہلی بار ان لوگوں سے الگ ہونے کا تاثر دیا۔ میاں صاحب کا کہنا تھا پاکستان کے تمام سیاستدانوں کو متحد ہو جانا چاہئے کیونکہ طالبان سوات کے بعد دوسرے علاقوں پر بھی کنٹرول چاہتے ہیں۔ اس قسم کی صورتحال کا شکار اے این پی بھی ہے عوامی پیشکش پارٹی نے پاکستان پیپلز پارٹی سے بزور بازو یہ معاہدہ منوایا تھا اے این پی نے یہ دھمکی تک دی تھی کہ اگر حکومت نے سوات معاہدے کی توثیق نہ کی تو ہم گھرانہ اتحاد سے الگ ہو جائیں گے لیکن مولانا صوفی محمد کے بیانات کے بعد اے این پی کے ارکان بھی شرمندہ و شرمندہ پھر رہے ہیں اور ان کے لئے نظام عدل ریگولیشن کا دفاع مشکل ہو گیا ہے۔ ہم جیسے میڈیا پرسنز کیلئے بھی مولانا کا بیان حیران کن تھا ہم لوگوں نے ہمیشہ شریعت کا مطالبہ کرنے والوں کا ساتھ دیا کیونکہ ہم یہ سمجھتے تھے اور سمجھتے ہیں کہ مسلمان کی حیثیت سے شریعت کی پابندی اور اسلام کے نظام عدل کا نفاذ ہم پر فرض ہے اور جو لوگ اس کا مطالبہ کرتے ہیں وہ اپنا فرض ادا کر رہے ہیں اور ہمیں ان لوگوں کا ساتھ دینا چاہئے۔ ہم لوگ مجاہدین اور طالبان کی بھی حمایت کرتے تھے کیونکہ ہم یہ سمجھتے ہیں یہ لوگ مسلمان بھی ہیں پاکستانی بھی ہیں اور انسان بھی ہیں چنانچہ ہمیں انہیں تمام حقوق بھی دینے چاہئے ان کے جائز مطالبات بھی ماننے چاہئیں۔ صدر پرویز مشرف جب ان لوگوں کی دائرہ جیوں، نمازوں اور امریکہ مخالف بیانات پر ان کا مذاق اڑاتے تھے تو ہم جزل کی بھرپور مخالفت کرتے تھے۔ ہمارا کہنا تھا کسی شخص کو صرف نمازوں اور دائرہ جیوں کی بنیاد پر معاشرے کے ایک بہت بڑے طبقے کو دہشت گرد شدت پسند یا کُلی سلامتی کے خلاف قرار دینے کا حق حاصل نہیں۔ یہ لوگ بھی اتنے ہی پاکستانی، مسلمان اور انسان ہیں جتنے صدر پرویز مشرف، شوکت عزیز اور چودھری شجاعت حسین ہیں چنانچہ ہمیں ان لوگوں کا مذاق نہیں اڑانا چاہئے وغیرہ وغیرہ۔ ہم لوگوں نے سوات معاہدے اور نظام عدل ریگولیشن کا بھی دفاع کیا۔ میرا ذاتی خیال تھا اگر ایملش کیونٹی امریکہ کے اندر اپنی روایات، قوانین اور مذہبی طرز معاشرت کے مطابق زندگی گزار سکتے ہیں تو ہم سوات کے لوگوں کو سوات اور فاطما کے لوگوں کو فاطما میں اپنی طرز معاشرت، قوانین اور روایات کے مطابق رہنے کی اجازت کیوں نہیں دیتے؟ ہم لوگ یہ بھی کہتے تھے پشتونوں اور قبائلیوں کے ہتھیار دہشت گردی نہیں ہیں یہ ان کی صدیوں پرانی روایت ہیں اور اس روایت سے کُلی سلامتی کو کوئی خطرہ نہیں مگر مولانا صوفی محمد کے بیانات اور طالبان کی بونیر کی طرف نقل مکانی کے بعد اب ہمارے لئے بھی ان لوگوں کا دفاع مشکل ہو گیا ہے۔

ہم لوگ سعودی عرب میں تھے تو ہم نے مسجد نبوی ﷺ اور خانہ کعبہ کے محن میں تمام فرقوں کے نوؤں کو اکٹھے نماز پڑھتے دیکھا ایک ہی صف میں کھڑے لوگ مختلف انداز سے ایک ہی امام کے پیچھے نماز پڑھ رہے تھے کسی نے پیٹ پر ہاتھ باندھ رکھے تھے کسی کے ہاتھ ناف پر تھے کسی نے ہاتھ چھوڑ رکھے تھے کسی

کے فٹھے ٹٹھے تھے کسی کی شلوار نے اس کی ایڑھیاں ڈھانپ رکھی تھیں کسی کے پاؤں کے درمیان زیادہ فاصلہ تھا کسی نے پاؤں جوڑ رکھے تھے کسی نے احرام باندھ رکھا تھا کوئی شلوار قمیض میں ملبوس تھا کسی نے پتلون پہن رکھی تھی کسی کے سر پر سبز چکری تھی کسی نے سیاہ چکری باندھ رکھی تھی کسی نے نوپنی پہن رکھی تھی اور کسی کا سر نکلا تھا کوئی اللہ اکبر کی آواز پر فوراً رکوع اور سجدے میں چلا جاتا تھا اور کوئی رکوع اور سجدے سے پہلے اپنے ہاتھ کا نونہ تک لے جاتا تھا ایک ہی امام کی آواز پر خانہ کعبہ کے سامنے مرد جھکتے تھے اور اسی حرم شریف کی حدود میں عورتیں بھی اسی امام کی اللہ اکبر پر سجدہ کرتی تھیں۔ حرم شریف میں تمام عورتوں نے اپنے سر اور بدن ڈھانپ رکھے تھے لیکن ان کے چہرے اور ایڑھیاں تک پاؤں ٹٹھے تھے۔ مسجد نبوی ﷺ اور خانہ کعبہ کی طرف بڑھنے والی کسی خاتون کے ساتھ کوئی محرم نہیں تھا عورتیں محرم کے بغیر حرم شریف اور مسجد نبوی ﷺ کے گرد آباد بازاروں میں بھی تباہ محوم رہی تھیں خانہ کعبہ اور مسجد نبوی ﷺ کے باہر عورتوں نے غلیبے بھی لگا رکھے تھے یہ سوداگر عورتیں تھیں اور حرم شریف میں آنے والے مرد حضرات بھی ان سے چیزیں خرید رہے تھے اور اس سارے ماحول میں کسی کا اسلام خطرے میں نہیں تھا۔ سعودی عرب میں بازار بھی کھلے تھے ٹیلی ویژن چینل بھی چل رہے تھے ڈش انینا بھی لگا تھا سی ڈی کی دکانیں بھی تھیں مسجد نبوی ﷺ اور خانہ کعبہ کے بالکل سامنے حجام کی دکانیں بھی تھیں اور لوگ حجاموں سے شیو بھی کرا رہے تھے۔ مسجد نبوی ﷺ اور خانہ کعبہ میں کوئی سنی شیعہ کی طرف سڑ کر دیکھ رہا تھا اور نہ ہی کوئی شیعہ کسی کو کھو رہا تھا کوئی گھمسی سے کسی کا مسلک نہیں پوچھ رہا تھا وہاں سب مسلمان اپنی اپنی روایت اپنے اپنے مسلک اور اپنے اپنے عقیدے کے مطابق عبادت کر رہے تھے۔ میں نے جب یہ سارے منظر دیکھے تو میں نے اپنے آپ سے پوچھا اصل اسلام کون سا ہے؟ یہ اسلام یا پھر وہ اسلام جس کا نمونہ ہم سوات اور قبائلی علاقوں میں دیکھ رہے ہیں اگر جبر اور سختی اسلام کا حصہ ہے تو پھر یہ سختی اور یہ جبر مسجد نبوی ﷺ اور خانہ کعبہ میں دکھائی کیوں نہیں دے رہا۔ اگر پردہ چار دیواری تک محدود رہنے اور شل کاک برقعے کا نام ہے اور اسلام میں عورتوں کے باہر نکلنے تجارت کرنے اور محرم کے بغیر سفر کرنے پر پابندی ہے تو پھر عورتیں مدینہ منورہ اور مکہ مکرمہ کی گلیوں میں کیوں گھومتی ہوئی دکھائی دے رہی ہیں یہ عورتیں حدود و حرم میں تجارت کیوں کر رہی ہیں اور ان سے مرد کیوں خریداری کر رہے ہیں اگر اسلام میں حجام کی دکانوں اور سی ڈی کی گنجائش نہیں تو پھر خانہ کعبہ کے بالکل سامنے حجام کی دکانیں کیوں ہیں اور یہ حجام لوگوں کی شیو کیوں کر رہے ہیں؟؟ مجھے ان سوالوں کا کوئی جواب نہیں ملا۔

مجھے نہیں معلوم مولانا صوفی محمد کے بیانات سے اسلام اور پاکستان کو کوئی فائدہ ہوتا ہے یا نہیں لیکن میں اتنا جانتا ہوں اس قسم کے بیانات اور رائے نقل پر وہاں شریعت سے اسلامی دنیا اپنی واحد انہی طاقت سے ضرور محروم ہو جائے گی۔ ہم اسلام پائیں یا نہ پائیں لیکن ہم اپنا انہم ہم ضرور کھو دیں گے۔



عورت

پوپ نے چھوٹے پادری کا امتحان لینے کے لیے اسے حضرت مریم علیہا السلام کی تعریف کا حکم دیا، پادری پوپ کے سامنے کھڑا ہوا، گاؤں کی چینی کھول کر دوبارہ باندھی، سینے پر صلیب کا نشان بنایا اور پھر آنکھیں بند کر کے مخاطب ہوا۔ "قاہر عیسیٰ علیہ السلام کی ماں ہونے کے بعد مریم علیہا السلام کو کسی دوسری تعریف کی ضرورت نہیں۔"

ایک مدت بعد جب ڈاکٹر علی شریعتی سے اس سے ملتا جلتا سوال پوچھا گیا تو مفکر ایران نے مسکرا کر کہا، "حضرت فاطمہؑ کے مقام نے ایک مدت تک مجھے پریشان رکھا، میں نے سوچا فاطمہؑ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی ہیں لیکن پھر سوچا نہیں آپ کا اس کے علاوہ بھی ایک مقام ہے، سوچا فاطمہؑ حضرت علیؑ کی بیٹی ہیں لیکن پھر سوچا نہیں آپ کا اس کے علاوہ بھی ایک مقام ہے، سوچا فاطمہؑ حسینؑ کی والدہ ہیں لیکن پھر سوچا نہیں آپ کا اس کے علاوہ بھی ایک مقام ہے۔ سوچا فاطمہؑ خاتون جنت ہیں لیکن پھر سوچا نہیں آپ کا اس کے علاوہ بھی ایک مقام ہے، قصہ مختصر صاحبو! میں سوچتا چلا گیا، سوچتا چلا گیا، جب تھک گیا تو بات کہیں پر آ کر ختم ہوئی، "فاطمہؑ از فاطمہؑ۔" اکثر ایسا ہوتا، جب سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم گھر سے نکلنے لگتے تو وہ اپنے ننھے ہاتھوں سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی انگلی پکڑ کر ساتھ چلنے کی ضد فرماتیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم شفقت سے سر پر ہاتھ پھیر کر فرماتے۔ "بیٹی! خواہش کیوں؟" تو وہ بھری آنکھوں سے محبوب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر کہتیں، "بابا جان مجھے خطرہ ہے کہیں اکیلا جان کر کفار آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو نقصان نہ پہنچا دیں۔" یہ بھی ہوتا تھا جب پائے مبارک میں کافروں کے بچھائے کاغذ چھ جاتے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم ناخن مبارک سے کھینچتے اور نوکیلے سرے نوٹ کر گوشت لہی میں رو جاتے، تو وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا جوتا اتار کر اپنی نخی انگلیوں سے پائے مبارک کے کاغذ پختی جاتی تھیں اور سسکیاں بھرتی جاتی تھیں، اور یہ بھی ہوتا تھا، جب کفر کے غرور میں جلا کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سر مبارک پر آلودگی پھینک دیتے تو آپ اپنے ہاتھوں سے صاف کرتیں، گرم پانی سے سر مبارک دھوئیں اور روتی جاتی تھیں اور یہ بھی ہوتا تھا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم سارے شہر کی نفرت سمیٹ کر گھر واپس آتے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دستار مبارک کھول کر بالوں میں تیل لگاتیں، کنگھی کرتیں اور اپنی بیٹی کی ہولی آواز میں کہتیں، "بابا جان فکر نہ کریں ہمارا رب ہمارے ساتھ ہے۔"

باپ بنی میں انیسیت بھی تو بہت تھی، آپ کی رخصتی کے بعد بھی کوئی ایسا دن نہیں گزرا، جب آپ ﷺ نے بنی کا دیدار کیا ہو، آپ ﷺ کو شش کر کے اس راستے سے گزرتے جس پر حضرت ملی علیہ السلام کا گھر تھا، جب حضرت فاطمہ کی طبیعت تاساڑ ہوتی تو محبوب خدا ﷺ بے چین ہو جاتے تھے اور آپ ﷺ تھیں بھی تو انوکھی، حضرت علیؓ کے گھر میں قدم رکھتے ہی سارے گھر کا کام سنبھال لیا، گھر میں جھاڑو دیتی تھیں، کنوئیں سے پانی لاتیں تھیں، جانوروں کو چارہ ڈالتی تھیں، آٹا پیسی تھیں، برتن دھوتی تھیں، کپڑے سیتی تھیں، کھجوریں صاف کرتی تھیں اور حضرت علیؓ کے ہتھیار تیز کرتی تھیں، جب بہت غربت تھی تو اس وقت بھی حسنؓ اور حسینؓ کو اس شان سے بنا سنوار کر گھر سے باہر بھیجتیں کہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے یہ دونوں مدینہ کے سب سے بڑے رئیس کے بیٹے ہیں۔

میں جب مقام فاطمہؓ کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے حیات اقبال کا وہ واقعہ یاد آتا ہے، جب شاعر مشرق نے اپنے استاد میر حسن کا نام شمس العلماء کے خطاب کے لیے پیش کیا، کمیٹی کے ارکان نے پوچھا ان کی تصنیف کیا ہے؟ علامہ اقبال نے اپنی طرف اشارہ کر کے کہا: "میں ہوں ان کی تصنیف۔" آپ اس واقعے کی روشنی میں مقام فاطمہؓ کی جستجو کریں تو آپ کو کر بلا کے میدان میں کھڑے حسینؓ حضرت فاطمہؓ کے مقام کا تعین کرتے نظر آئیں گے، جن کے دس دن آج تک چچ چچ کر کہہ رہے ہیں "ہاں میں ہوں فاطمہؓ کی تصنیف۔"

یہ اعزاز بھی صرف فاطمہؓ بنت محمد ﷺ ہی کو حاصل ہے کہ بڑے سے بڑا گناہ گار، فاسق اور فاجر بھی رد و نفل پڑھ کر "خاتونِ جنت" سے بارگاہ رسالت ﷺ، بارگاہ خداوندی میں سفارش کی درخواست کرے تو اس کی دعا قبول ہو جاتی ہے۔

محترم قائدین! آج 8 مارچ ہے، حقوق نسواں کا عالمی دن، مجھے یقین ہے آج بھی گزشتہ برسوں کی طرح پاکستان کے تمام بڑے چھوٹے شہروں میں غیر ملکی خوشبوئیات سے معطر، الٹرا ماڈرن خواتین آزادی نسواں کے سیمینار کریں گی، جن میں ہر مقررہ "مردوں" کے اس معاشرے پر خوب کچڑ اچھالیں گی۔ عورت کے حقوق، عورت کی آزادی اور عورت کی برابری کے لیے نعرے لگائے جائیں گے۔ پاکستانی عورت کی مظلومیت ثابت کرنے کے لیے امریکہ، یورپ، آسٹریلیا اور مشرقِ بعید کی رپورٹوں کے حوالے دیئے جائیں گے۔ زچکیوں کے دوران مرنے والی خواتین، خاندانوں سے اپنے والی عورتوں اور گھروں سے بھاگنے والی لڑکیوں کی داستانیں سنائی جائیں گی، اس ملک جو غربت کے 127 ویں نمبر پر ہے جس کے 6 کروڑ 63 لاکھ 66 ہزار لوگ غربت کی کلیں سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں، ان کی عورت کا تقابل "مس یورپ" سے کیا جائے گا لیکن ان بھرے بھرائے ہالوں میں کوئی ایک خاتون بھی فاطمہؓ بنت محمد ﷺ کا ذکر نہیں کرے گی، جو بچی تھیں تو نسل انسانی کے سب سے بڑے انسان کے زخم دھوتی تھیں، جو لڑکی تھیں تو اپنے دور کے سب سے بڑے شجاع

کو زبردستی پر پائنت تھیں اور جو خاتون تھیں تو تاریخ کے سب سے بڑے شہید کی پرورش کرتی تھیں، اور جس نے زندگی سے، وقت سے، معاشرے سے ٹھہر بھر کچھ نہیں لیا، اسے صرف دیا ہی دیا۔

جج ہے "مردوں کی برتری" کے معاشرے میں آج عورت کو وہ مقام حاصل نہیں جو حضرت ابو بکرؓ سے لے کر حضرت عائشہؓ تک کے ادوار میں حاصل تھا لیکن اس کے باوجود یہ بھی جج کہ اس کو جو پروڈکٹ یہاں دیا جاتا ہے وہ شاید یورپ کی عورت کو ایک ہزار سال بعد بھی نصیب نہ ہو۔ آج بھی لوگ پرانی عورت کو دیکھ کر نظریں نیچی کر لیتے ہیں، بسوں میں ان کے لیے نشست خالی کر دیتے ہیں، ان کی موجودگی میں سگریٹ نہیں پیتے، ان سے عزت و احترام سے مخاطب ہوئے ہیں، آج بھی لوگ گھر میں بیٹی پیدا ہونے پر شراب چھوڑ دیتے ہیں جو اور بری صحبت ترک کر دیتے ہیں، آج بھی لفظ "بھالی" سن کر لوگوں کی آنکھیں جھک جاتی ہیں۔ آج بھی لوگ عورت سے زیادتی پر باہر آ جاتے ہیں، آج بھی لوگ ایک زنانہ جج پر اپنے ہم جنس کو پیٹنے دیر نہیں لگاتے، آج بھی لوگ بیوی کو طلاق دینے اور ماں، بہن اور بیٹی سے تلخ کلامی کرنے والے مرد کو پاس نہیں بیٹھنے دیتے، آج بھی گھروں میں بوڑھی ماؤں، دادیوں اور نانوں کو "نیو بھیس" کی حیثیت حاصل ہے، ہاں آج بھی اس "قدامت پسند" معاشرے میں عورت اتنی محفوظ ہے جتنی یورپ کے جنگلی معاشرہ میں کبھی نہیں تھی۔

پھر سوچنے کی بات ہے، یہ عورتیں کون ہیں جو اسلام آباد میں بیٹھ کر ان "فاطمائیں" کے لیے اس یورپ جیسی آزادی طلب کر رہی ہیں، جہاں عورت، عورت نہیں اندسڑی ہے، جہاں مرد وراثت میں حصہ داری، ٹیکس اور اخراجات کے ذریعے سے پوری زندگی کی "صحبت" کے بعد بھی عورت کو بیوی کا درجہ نہیں دیتے، جہاں ایک ہی عورت کے تین بچوں کے رشتہ اور ناک نقشے آپس میں نہیں ملتے، جہاں عورت بیٹی، بہن، بیوی اور ماں نہیں صرف "پازنر" ہے۔

جب فیروز خان نون نے کسی مسئلے پر انگریز سرکار کو چنگیز خان جیسے حملے کی دھمکی دی تو منہرو نے مجلس احرار کے ایک جلسے میں کہا تھا۔ "افسوس چنگیز خان کا ذکر کرنے والے بھول گئے ان کی تاریخ میں ایک عمر فاروق بھی تھا۔"

ہاں آج جب یہ چند نا سمجھ خواتین اس مغرب جیسی آزادی طلب کرتی ہیں جس میں اب طلاق، جنس اور ناجائز بچوں کے سوا کچھ نہیں تو میں سوچتا ہوں، افسوس میڈونا اور الزبتھ ٹیلر جیسی زندگی کی خواہش مند عورتیں یہ بھول گئیں، ان کی تاریخ میں ایک فاطمہ بھی تھی اصلی اور حقیقی عورت۔



کچھ اپنے بارے میں

ظاہر ہے، جس شخص کو آپ ہفتے میں چار پانچ بار پڑھتے ہوں، جس کی تصویر (جیسی بھی ہے) دیکھتے ہوں اور جس کی جچی جھوٹی باتوں پر یقین کرتے ہوں، اس کے بارے میں جاننے کی خواہش بالکل فطری ہے، لہذا میں آپ لوگوں کے ان خطوط اور ٹیلی فون کالز سے پریشان نہیں ہوں جن میں آپ میرے بارے میں "نوؤ" لگانے کی کوشش کرتے ہیں۔ دراصل میں بھی آپ لوگوں سے مختلف "چیز" نہیں ہوں، میرے بھی لکھنے والوں کے بارے میں یہی احساسات تھے جو آپ کے ہیں۔ میں بھی ان لوگوں سے ملنے کی شدید خواہش رکھتا تھا (اب بھی ہے) جنہیں میں باقاعدگی سے پڑھتا تھا، مثلاً بچپن میں جب میں اشتیاق احمد کے جاسوسی ناول پڑھتا تھا تو گھر سے بھاگ کر ان کے پاس جانے کے منصوبے بناتا رہتا تھا اب یہ اشتیاق احمد صاحب کی خوش قسمتی تھی کہ میرے پاس بھی اتنے پیسے جمع نہ ہو سکے جن سے میں اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنا سکتا، لہذا اشتیاق صاحب بھی بچ گئے اور میں بھی۔ اسی طرح میں مرحوم ممتاز ملتی سے اتنا متاثر تھا کہ میں نے ان کے بارے میں تمام ظاہری و باطنی تفصیلات جمع کر لیں۔ 93ء میں جب ان سے پہلی ملاقات ہوئی تو میں نے انہیں یہ بتا کر حیران کر دیا کہ آج اس وقت ان کی عمر اتنے سال، اتنے مہینے، اتنے دن اور اتنے گھنٹے ہے۔ آج تک انہوں نے اتنے افسانے لکھے، اتنے معاشقے کئے اور انہیں اتنی بیماریاں ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

مجھے ہفتے میں سو سے زائد خطوط موصول ہوتے ہیں جن میں 90 فیصد احباب کا ایک ہی مطالبہ ہوتا ہے کہ میں اپنی موجودہ تصویر شائع کروں، غالباً میرے یہ بھی خواہ مجھے ہر صورت گنجائش دیکھنا چاہتے ہیں۔ میری گردن میں رعشہ اور میری ٹھوڑی پر گرگشت لٹکا دیکھنے کے متنی ہیں، لیکن انہوں میں ان کی یہ خواہش پوری نہیں کر سکتا، کیونکہ میں اپنی بے شمار بداعتدالیوں، فضول خرچیوں، اور پریشانیوں کے باوجود بڑی مشکل سے 30 برس کا ہوا ہوں، لہذا اگر انصاف کیا جائے تو میں اپنی تصویر سے بھی سال چھ مہینے جھوٹا ہی لکھوں گا۔ ویسے بعض اوقات میں اپنے ان احباب کا دل رکھنے کے لیے اپنی اس میں برس پرانی تصویر شائع کرنے کے بارے میں سوچتے بھی لگتا ہوں لیکن پھر اس خدشے سے رو جاتا ہوں کہ کہیں گھنٹوں کے بل چلتے بیٹے، نیکر چہن کر دھوپ میں کھڑے لڑکے یا ایک میلے کچیلے اور تیل میں چڑے ہوئے جوان کی تصویر پڑھنے والوں کی طبع سلیم پر گراں نہ گزرے، لہذا جیسا ہوں جہاں ہوں کی صورت میں حاضر ہوں، لہذا اگلے دس پندرہ برس تک اسی تصویر سے

قارئین میرے بیک گراؤنڈ کے بارے میں مجس جس تعلیم کہاں تک پائی، نوکری کہاں کہاں کی، اب کہاں رہتے ہیں، کیا کیا پڑھتے ہیں اور بچے کتنے ہیں، قسم کے سوالات بھی پوچھتے ہیں، تو جناب "بیک گراؤنڈ" کچھ ایسی نہیں کہ اس پر فخر کیا جائے۔ خالصتاً وہی پس منظر سے تعلق ہے، ضلع گجرات کے ایک چھوٹے سے قصبے لالہ موسیٰ کا رہنے والا ہوں، جس کی دو ہی چیزیں مشہور ہیں ایک ریلوے جنکشن اور دوسرا گاؤں بٹ۔ تعلیم کا آغاز ماشاء اللہ ٹاٹ سکول سے کیا، مہاراجپن تھوک سے سلیٹیں صاف کرتے، قطار میں کھڑے ہو کر پہاڑ سے یاد کرتے، ماسٹروں کے ڈنڈے کھاتے، سکول سے بھاگتے، مرغابنے اور تختیاں سمکھاتے گزرا، 84ء میں میٹرک کیا، والد صاحب کم پڑھے لکھے تھے، لہذا ان کا خیال تھا صرف ڈاکٹروں اور انجینئروں کو ہی پڑھا لکھا سمجھا جاتا ہے، چنانچہ ان کی خواہش (آپ ذرا بھی کہہ سکتے ہیں) کے احرام میں ایف ایس سی میں داخلہ لے لیا لیکن خوش قسمتی سے فیل ہو گیا۔ یوں مجبوراً ایف اے کا پرائیوٹ امتحان دیا اور پاس ہو گیا۔ بورڈ میں چھوٹی موٹی پوزیشن بھی آگئی۔ بی اے، ایف سی کالج لاہور سے کیا۔ ایم اے (ایلا غیات) اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور سے کیا۔ کچھ معیار تعلیم کی پستی کام آئی اور کچھ اس برس پر پے بھی آسان تھے، لہذا یونیورسٹی میں اوّل پوزیشن آگئی، گولڈ میڈل مل گیا واپس لاہور آکر "پکٹر" چلایا اور پنجاب یونیورسٹی کے "لاء ڈیپارٹمنٹ" میں داخلہ لے لیا، لیکن نتیجہ ایف ایس سی سے مختلف نہ لگا۔

نوکری کی پہلی درخواست "روزنامہ خبریں" میں دی (ابھی اخبار نہیں نکلتا تھا) نیست ہوا تو فیل ہو گیا۔ لہذا انصیاء شاہد صاحب کو پھر آئیں گے، کی "دھمکی" دے کر چلا آیا۔ انہی دنوں نوائے وقت لاہور میں ایک جگہ نقلی تو عباس اطہر صاحب کی مہربانی سے اونٹ کوئیے میں سرچھپانے کا موقع مل گیا۔ اپنے توصیف احمد خان صاحب بخوار اینڈ بیڑ تھے ماشاء اللہ مجھ سے بہت ہی ٹنک تھے لیکن نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کے اصول کے باعث زیادہ بے عزتی نہیں کرتے تھے۔ دسمبر 92ء میں اسلام آباد سے روزنامہ پاکستان نکلا تو برادر مسلم خان کی انگلی پکڑ کر اس باہر ادھر میں آ گیا۔ شروع شروع میں ہم دس لوگ دو کمرے کے فلیٹ میں رہتے تھے۔ دن میں ایک بار کھانا کھاتے تھے چار چار روز بعد شیدو کرتے تھے، ساری رات کام کرتے تھے اور دن بھر سوتے تھے، تقریباً پانچ برس اس اخبار میں مختلف حیثیتوں سے کام کیا، سب اینڈ بیڑ رہا، ڈیسک انچارج رہا، شفٹ انچارج رہا، بخوار اینڈ بیڑ بنا پھر آخری ایک سال میگزین اینڈ بیڑ کی حیثیت سے کام کیا، اس ادارے میں اتنے برس گزارنے کی واحد وجہ جناب پرویز ذوالفقار (ایگزیکٹو اینڈ بیڑ) تھے، جن کی محبت پاؤں کی بیڑیاں بنی رہی۔ جون 97ء کو ایک قومی سطح کی خبر رساں ایجنسی سے بطور اینڈ بیڑ وابستہ ہو گیا۔ یکم جولائی 97ء کو روزنامہ "خبریں" میں کالم لکھنا شروع کیا، 7 اگست 98ء تک اس ادارے سے وابستہ رہا پھر وہی کچھ ہوا جو عموماً ایسے کاموں میں ہوتا ہے لہذا وہاں سے باعزت بری ہو گیا، 9 اگست 98ء کو روزنامہ "اساس" راولپنڈی اور "امت" کراچی میں سینڈ کیٹ

کالم شروع کیا، کوئی ایک کالم جناب میرٹھیل الزمن صاحب کی نظر سے گزرا انہیں پسند آیا تو انہوں نے اسی وقت اسلام آباد سے کراچی بلا لیا، آدھ گھنٹے کی ملاقات میں بہت کچھ طے ہو گیا جس کے بعد میں نے واپس اسلام آباد آکر کام شروع کر دیا، آخری اطلاعات آنے تک میں روزنامہ ”جنگ“ ہی کا ملازم ہوں۔

اس مختصر تجزیاتی زندگی میں کچھ لوگوں کے بہت احسان ہیں، جن کے بوجھ سے مردن سیدھی نہیں ہوتی۔ فیصلہ ہے اگر باقی زندگی یہ قرض ادا کرتے گزر جائے تو ضائع ہونے سے بچ جائے گی۔ ان میں بھائی رفیق افغان (امت کراچی کے چیف ایڈیٹر) ہیں انہوں نے اتنی محبت دی جتنی ایک بڑا بھائی ہی دے سکتا ہے۔ جناب چوہدری قدرت اللہ ہیں (روزنامہ پاکستان کے ایگزیکٹو ایڈیٹر) انہوں نے اولاد کی طرح محبت دی، ان کے سامنے آنکھ اٹھتی ہے اور نہ زبان کھلتی ہے۔ جناب ہارون الرشید ہیں ان کی انسپٹریشن نہ ہوتی تو شاید مجھے پوری زندگی اپنی اس صلاحیت کا علم نہ ہوتا۔ جناب ظلیل ملک ہیں انہوں نے ہی مجھے کالم نویس بنایا جو کچھ ہوں ان کی محبت اور رہنمائی سے ہوں۔ جناب خوشنود علی خان ہیں جب سارے دروازے بند تھے تو انہوں نے اپنے سارے دروازے کھول کر میرا استقبال کیا۔ جناب ضیاء شاہد ہیں جنہوں نے لوہے کے اس گھڑے کو سونا بنا دیا۔ جناب نسیم انور بیگ ہیں جن کے دماغ سے سوچتا ہوں، جن کی محبت سے دیکھتا ہوں اور جن کی جرأت کی تلواریں لڑتا ہوں، جناب پروفیسر احمد رفیق ہیں، انہوں نے مجھ جیسے دہریے کو کان سے پکڑ کر خدا کے سامنے لا بٹھایا اور فرمیں آپ سب لوگ ہیں جن کے خطوط، جن کی دعاؤں مجھے جبریل احساس دلاتی ہیں کہ میں صحرا کے نیلوں سے مخاطب نہیں ہوں، جیتے جاگتے انسانوں سے گفتگو کر رہا ہوں اور سب سے بڑھ کر میرا وہ رب ہے جس کے فیصلے اٹل ہیں جس کو سب خبر ہے کہ کس نے کب، کہاں اور کیا کرنا ہے۔

جب آپ میری تحریروں کی تعریف کرتے ہیں تو مجھے بے اختیار مرحوم ممتاز مفتی یاد آ جاتے ہیں جو اکثر کہا کرتے تھے۔ ”لکھنا ایک کام ہے اسے دوسرے تک پہنچانا دوسرا کام ہے، میں لکھ سکتا ہوں لیکن دوسروں تک پہنچا نہیں سکتا، کیونکہ یہ کام خدا نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا ہے وہ جس لفظ کو چاہے سینوں کے پار کر دے اور جس کتاب کو چاہے ردی کی دکانوں پر ذلیل و خوار کر دے۔“

ہاں، محترم قارئین اس ملک میں ہزاروں لوگ لکھ رہے ہیں لیکن ان کی تحریروں اثر سے خالی ہیں اس کی ہرگز یہ وجہ نہیں کہ وہ برا لکھتے ہیں، محنت نہیں کرتے یا ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں۔ ایسا ہرگز نہیں، ان میں اکثر ”کرافٹس مین شپ“ کی صلاحیت سے مالا مال ہیں، لیکن بد قسمتی سے ان کے لفظوں کو پہنچنے کی اجازت نہیں ملتی، انہیں حیرت کر سینوں میں اترنے کا حکم نہیں ملا..... بس اتنی سی بات ہے باقی سب لفظوں کا گورکھ دھندہ ہے۔

(نوٹ: یہ کالم روزنامہ خبریں میں شائع ہوا، اسے قلمی بہت تبدیلی کے ساتھ کتاب میں شامل کیا جا رہا ہے۔)



فرسودہ لوگ

اباجی کی آنکھ عموماً مدھانی کی "کھر کھر" یا بچی کی "کوں کوں" سے کھلتی تھی، جس کے بعد وہ ایک طویل جھانی اور طویل ترین انگڑائی کا ناشہ کر کے ڈنکر کھولتے اور "بابر" چلے جاتے، اگر کبھی گھر کے حالات بہتر ہوتے تو "بے جی" منہ اندھیرے چولہا جلا کر بیٹھ جاتیں جو غمی کے ایلوں کا دھواں اباجی کے نختوں سے نکراتا وہ دوسرے بہن بھائیوں کے ساتھ آنکھیں ملتے ہوئے آتے اور صحن کے ایک کونے میں بنے کچے چوبے کے گرد آ بیٹھتے، جہاں بے جی روٹی ڈالنے سے پہلے تو بے کنارے پر مکھن کی "بکی" رکھتیں جو حرارت سے تیرتی ہوئی مین در میان آ کر خضر جاتی تو "بے جی" تو بے پر روٹی شیخ ویتیں اور ایک شوں کے ساتھ تازہ مکھن کی مہک پورے صحن میں پھیل جاتی اور جب وہ "پراٹھا" لسی کے پیالے کے ساتھ چباتے تھے تو ان کے منہ میں دسی گھی کے ساتھ ساتھ کبھی اچھی کھڑی اور کبھی کچے ایلوں کا کڑوا دھواں بھی ٹھٹھکتا تھا لیکن روٹی ملنے کی خوشی میں کڑوے دھوئیں کی کسے پروا ہوتی تھی اور ہاں اس "بندیک فاسٹ" کے بعد وہ اپنے سنے ہوئے ہاتھ گندے کرتے سے صاف کرتے تھے یا کبھی کبھار خوشی زیادہ ہوتی تو انگلیاں بالوں میں بھی پھیر لیتے تھے۔

روز سکول جانے سے پہلے وہ دسی صابن سے منہ دھوتے تھے اور باقی سارا دن خشکی دور کرنے کے لیے ہاتھوں سے چہرہ رگڑتے رہتے تھے۔ گرمیوں میں صرف دھوتی باندھ کر باقی جسم قدرت کے "ایئر کنڈیشنڈ سسٹم" کے حوالے کر دیتے تھے، جبکہ سردیوں میں بغلوں کو "بیز" سمجھ کر سارا سارا دن اور ساری ساری رات ہاتھ ان میں دبائے پھرتے تھے۔ ان کا سکول پانچ میل دور تھا لہذا وہ پانچ میل جاتے اور پانچ میل پیدل واپس آتے۔ دس میل کی اس "تورازم" کے دوران اگر ان کے "لچ" کا وقت ہو جاتا تو وہ راستے ہی میں کسی کھیت سے گئے توڑ کر چوس لیتے تھے، کبھی قسمت زیادہ مہربان ہوتی تو راستے میں مولیاں، شلکم اور گرجاں بھی ہاتھ لگ جاتی تھیں، جنہیں وہ بغیر دھوئے محض جھاڑ پونچھ کر کھا جاتے اور اس مولی کا جر کے ساتھ عموماً مٹی کا ایک مناسب حصہ بھی ان کے پیٹ میں چلا جاتا تھا لیکن کچھ فرق نہیں پڑتا تھا کیونکہ ان دنوں مٹی پیٹ میں چا کر پتھری نہیں بنتی تھی اور کبھی ایسا بھی ہوتا کہ کھیتوں کے والی وارث "موقع واردات" پر موجود ہوتے تو مجبوراً اباجی کو اپنا لچ بیروں تک محدود رکھنا پڑ جاتا۔

اباجی کی تمام تر تعلیمی قابلیت تین کتابوں، ایک تختی اور ایک سلیٹ پر مشتمل تھی اگر کسی سال بد قسمتی

سے اباجی پاس ہو جاتے تو مجبوراً کتابیں بدلنا پڑ جاتیں لیکن محنتی اور سلیٹ نے دوسری جماعت تک ان کا ساتھ دیا۔ یہ صحبت مزید آگے بھی چل سکتی تھی لیکن دوسری جماعت کے بعد بزرگوں نے تعلیم جیسا ”غیر پید اواری“ شغل جاری رکھنے کی اجازت نہ دی۔ اباجی بتاتے ہیں ان دنوں ماسٹر کانڈ اور قلم کے بجائے ڈنڈوں اور ہتھکڑوں سے پڑھایا کرتے تھے، اس لیے باہت طالب علم ہاؤ کے بچاؤ طالب حسین بننا زیادہ پسند کرتے اور جو ایک آدھ کز در اور بڑوں کو جوان بھانسنے کی جرأت نہ کرتا اسے مجبوراً پڑھنا پڑ جاتا۔ زندگی کے ایک طویل عرصے تک انہوں نے نصاب کی چند کتابوں کے سوا کوئی کتاب نہیں دیکھی تھی۔ جب وہ بیس برس کی عمر میں پہلی بار شہر آئے تو ایک بک سٹال پر رنگین کانڈوں پر چھپی سٹنڈروں کتابیں دیکھ کر پریشان ہو گئے۔

اباجی کو جنوں اور کپڑوں کا جوتا سال میں ایک بار ملتا تھا لہذا وہ جنوں کو عموماً حفاظت خود اہتمامی کے تحت پاؤں میں کم اور بغل میں زیادہ رکھتے تھے۔ رہے کپڑے تو وہ چند ہی قمیٹوں میں درختوں پر چڑھنے اور ڈنگروں کے پیچھے بھاگنے سے ”لیرو لیز“ ہو جاتے، جنہیں ”بے جی“ بڑی مہارت سے سی کر دوبارہ قابل استعمال بنا دیتیں۔ سکول سے واپسی پر چارہ کاٹنا، جوہڑ پر بھینسوں کے ”فلس“ کا اہتمام کرنا، ”کھن“ کے لیے لکڑیاں چٹنا اور کٹائی کے موسم میں سکول سے طویل چھٹیاں کرنا ان کی کی ذمہ داری تھی۔ کبھی کسی غفلت کے باعث ان سے یہ ذمہ داری بھانے میں کوتاہی ہو جاتی تو ان کے اباجی، جنہیں سب ”چاچا“ کہتے تھے فوری انصاف کی سرسری عدالت لگا کر موقع پر ہی انصاف فراہم کر دیتے تھے، جس کا احساس اباجی کو ایک طویل عرصے تک اُٹھتے بیٹھتے ہوتا رہتا تھا۔

اباجی کا ”ڈنڈ“ بھی بڑا شاندار ہوتا تھا اکثر سب بہن بھائیوں کو لکڑی کی طرح سخت روٹی، کچے دودھ کے ساتھ لھٹا پڑتی تھی۔ کبھی کبھار انہیں ساگ، مولی، کدو اور میٹھن کا سالن بھی مل جاتا تھا۔ لیکن اس کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ اباجی مرفی نہیں کھاتے تھے، لیکن یہ الگ بات کہ ایسا موقع عموماً گاؤں میں ”رائی کھیت“ کی وبا پھیلنے پر ہی آتا تھا۔ تاہم اس ”تھری کورس ڈنڈ“ سے ہٹ کر ان کی متوازن اور مسلسل خوراک کا ذریعہ چوری کے وہ انڈے ہوتے تھے، جنہیں وہ مرفی کے نیچے سے اٹھا کر کچے ہی ”پنی“ جاتے تھے۔

اباجی نے 14 سال کی عمر میں پہلی بار ”روپیہ“ دیکھا انہیں کبھی روپے پیسے کی ضرورت ہی نہیں پڑی تھی کیونکہ جب بھی ”عیاشی“ کا پروگرام بنا گاؤں کے واحد دکاندار کو دکانوں کا ”نوپ“ دے کر بتا دیتے، گڑ، مٹھے، یا مروندا لے لیا اور دنوں تک انہیں چھپا چھپا کر کھاتے رہے۔ 20 برس کی عمر میں جب تاپ چڑھا تو پہلی بار ڈاکٹر کے روبرو حاضر ہوئے لیکن کچے مسلمان ہونے کے باعث ”کافروں“ کی دوا نہیں کھانے سے انکار کر دیا اور اگلے ہی روز تندرست ہو گئے۔ بھینسیں اور گدھے اباجی کی ”انٹرنی ٹرانسپورٹ“ ہوتی تھی اور کبھی کبھار اگر دوسرے گاؤں یا شہر جانا پڑتا تو گھوڑے یا اونٹ سے وہی کام لیا جاتا جو آج کل ٹرکوں سے لیا جاتا ہے۔ گاؤں میں ایک نالی بھی تھا جو پورے گاؤں کی شیو بناتا، بچوں کی ”مسلمانیاں“ کرتا، رشتے کرانا، شادی اور مرگ پر کھانا پکاتا، ایک گھر سے دوسرے گھر اور ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں تک پیغام رسانی کرتا اور فارغ وقت

میں چودھریوں کے سیکینڈل گھڑتا گویا یہ نائی اباجی کا "سی این این" تھا۔ تاہم اباجی کا خیال ہے اس محرومی اور تمام تر غریبانہ پس منظر کے باوجود اس دور میں کوئی "کمپلیکس" نہیں تھا کبھی کسی کو کسی سے شکایت نہیں ہوئی کبھی کسی کو حالات سے شکوہ نہیں ہوا، دکھ آیا تو "یا اللہ خیر" کا نعرہ لگا کر اسے ایک طرف جھٹک دیا، خوشی آئی تو "شکر الحمد للہ" کہہ کر اسے بھی بھول گئے، نہ ماتم ہوتا تھا اور نہ ہی پٹانے ملتے تھے۔

آج کل اباجی میرے پاس اسلام آباد ہیں۔ رات دیر گئے جب سارا شہر سو جاتا ہے تو میں واپس آتا ہوں لیکن گزنی کا باران بجنے سے پہلے ہی انہیں دروازے پر پاتا ہوں، صبح جب ہاتھ کے لیے کمرے سے باہر نکلتا ہوں تو انہیں نینل پر بیٹھا پاتا ہوں۔ ان دونوں موقعوں پر ان کا بس ایک ہی کام ہوتا ہے مجھے گھورتے رہنا، میں جب ان سے اس توجہ خاص کی وجہ سے پوچھتا ہوں تو قہقہہ لگا کر کہتے ہیں۔

"یاد جہاں تک میرا خیال ہے تمہاری عمر 29، 28 سال ہے لیکن تمہارے چہرے پر 60 برس کی سنجیدگی ہے، تم نے کبھی ششے میں اپنی شکل دیکھی، ابھی سے تمہارے چہرے پر جھریاں پڑنا شروع ہو گئیں، تمہارے سر میں سفید بال ہیں، تمہاری گردن پنڈولم بنتی جا رہی ہے، تمہاری ناک میں ہر وقت ہلتی رہتی ہیں، غصہ تمہاری ناک پر دھرا رہتا ہے، چڑچڑے اتنے ہو چکے ہو کہ بچوں کی باتیں تک تمہارے اعصاب پر بوجھ بن جاتی ہیں، گھر میں بڑے ہوتے ہو تو سب سے بڑے ہیں، ملے جاتے ہو تو سب دھڑکیں کر کے تھکتے ہیں" "یا اللہ خیر" یار تم کیا جتنے جا رہے ہو۔"

میں سنتا ہوں تو احترام سے کہتا ہوں "اباجی زندگی بڑی مشکل ہے، زندہ رہنے کے لیے بڑی کوشش کرنی پڑتی ہے آپ کے سامنے ہوں گھر چلانے کے لیے دو دو نوکریاں کرتا ہوں، سارا دان دوڑھوپ میں گزر جاتا ہے، اس محنت کے بعد مزاج میں گرمی، سردی نہ آئے تو کیا ہو۔"

وہ دوبارہ قہقہہ لگاتے ہیں اور کہتے ہیں "تم پر اللہ تعالیٰ کا کتنا کرم ہے، گاڑی ہے، رہنے کے لیے اپنا گھر ہے، دو پیارے بچے ہیں، لوگ تمہاری عزت کرتے ہیں، آمدنی بھی اچھی ہے، گھر میں کوئی بیماری نہیں، کوئی مشکل کوئی مصیبت نہیں لیکن اس کے باوجود تم جو ہیں کھٹے پریشان رہتے ہو، افراتفری اور انتشار میں رہتے ہو، ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر بھاگتے رہتے ہو کیوں؟ کیونکہ تم ناشکرے ہو، اللہ کی نعمتوں کے منکر ہو، دولت کی ہوس میں، آگے بڑھنے کی کوشش میں خدا کو بھول چکے ہو، تم میں اور ہم میں یہی فرق ہے، ہمیں مشکل ہوتی یا آسانی اس کو نہیں بھولتے تھے لہذا زندگی میں ہمارے لیے امن ہی امن اور سکون ہی سکون تھا، لیکن تم مشکل ہو یا آسانی کبھی اس کو یاد نہیں کرتے لہذا زندگی تمہارے لیے مشکل ہی مشکل ہے، بے آرامی ہی بے آرامی، بے چینی ہی بے چینی ہے۔"

یہ وہ لمحہ ہوتا ہے جب میں "ہوں" کر کے اٹھ جاتا ہوں کیونکہ میں ایک معروف آدمی ہوں اتنا معروف آدمی جس کے پاس پرانے اور فرسودہ لوگوں کی "پیرانی اور فرسودہ" فلاسفی کا جواب دینے کے لیے کوئی وقت نہیں۔

نجات دہندہ

(جب ایک اتفاق ملک معراج خالد کو وزیر اعظم پاکستان نے لیا تو میں نے اس "سانحے" پر یہ کالم لکھا جو اسلام آباد کے ایک روزنامے میں شائع ہوا لیکن معدوم سرکولیشن کے باعث پنجاب، سندھ اور بلوچستان کے قارئین اس سے "حلف اندوز" نہ ہو سکے جس کی "سحافی" میں آج کر رہا ہوں۔ ہم ان نازک مزاج قارئین سے، جو عموماً پرانی اور باسی چیزوں سے پرہیز کرتے ہیں، میری درخواست ہے اگر وہ بعض مقامات پر ملک معراج خالد کی جلد نواز شریف کو رکھ کر دیکھیں تو انہیں یہ کالم پرانا محسوس نہیں ہوگا۔)

Kashif Azad @ OneUrdu.com

یہ کوئی بڑی بات نہیں۔

آپ نے کلر کی سے آغاز کیا، آدھی سے زیادہ زندگی سائیکل چلاتے گزاری، کرائے کے مکانوں میں رہتے رہے، ناکام وکیل ثابت ہوئے سگریٹ کا عوامی برانڈ پیٹے رہے، افریقہ اور ایشیا کو قریب لانے کا خواب دیکھتے رہے، جھوٹے غریب ترین ساتھی رہے، سرکاری تقریبات میں سب سے پہلے پہنچتے رہے، لاہور، پریس کلب کی پرانی عمارت کے نیچے تھڑے پر بیٹھ کر تمباکو نوشی کرتے رہے، پنجابی میں لطیفہ گوئی کرتے رہے اور ریڑھیوں سے پٹے خرید کر کھاتے رہے۔

یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں۔

آپ نے وزیر اعلیٰ پنجاب بننے کے بعد اپنا وہ پرانا گھر نہیں چھوڑا جس میں کال بیل تک نہیں تھی لوگ جس کی کنڈی بجا کر اپنی آمد کی اطلاع دیتے تھے اور جو ایک ایسی تنگ و تاریک گلی میں تھا جہاں سے لوگ روز وزیر اعلیٰ پنجاب کو فالتوی بغل میں دبائے پیدل آتے اور جاتے دیکھتے تھے اور جس مکان میں کوئی نوکر، کوئی باورچی اور کوئی آیا نہیں تھی اور جس کے سارے کام "خاتون اول" کو اپنے ہاتھوں سے کرنا پڑتے تھے اور اور لیکن ٹھہریئے، وزیر اعلیٰ پنجاب کی اہلیہ کو روز رکشے پر سکول چڑھانے بھی تو جانا پڑتا تھا۔ اور یہ بھی کوئی بڑی بات نہیں۔

آپ ہجوم میں ممتاز ہونے کی کوشش نہیں کرتے۔ آپ کی ذات میں بجز بھرا ہے، آپ دھیسے لہجے کے، بردبار، شبن اور "کمپلیکس فری" شخص ہیں۔ آپ کسی مالیاتی سیکنڈل میں ملوث نہیں، چوٹی سی گلی میں رہنے کے باوجود آپ کے دامن پر کوئی چھینٹا نہیں، آپ پر کسی نے انگلی نہیں اٹھائی، آپ کو کسی نے برا نہیں کہا اور آپ پر کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ ہاں یہ کوئی بڑی بات نہیں یہ سب عام انسان کی خوبیاں ہیں، ان سینکڑوں، ہزاروں عام انسانوں کی خوبیاں ہیں۔ جنہیں اگر اتفاق وزیراعلیٰ، سپیکر یا وزیراعظم بنا دے تو شاید ان کا رد عمل بھی ایسا ہی ہو۔

ہاں ملک صاحب! تاریخ بڑی سنگدل ہے کہ اسے حکمرانوں کی ذاتی ایمانداری اور انفرادی اخلاق سے کوئی غرض نہیں ہوتی کہ یہ صرف بڑے لوگوں کے کارنامے دیکھتی ہے۔ حضرت عمرؓ کی دوپہر میں صحرا میں گزریں اور راتیں مدینہ کی چوکیداری میں تو تاریخ اسے ایک سطلے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی لیکن امیر المومنین حضرت عمرؓ کے کارناموں سے کتنا ہیں بھری پڑی ہیں۔ خالد بن ولیدؓ کیا کھاتے تھے، کیا پیتے تھے کس گھر میں رہتے تھے، ان کی اولاد کتنی تھی ان کی ساریوں کے نام کیا تھے، تاریخ بالکل خاموش ہے لیکن سیف اللہ کی عسکری حکمت عملی دنیا کی تمام فوجی آکزیڈیموں میں پڑھائی جاتی ہے۔ کتنے لوگ جانتے ہیں کارل مارکس نے اپنے بچے کو اخبار میں لپیٹ کر دفن کیا تھا لیکن گیدوزم کے خالق کو پوری دنیا جانتی ہے۔ ماؤزے تلک سانیکل پر دفتر جاتا تھا، دو کمرے کے مکان میں رہتا تھا، دو سلاکس سے بچ کر رہتا تھا، اس کے پاس کپڑوں کے صرف دو جوڑے اور جوتوں کی ایک جوڑی تھی۔ کون جانتا ہے؟ لیکن عوامی جمہوریہ چین کے "ہانی" ماؤزے تلک کو کون نہیں جانتا، وہ شخص کہاں پیدا ہوا، کہاں رہا اور کہاں دفن ہوا۔ دنیا میں کتنے لوگ جانتے ہیں لیکن ترکی کے معمار اعظم "اتاترک" کسی دماغ سے محو نہیں ہوا۔

اور وہ بھی تو چڑا بیچنے والوں کا کمزور اور دھان پان سا بچہ تھا، جو گورنر جنرل بنا تو صرف ایک روپیہ تنخواہ لی، پرانے بوسیدہ سوٹ پہنے، ایک وقت کھانا کھایا۔ اپنے مناف کو ذاتی جیب سے تنخواہ دی اسے کون جانتا ہے؟ لیکن پاکستان جیسے معجزے کے خالق محمد علی جناح کو کون نہیں جانتا۔

ہاں جناب عالی اگر تاریخ کے نزدیک حکمرانوں کی انفرادی ایمانداری اور شخصی شرافت کی کوئی اہمیت ہوتی تو اس ملک کا بچہ بچہ جانتا ہے، اس ملک کا ایک وزیراعظم تھا جس کی شیر وانی کے بیچے کرتا نہیں ہوتا تھا، اسی ملک میں ایک وزیراعظم بھی گزرا ہے، لیکن میں برتن مانجھتے مانجھتے جس کی اہلیہ کے ہاتھ پٹ گئے تھے، وہ شخص بھی اس ملک کا وزیراعظم تھا جس کا پوری دنیا میں مکان نہیں تھا، وہ بھی اس ملک کا صدر تھا جس کی آخری زندگی لندن میں کرائے کے فلیٹ میں گزری اور اس کی بیوی کو ایک پی آر او کی تنخواہ میں گزارہ کرنا پڑا، وہ بھی اسی ملک کا لیڈر تھا جو فلائنگ کوچ کے حادثے میں مرا تو جیب سے برآمد ہونے والی رقم سے اس کی تدفین تک ممکن نہیں تھی اور اسی ملک میں ایک ایسا مطلق العنان حکمران بھی گزرا ہے جو امریکہ کے دورے پر پہلے آئی اسے کی

عام فلاح پر عام مسافروں کے ساتھ گیا لیکن اب کوئی ان کا ذکر تک نہیں کرتا، کیونکہ ان کے کھاتے میں ذاتی ایمانداری کے سوا کوئی کارنامہ نہیں۔ انہوں نے کوئی قوم تعمیر نہیں کی، انہوں نے کوئی نیا نظام نہیں دیا۔ انہوں نے کسی سسٹم کی اصلاح نہیں کی، نہ انصاف دلایا، نہ تعلیم، نہ عزت، نہ طبقاتی تفریق ختم کی اور نہ معاشی عدل قائم کیا، لہذا تاریخ نے بھلا دیا اور انسانی حافظے نے انہیں فراموش کر دیا۔

ہاں جناب عالی اگر آپ چاہتے ہیں ایک قوم صدیوں تک آپ کی تصویر کو سلوٹ کرتی رہے، شاعر آپ پر نغے لکھیں اور گلوکار اسے مذہبی فریضے کی طرح گاتے رہیں، تو نوں پر آپ کی تصویریں چھپیں اور ہر سال آپ کی یاد میں دن منائے جائیں تو خدا کے لیے اس قوم سے انصاف کر جائیں۔ پچاس برس سے اقتدار کے دروازے پر کھڑے اس ہیوم کو قوم بنادیں، لیکن اگر آپ نے بھی صرف اپنا دامن چھینٹوں سے بچانے کے لیے انہیں مایوس کر دیا تو آپ بھی ویرانے عظیم کے قبرستان میں ایک قبر ہوں گے، ایسے بے چہرہ وزیر عظیم جسے ایک اتفاق ایوان اقتدار تک لے آیا اور دوسرا اتفاق بہالے گیا اور تاریخ میں آپ کا ذکر تک نہیں ہوگا کہ اللہ کے بندوں کو مایوس کرنے والے لوگ تاریخ کے بجائے کوئز بکس میں زندہ رہتے ہیں جنہیں بچے پیلہوں کی طرح پوچھتے اور کہانیوں کی طرح کہتے ہیں۔

ہاں جناب ملک معراج خاں! تاریخ کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ ہر کسی کے ایک ایسے ناکام وکیل کی ایمانداری کا تذکرہ کرتی رہے، جسے قدرت نے لوگوں کا مقدر بدلنے کا موقع دیا لیکن اس نے صرف اپنا دامن بچانے کے لیے اسے ضائع کر دیا۔

ہاں ملک صاحب تاریخ صرف اور صرف ان قبروں پر رکتی ہے جہاں انسانوں کے نجات دہندہ سوئے ہوئے ہیں۔



ایک زندہ شخص

ایک بار ڈاکٹر اشفاق حسین مجھ سے کہنے لگے:

"یار! میں نے مرنا نہیں، ہجرت کرنی ہے، اس شہر سے اس شہر جانا ہے اور جب یہ بیوقوف لوگ مجھے اٹھا کر لے جا رہے ہوں تو کم از کم تو میرے جنازے میں نہ آنا کیونکہ تمہیں تو خبر ہوگی میں اس وقت بھی زندہ ہوں۔" اور جب وہ ایک بار موت سے لڑ کر واپس آئے تو میں نے ان کے کان میں سرگوشی کی۔

"کیوں بتی کیا ہوا؟"

وہ عمر و عیار کی طرح آنکھیں چمکا کر بولے۔

"یالا! وہ کیا تھا موت کا فرشتہ لیکن اب اس سے پہلے کہ وہ میری جھوٹی اپنے سر پر دھکتا میں نے اس سے کہا یار تمہارا جو جی چاہے کرو، بس مجھے ذرا اللہ تعالیٰ سے اتنا پوچھ دو، میری اوپر زیادہ ضرورت ہے یا نیچے؟" اس نے کہا "اچھا تم یہیں رکو میں ابھی پوچھ کر آتا ہوں" اور غائب ہو گیا اور اس کے بعد ابھی تک واپس نہیں آیا۔ شاید اللہ تعالیٰ نے اسے کسی اور کام لگا دیا ہے۔

ہم جب بھی موت، کفن یا قبرستان کا ذکر کرتے ڈاکٹر اشفاق حسین ہمیں روک کر کہتے۔ "نہیں دوستو! بڑی بات، تم لوگ زندہ ہو صرف زندگی کی بات کرو۔" لیکن ہم میں سے کوئی انہیں ٹوک کر کہتا۔ "ڈاکٹر صاحب! موت سب سے بڑی حقیقت ہے، وہ کھانٹے پھر ہنستے اور پھر کہتے: "پر دوستو! زندگی اس سے بھی بڑی حقیقت ہے وہ لوگ بڑے بے وقوف ہوتے ہیں جو چمکتی دوپہر میں رات کے اندیشے سے کانپنے رہتے ہیں۔" مجھے شوگر ہو گئی تو میں سخت پریشانی میں ان کے پاس گیا۔ مجھے دیکھ کر کہنے لگے: "یہ تم چہرے کی جگہ تریوز لگا کر کیوں آ گئے؟" میں نے خون کی رپوٹ ان کے سامنے رکھ دی۔ انہوں نے دیکھی، قہقہہ لگایا اور اسے پرزے پر لے کر نوکری میں ڈال کر بولے: "یار تم نے زندگی میں کبھی بیماری دیکھی ہی نہیں، ورنہ اس معمولی مسئلے پر اتنے پریشان نہ ہوتے۔" مجھے دیکھو۔ میں چار سال سے چار پائی پر پڑا ہوں، میرا جگر درد بھرا چھوڑا ہوا ہے، گردے اچھا کام بند کر چکے ہیں، پیٹ سے ہنسنے میں چھ بوتلیں پانی نکلواتا ہوں، بغیر سہارے کے کروٹ نہیں بدل سکتا، کھل کر سانس نہیں لے سکتا، جی بھر کر کھا نہیں سکتا اور ستم یہ کہ ستار تک نہیں بجا سکتا،

لیکن ان چار سالوں میں تم نے ایک بار بھی مایوس دیکھا؟ کبھی ”مجھے بھی بلا لویا رسول اللہ ﷺ کا نعرہ لگاتے سنا، لوگوں سے بیزار اور تنہائی کا شکار دیکھا؟“

میں نے فوراً نفی میں سر ہلادیا۔

”تم نے کبھی سوچا میں اتنا خوش کیوں ہوں، میرے اطمینان کے پیچھے کیا فارمولا ہے؟“

میں نے پھر گردن نفی میں ہلادی۔

”وہ یہ میری جان کہ میں نے اپنے اندر زندگی کی خواہش کو مرنے نہیں دیا، اس کی ایسے حفاظت کی، جیسے ماں اپنے پیٹ کے بچے کی کرتی ہے چنانچہ تمہارے سامنے ہوں، خوش ہوں، سرور ہوں، قہقہے لگاتا ہوں، لطیفہ سناتا اور سناتا ہوں..... اور تم یہ قوف خضں صرف ”شوگر“ سے پریشان ہو، جو روزانہ ایک گھنٹہ واک سے ٹھیک ہو سکتی ہے۔“ وہ تھوڑی دیر کے لیے رکے اور پھر گویا ہوئے۔

”اور ہاں تمہیں ایک اور بات بتا دوں، اسے تختہ درویش جانو، جب تک انسان کے اندر زندہ رہنے کی خواہش زندہ رہتی ہے وہ مرنے نہیں سکتا۔ یہ میرا ایمان بھی ہے اور تجربہ بھی۔ مجھے دیکھو جس بندے کا جگر ختم ہو چکا ہو، کیا وہ زندہ رہتا ہے پر میں چار برس سے زندہ ہوں کیوں؟ صرف اس لیے کہ میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔“ ڈاکٹر اشفاق خاموش ہو گئے۔

ڈاکٹر صاحب میں زندگی بھی بہت ان کے آگے آگے سے لکھ رہی تھی، ایک ایک لفظ سے جھلکتی تھی۔ جب بے نظیر بھٹوان کی چند پڑیوں سے دوبارہ زندہ ہو گئی تو اس نے ڈاکٹر اشفاق حسین سے پوچھا: ”ڈاکٹر صاحب میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟“ ڈاکٹر صاحب نے من کر قہقہہ لگایا اور بولے: ”بی بی آپ میرے لیے کچھ نہیں کر سکتیں کیونکہ میری کوئی ایسی ضرورت نہیں جو پوری نہ ہوتی ہو، کوئی ایسی خواہش نہیں جس سے میں نے لطف نہ اٹھایا ہو۔“

”میں آپ کے لیے پھر بھی کچھ کرنا چاہتی ہوں۔“ بینظیر نے زور دیا۔

”اچھا“ ڈاکٹر اشفاق نے تھوڑی دیر تک سوچا اور پھر بولے: ”پرائم فئیر آپ نے کبھی مرداقل کو اپنے ہاتھوں سے چائے بنا کر پلائی؟“

بینظیر نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا اور گردن نفی میں ہلادی۔

”پھر آپ میرا ایک کام کر سکتی ہیں۔“ ڈاکٹر نے اس لہجے میں کہا، جیسے سارا مسئلہ حل ہو گیا ہو۔

”وہ کیا“ بینظیر نے پوچھا۔

”میں جب بھی آپ کے پاس آؤں آپ مجھے اپنے ہاتھ سے چائے بنا کر پلا دیا کریں۔“ ڈاکٹر نے بچوں کی سی سادگی سے کہا اور بینظیر نے قہقہہ لگا دیا۔

اتنا اونچا بلند اور بے باک قہقہہ جو ”دختر مشرق“ کی محفل میں بیٹھنے والے کسی شخص نے کبھی نہیں

ادھر جب نواز شریف نے ڈاکٹر اشفاق سے پوچھا: "ڈاکٹر صاحب آپ کی کوئی ایسی خواہش جو میں پوری کر سکوں۔" "ہاں ہے۔" بوڑھے نحیف ڈاکٹر نے گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔
نواز شریف چونک گئے۔

"میں چاہتا ہوں آپ اور میں ایک ہی پالے میں پائے کھائیں۔" ڈاکٹر نے نہایت معصومیت سے کہا اور نواز شریف نے بھی ایک بلند بانگ قہقہہ لگا کر حاضرین کو حیران کر دیا۔

شفافہ خیال کے "آئی سی یو" میں جب میں ان سے آخری ملاقات کے لیے گیا تو وہ ٹلکیوں میں لپٹے پڑے تھے میں خاموشی سے ان کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے پوری آنکھیں کھول کر مجھے پہچانا اور پھر کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن آواز اتنی مدہم تھی کہ میں الفاظ سمجھ نہ سکا اور پھر آدھ گھنٹہ بعد جب میں ہسپتال کی لفٹ سے باہر آ رہا تھا تو میں نے سوچا اس بار جب جان قبض کرنے والا فرشتہ آئے گا اور ڈاکٹر اشفاق شوقی سے پوچھیں گے۔ "یار تم نے ابھی تک بتایا نہیں میری اوپر زیادہ ضرورت ہے یا نیچے؟" تو شاید وہ کہے۔

"میں پوچھ آیا ہوں، آپ کی اوپر زیادہ ضرورت ہے۔"

"مے کیوں؟" وہ اپنے مدعا پر سچے میں پوچھیں گے۔
فرشتہ بولے گا "وہ کہہ رہے ہیں ہم ایک زندہ شخص کو مردوں میں اکٹلا نہیں چھوڑ سکتے۔"

دوسرے روز جب مجھے ڈاکٹر اشفاق حسین کے انتقال کی خبر ملی تو میں گھر آ کر سو گیا۔ اس شام یار احباب نے پوچھا "تم جنازے میں کیوں نہیں آئے" تو میں نے کہا "اس لیے کہ میں چاہتا ہوں ڈاکٹر اشفاق مرے نہیں، انہوں نے بس ہجرت کی ہے، اس شہر سے نکل کر دوسرے شہر چلے گئے یہاں مردوں کو ہسپتال کرتے تھے، اب وہاں زندوں کو رالایا کریں گے۔"

ہاں، دوستو! میں مردوں کے جنازے پڑھنے کا عادی ہوں میں کسی زندہ شخص کو کندھا نہیں دے سکتا۔



سردیوں کی شاموں میں گرم دوپہر کی یاد

سردیوں کی شاموں میں میز کے بالکل قریب بیٹھ کر، پاؤں پر جاپانی کپڑے لگا کر اور ہاتھ میں بھاپ اڑاتی چائے کا کپ پکڑ کر، جن کی کسی تپتی دوپہر، جلتے ہوئے سایوں اور سڑکوں پر پھیلی ہوئی تارکول یاد کرتا آسان کام نہیں۔

نیم تاریک کمرے میں ہم چار افراد بیٹھے تھے۔ میرے ساتھ راشد حجازی تھے، سامنے ہمارے میزبان افضل تارڑ تھے اور ساتھ کونے میں ایک معزز باریش شخص بیٹھا تھا۔ ہمارے سامنے المیہ منیم کا درمیانے درجے کا دیگچہ پڑا تھا، جس میں گدلا سا پانی، برف کے ٹکڑے ہوئے ٹکڑے اور بے شمار آم تھے۔ باریش شخص دیکھے میں ہاتھ ڈالنا، آسموں کو نکل کر دیکھنا اور پھر ان میں سے قدرے صحت مند "دانے" کا انتخاب کر کے باہر لاتا، نشوونما سے صاف کرتا اور پھر اسے دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں گوندھنا شروع کر دیتا۔ جب آم کے سرے پر رس کے قطرے چپکنے لگتے تو ذرا سا جھک کر اس پر ہونٹ رکھ دیتا۔ دونوں ہاتھوں میں جکڑے دانے کو معمولی سادہ ہاتھ، بالکل ایسے جیسے بچے خرابے کو دباتے ہیں یا باجے کی ربڑ کی تھیلی دبا کر دیتی ہے اور پھر کمرے میں پوچ پوچ کی آوازیں گونجنے لگتیں لیکن پھر اچانک ہی آوازیں ختم جاتیں اور معزز شخص چہرہ اوپر اٹھا کر مجھے مخاطب کرتا:

"جاوید تم یقین کرو پاکستان کا کرپٹ ترین ادارہ "عدالتیں" ہیں، تم عام سے عام سول جج کا "لیوگ سینڈرز" دیکھو، پاکستان کے بڑے بڑے کاروباری لوگ اس کا تصور نہیں کر سکتے، تم ججوں کے بچوں کے تعلیمی ادارے دیکھو، کوئی ایماندار افسر اتنی فیسیں ادا نہیں کر سکتا، تم عدالتی اہلکاروں کی بیویاں دیکھو، بڑے بڑے امیر لوگوں کی بیویاں اتنے قیمتی زیورات نہیں پہن سکتیں، تم ان لوگوں کے گھر دیکھو، یوں لگے گا جیسے کسی عرب شہزادے کے محل میں آگئے ہیں، یہ رزق کی فراوانی کہاں سے آتی ہے؟ یہ وسیع تر وسائل کس جگہ سے آتے ہیں؟ یہ من و سلوٹی کیونکر اترتا ہے، اس ملک میں کوئی سوچتا ہے؟ کسی نے بھی کبھی تحقیق کی؟ کسی نے اس پر غور و فکر کی زحمت گوارا کی؟ نہیں کی، لیکن ایک بات لکھ لو، لکھو، لکھو تمہارے پاس قلم بھی ہے اور کاغذ بھی۔ جب تک پاکستان کا عدالتی نظام درست نہیں ہوتا، احتساب کا آغاز ججوں سے نہیں ہوتا، یہ ملک نہیں چل سکتا، نظام

دوست نہیں ہو سکتا۔" ساتھ ہی ہارلش معزز شخص نیچے جھکتے اور ہاتھ میں پکڑے چہرے آسمان پر ہونٹ رکھ دیتا۔
 "لیکن آپ بھی تو اسی عدالتی نظام کا حصہ رہے ہیں۔" راشد تجاڑی نے اپنے روایتی انداز سے ہوا میں ہاتھ چلائے۔

"ہوں، ہوں" معزز شخص نے ہونٹ آسمان سے الگ کئے، دائیں ہاتھ سے ٹشو پیپر کے ڈبے سے ایک نرم اور طالع کاغذ کھینچا اسے ہونٹوں پر پھیرا اور پھر مسکرا کر بولا: "میں تھا راشد صاحب لیکن اپنے "ضد ہی پن" کی وجہ سے سیری کیا حالت تھی آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ میں سیشن جج تھا، جی او آؤ لاہور میں مہری سرکاری رہائش تھی، گاڑی تھی نہیں لہذا وکیلین پر دھکے کھاتا ہوا کورٹ آتا اور اسی طرح دھکے کھاتا ہوا واپس جاتا اور اکثر ایسے بھی ہوتا کہ دو دو گھنٹے وکیلین کے انتظار کے بعد میں واپس گھر آ جاتا جبکہ تیز بارشوں میں بھیستے ہوئے کمرہ عدالت تک پہنچنے کے تو کئی واقعات ہیں۔ اسے بھی چھوڑیں، پوری زندگی میں اکٹھے دو جوڑے کپڑے نہیں بنا سکا۔ ایک آدھ جوڑے سے زائد کبھی جوئے نہیں خریدے۔ ڈائننگ ٹیبل پر بھی ساگ پات کے سوا کچھ نہ ملا اور آج میں سینئر ہوں تو یقین کریں میرے پاس اب بھی گورنمنٹ ہاسٹل کے اخراجات پورے کرنے کے لیے پیسے نہیں۔"

"بڑی بات ہے۔" میرے منہ سے بے اختیار ہی میں نکل گیا "نہیں نہیں" معزز شخص نے چہرہ ایا ہوا آسمان کو سیری میں پھینک کر اپنی عیسیٰ نظریں مجھ پر جمائیں اور بولا "نہیں جاوید، اس بات کا قطعاً یہ مطلب نہیں تھا میں خود کو پارسا، ایماندار اور درویش ثابت کرنا چاہتا ہوں، میں تو صرف اتنا بتانا چاہتا ہوں اگر ایک شخص ان تمام دکھوں، اذیتوں اور مسائل کے باوجود زندگی بھر خوش و خرم، مطمئن اور سرورہ رہ سکتا ہے تو دوسرے جج کیوں نہیں رہ سکتے۔ آخر ان لوگوں کو بھی تو سمجھایا جاسکتا ہے رزق حلال کی برکات سے متعارف کرایا جاسکتا ہے۔"

"پر یہ کون کرے گا؟" میں نے آہستہ سے پوچھا: "کوئی ایسا بندہ خدا، جس کے قول و فعل میں تضاد نہ ہو، جس کے عمل اور گفتار میں تضاد نہ ہو، جو اندر اور باہر سے دور نکلتا ہو۔" ہارلش شخص نے پھر آہستہ سے کہا۔
 "اگر کبھی زندگی میں آپ کو ایسا اختیار مل گیا تو" میں نے شونی سے پوچھا، ہارلش معزز شخص نے قہقہہ لگا یا پھر دیکھے میں ہاتھ ڈال کر برف کی ایک پگھلی ہوئی ذلی اٹھائی، اسے ہتھیلی پر بھریا اور پھر اس پر نظریں جما کر بولا "جاوید اگر مجھے زندگی میں کبھی ایسا موقع ملا تو میں پاکستان کا عدالتی نظام درست کر دوں گا، انصاف کے راستے میں کھڑی رکاوٹیں دور کر دوں گا، تجوں کو رزق حلال تک محدود رہنے پر مجبور کر دوں گا، مساکوں کو جگہ جگہ ڈھیل ہونے سے بچاؤں گا، لیکن میرا نہیں خیال مجھے کبھی ایسا کوئی اختیار ملے گا۔"

اور کل صبح جب ٹھیک چھ ماہ بعد میرے بچے نے تازہ اخبار اٹھا کر میرے سامنے پھیلا دیئے تو میں تمام اخبارات کی "لیڈ سٹوری" میں اس ہارلش معزز شخص کی تصویر دیکھ کر حیران رہ گیا۔ جی ہاں ایلو میٹم کے دیکھے میں صحت مند دانوں کی تلاش میں سرگرداں ہاتھ جناب رفیق تارڑ ہی کے تھے اور میں نے سوچا جون 97ء کی وہ وجہی ہوئی دوپہر جب سایوں کے بدن آگ سے مجلس رہے تھے اور سڑکوں کی پگھلی تارکول ٹائروں

سے چپک رہی تھی، تو قبولیت کی ایک گھڑی لوح محفوظ سے نوٹ کر فیڈرل لاجز کے اس نیم تاریک کمرے میں اتری اور ایک نہایت ہی سادہ شخص جس کے ماتھے پر عراب کا نشان اور جس کے پاؤں میں قبینچی چپل تھی، کی زبان پر دعائیں کر رکھ گئی، اسی لمحے جب ہم مولانا ظفر علی خان اور آغا شورش کشمیری کی تحریروں کا تقابل کر رہے تھے، ہم میں سے کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ ہم چار لوگوں میں سے ایک شخص چھ ماہ بعد اس ملک کا صدر ہوگا۔ انوائج پاکستان کا پریم کمانڈر ہوگا۔ ہر قانون، آئین کی ہر ترمیم اس کے دستخطوں سے جاری ہوگی، چیف آف آرمی سٹاف اور چیف جسٹس اس کی مرضی سے مقرر ہوں گے۔

جی ہاں، جناب رفیق تارڑ آپ نے فیڈرل لاجز قحری کے گیٹ کے سامنے کھڑے ہو کر کہا تھا: "جس معاشرے میں انصاف نہیں ہوتا، وہاں کوئی قانون نہیں ہوتا اور جہاں قانون نہیں ہوتا، وہاں انسان نہیں درندے بستے ہیں اور اس ملک کے 13 کروڑ لوگ شہروں نہیں، جنگلوں میں زندگی گزار رہے ہیں، جہاں خونخوار درندے کمزور دانتوں اور چھوٹے تانوں والے جانوروں کو کچا چار رہے ہیں۔" اور آپ نے کہا تھا "قانون پانی کی طرح ہوتا ہے، اگر وہی زہریلا ہو تو فصلیں کیسے صحت مند ہو سکتی ہیں، پھلوں میں توانائی کیسے آسکتی ہے۔" اور آپ نے کہا تھا "سرخ میں حکمران وہی زندہ رہتے ہیں جو قانون بناتے ہیں، جو مظلوموں کے آنسو پونچھتے ہیں، جو ظالم کا راستہ روکتے ہیں" اور آپ نے کہا تھا: "جس ملک کا سیاستدان بددیانت ہو، حکمران لالچی ہو، مولوی منافق ہو، دانشور چور ہو اور جج کرپٹ ہو اس ملک کے قائم رہنے کا کوئی جواز نہیں ہوتا۔" اور آپ نے کہا تھا "قدرت ہمیں اصلاح کا ایک موقع ضرور دے گی۔ ہم سنبھل گئے تو ہماری اولادیں ایک خوشحال پاکستان دیکھیں گی لیکن ہم نے یہ موقع بھی کھو دیا تو۔۔۔؟" اور آپ نے اوپر آسمان کی طرف دیکھ کر کہا تھا "یا آج گرمی بہت ہے، اگر میں مزید کچھ دیر یہاں ٹھہرا رہا تو مجھے سن سڑو کہ ہو جائے گا، اجازت دو جلد ملیں گے۔"

ہاں جناب رفیق تارڑ شاید فیڈرل لاجز قحری کا وہ نیم تاریک کمرہ، وہ ٹھنڈے آم اور لوح محفوظ سے ٹوٹا ہوا دلہن آج بھی آپ کے حافظے کے کسی کونے میں ڈرا سہا بیٹھا ہو، جب آپ نے بڑی حسرت سے کہا تھا "اگر کبھی مجھے اختیار مل گیا تو میں عدالتی نظام درست کر دوں گا اور کوئی ایسا بندہ خدا چاہے جس کے قول و فعل میں تضاد نہ ہو، جس کے عمل اور گفتار میں بعد نہ ہو اور جو اندر اور باہر سے دو رنگ نہ ہو۔۔۔۔۔" لیکن نہیں سردیوں کی شاموں میں، ہیز کے بالکل قریب بیٹھ کر۔ پاؤں پر چائنی کپل گھرا کر اور ہاتھ میں بھاپ اڑاتی چائے کا کپ پلا کر جنوں کی کسی تپتی دو پہر، جلتے سایوں اور سڑکوں کی پٹیلی ہوئی تارکول یا کرنا آسان کام نہیں؟



دی لبرل پریذیڈنٹ

ہاں تو جناب رفیق تارڑ صاحب آپ بھی لبرل نکلے۔

آپ کہ جو اپنی شلوار تختوں سے اوپر رکھتے تھے، جیب میں پاکٹ سائز قرآن مجید رکھتے تھے، جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے تھے، چٹنی کے ساتھ روزہ رکھتے اور نمک کے ساتھ افطار کرتے تھے، روزہ رسول ﷺ کی تصویر دیکھ کر آپ کی آنکھیں نم ہو جاتی تھیں، درود شریف کے بغیر نبی اکرم ﷺ کا نام نہیں لیتے تھے، حج آپ کی بڑی خواہشوں میں سے ایک خواہش تھا، نفاذ نظام مصطفیٰ کے لیے ہر قربانی دینے کا عزم رکھتے تھے۔ صبح صادق کے ساتھ بیدار ہوتے، ایک پارہ روز تلاوت کرتے، احادیث کی کتب اور اسلامی تاریخ آپ کی لائبریری کا حصہ ہوتی اور نجی محفلوں میں بحرِ نبی ﷺ کی جگہ حضور ﷺ نے فرمایا، آپ ﷺ نے ارشاد کیا، کہتے کہتے آپ کی زبان نہیں ٹھکتی تھی۔

آپ کہ جو حقوق نسواں کی حامی خواتین کو دیکھ کر تین بار لاجول پڑتے اور پھر بڑی نفرت سے کہتے یہ ننگی اور گندی آوارہ ہماری ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کو عورتیں بنانا چاہتی ہیں، تجھ خواہ کھولنا چاہتی ہیں، ڈسکو بار اور محلوں کلب قائم کرنا چاہتی ہیں، اگر ان عورتوں کو روکا نہ گیا تو پاکستان، پاکستان ٹیس رہے گا، یورپ بن جائے گا۔ آپ ننگے سر، ننگ لباس اور سرخ پاؤں کے ساتھ باہر نکلنے والی عورتوں کو دیکھ کر منہ پھیر لیتے تھے، انگریزی بولنے والی خاتون کو پٹائی میں جواب دیتے تھے، جنہر سینے والی بیچوں کو حضرت فاطمہ کی زندگی کی مثالیں دے کر ”مسلمان“ بنانے کی کوشش کرتے تھے۔ جہیز کو اجنت شادی بیاہ پر بے جا اصراف کو خلاف اسلام سمجھتے تھے۔ بہشتی زیور کو خواتین کے سلیبس کا حصہ بنانا چاہتے تھے اور مشرق کی سادہ با حیا سہمی اور ان پڑھ عورت آپ کی آئینہ دل تھی۔

آپ کہ جو قادیانیوں کو سب سے بڑا فتنہ سمجھتے تھے، یورپ میں ان کے وسیع نیٹ ورک پر کڑھتے تھے، تحریک ختم نبوت میں چندہ دیتے تھے، قادیانیوں کے خلاف چھپنے والی کتابیں اپنی جیب سے خرید کر تقسیم کرتے تھے، ختم نبوت ﷺ پر ہونے والے ہر جلسے میں شریک ہوتے تھے، سکول کے بچوں کو ”فتنہ قادیانیت“ پر تقریریں لکھ کر دیتے تھے، شورش کاٹھیری کو قادیانی دشمنی میں پاکستان کا سب سے بڑا میڈر سمجھتے تھے، سید عطاء

اللہ شاہ بخاری کو دنیا کا سب سے بڑا مقرر قرار دیتے تھے، قادیانیوں کے خلاف چلنے والی تحریکوں میں ڈنڈے کھاتے تھے، قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے والے دن کو قومی تہوار کی طرح منانا چاہتے تھے، قادیانیوں کے قائم کردہ مقدسوں میں ماخوذ "بحرموں" کا مفت کیس لڑتے تھے اور آپ لندن جا کر مرزا طاہر کو مناظرے کی دعوت دینے کا ارادہ رکھتے تھے۔

آپ کہ جو تو بہن رسالت ﷺ ایک کے سب سے بڑے حامی تھے، تو بہن رسالت ﷺ کے بحرموں کی کھالیں کھینچ لینے کے قائل تھے، غازی علم دین شہید جیسی موت کے خواہاں تھے، کسی شخص کے منہ سے ﷺ کے بغیر نبی اکرم ﷺ کا نام سن کر کھول اٹھتے تھے، آپ کی آواز بھرا جاتی تھی، ماتھے پر پینٹ آ جاتا تھا اور ہاتھ کا پٹنہ لگتے تھے۔ آپ جہاد کو بیت المقدس کے حصول کا واحد ذریعہ قرار دیتے تھے۔ پاکستان میں آباد عیسائیوں، ہندوؤں اور سکھوں پر کڑی نظر رکھنے کی ہدایت کرتے تھے، خلفائے راشدین کو تنقید سے مبرا سمجھتے تھے اور آپ نبی اکرم ﷺ سے عشق کو حلف کا حصہ بنانا چاہتے تھے۔

آپ کہ جو سادگی، شرافت اور ایمانداری کے پیکر تھے، شکل و صورت، قول و فعل، نشست و برخاست، چال و ڈھال اور خیالات و احساسات سے "چمپے خلیفہ راشد" دکھائی دیتے تھے۔ آپ کہ جو رشوت نہیں لیتے تھے، زمین پر سوتے تھے، سادہ خوراک کھاتے تھے، بھل چلے تھے، بھنگاں بولتے تھے، فنجی چہل پہنہ تھے، کندھے پر "پرنا" رکھتے تھے، شلوار کرتا پہنتے تھے، سر نکال نہیں ہونے دیتے تھے۔ آپ کہ، جو مینے کی پہلی تار بخوں کو رکھے اور آخری تار بخوں کو پیدل کوڑ جاتے تھے، ددوخت کھانا کھاتے تھے، اپنی جیب سے چائے پیتے تھے، حقے کو رشوت سمجھتے تھے، تعریف کو خوشامد اور تنقید کو حرارت کہتے تھے، مخلوط تعلیم کو ہدف تنقید بناتے تھے، بازاروں میں کھانے پینے کو شیطان فیصل گردانتے تھے، بسنت کو خلاف قانون کہتے تھے، موسیقی پر پابندی لگانا چاہتے تھے اور ڈاڑھی کو قانون بنانا چاہتے تھے۔

ہاں، آپ کہ جو پوری زندگی ایک ایسے حکمران کا راستہ دیکھتے رہے جو اسلام کے بنیادی موقف پر ڈٹ جائے، جو معاشرے کو سدھارنے کے لیے خون کا آخری قطرہ تک بہا دے، جو گھوڑے پر سوار ہو کر شیر کے ایک دروازے سے داخل ہو اور مارتا دھاز تا دوسرے دروازے سے باہر نکل جائے، جو پردے کو قانون بنا دے، قہانے کے ذریعے نمازیں قائم کرائے، کوڑے سے زکوٰۃ وصول کرے، نکواری سے شریعت نافذ کرے اور تھپڑ سے قرآن مجید پڑھائے، جو معاشرے سے عدم مساوات کھرچ کر الگ کر دے، جو دولت مساوی تقسیم کرے، غربت، بے روزگاری اور بیماری کے خلاف جہاد کرے، جو جیس بدل کر شہر شہر پھرے، جو تانکے والے سے لے کر کار والے تک اور پریون فروش سے صنعت کار تک سب کے مسئلے مسائل سمجھتا ہو۔

ہاں، ہاں آپ ایک سچے، کھرے اور پابند مسلمان تھے، آپ کو اپنی بنیاد پرستی پر فخر تھا، اپنی تاریخ، اپنے ارتقاء اور اپنے فلسفے پر ناز تھا، آپ مسلمان ہونے کی بناء پر اللہ کی زمین پر پورے قد کے ساتھ چلنا چاہتے

تھے، لیکن افسوس آپ بھی لبرل نکل آئے۔

ہاں، جناب رفیق تارڑ صاحب یہی الیہ ہے، اس ملک کا کہ ہم لوگ صرف اس وقت تک مسلمان رہتے ہیں، جب تک صدر نہیں بنتے، اس وقت تک پاکستانی رہتے ہیں، تک پارلیمنٹ ہاؤس کے تختہ پھٹنے، گرم بالوں میں گھومنے والی گداز کرسیوں پر نہیں بیٹھتے، ہمارے کان اور ہماری آنکھیں صرف اس وقت تک کام کرتی ہیں جب تک ہم ہونر کی آواز نہیں سنتے، جب تک ہم سٹیوٹ وصول نہیں کرتے۔

افسوس، ایک شخص گھر سے نکلا تو سچا عاشق رسول ﷺ تھا، منزل پر پہنچا تو لبرل ہو گیا، صد افسوس ایک دیہاتی سیلا دیکھنے نکلا تو سچا، شہر پہنچا تو اپنی ساوگی، اپنی سچائی اور اپنے گھر سے پن پر شرمندہ ہو گیا۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

ایک سوئس صدی کا ولی

جب میں پروفیسر احمد رفیق سے پہلی بار ملا تو دل اسے بزرگ ماننے پر تیار نہ ہوا۔ اس کی کئی ایک وجوہات تھیں، مثلاً اس کا کلین شیو ہونا، مسلسل سگریٹ پینے جانا، ان موضوعات پر بلا ٹکان گفتگو کرنا، جن کے ذکر پر ہی کمزور دل حضرات کے کان سرخ ہو جاتے ہیں اور اپنی بے عزتی پر قبضہ لگا کر مخاطب کو داد دینا وغیرہ وغیرہ لیکن جب میں ماپوس ہو کر اٹھنے لگا تو اس نے ایک عجیب حرکت کی۔ مجھ سے کہنے لگا۔ "اپنا نام تو بتاتے جاؤ" میں نے فوراً بتا دیا (یہی میری غلطی تھی) تو فحش کر بولا: "تمہارے اندر" "الہنگوا کئی" بھری ہے، فحشہ اور فطرت اٹل رہی ہے، اگر یہ باہر نہ نکلی تو تم پھٹ جاؤ گے، بالکل اس طرح جیسے غبارہ دھماکے سے پھٹتا ہے۔" میں نے کہا: "تمہیں کیا فرض؟" تو بولا "مجھے تم سے بڑی فرض ہے، دوا اینفو میں تمہیں بتاتا ہوں۔" اور میری صحت دیکھنے میں مشغول ہی مشغول میں اس کے قریب بیٹھ گیا اور اس کے بعد پتہ نہیں اس نے مجھ پر کیا چھوڑا کہ آج آٹھ برس ہو چکے ہیں میں اسی کے پاس بیٹھا ہوں، کہیں بھی بھاگ جاؤں، کہیں بھی چھپ جاؤں کہیں بھی غائب ہو جاؤں، خود کو اسی کے قریب پاتا ہوں۔ اسی صوفے، اسی کمرے اور اسی نیم تار یک ماحول میں رہتا ہوں اور اب تو یقین ہو چکا ہے کہ شاید پچاس برس بعد بھی جب کوئی مجھ سے پوچھے گا تمہاری زندگی کا حیرت انگیز واقعہ کیا ہے؟

تو میں بلا سوچے سمجھے کہہ دوں گا۔ "پروفیسر احمد رفیق۔"

اور اگر کوئی پوچھے گا۔

"تمہاری زندگی کی سب سے بڑی کامیابی کیا ہے؟"

تو میں بلا کم و کاست کہہ دوں گا۔ "پروفیسر احمد رفیق۔"

اور اگر کوئی پوچھے گا۔

"تمہاری زندگی کی سب سے بڑی محرومی کیا ہے؟"

تو مجھ میں بلا خوف تردید کہہ دوں گا "وہ وقت جو میں نے پروفیسر احمد رفیق سے دور رہ کر گزارا۔"

اور اگر پوچھنے والا پوچھے گا۔

”کیوں؟“

تو میں فوراً کہوں گا ”اگر مجھے پروفیسر احمد رفیق نہ ملتا تو شاید میں باقی زندگی بھی جھوٹے خداؤں کی پرستش میں گزار دیتا۔ اگر مجھے پروفیسر احمد رفیق نہ ملتا تو شاید میں باقی زندگی بھی اندھیرے میں بھٹکتے بھٹکتے گزار دیتا، اگر مجھے پروفیسر احمد رفیق نہ ملتا تو میں شاید باقی زندگی بھی کسی صاحب کشف، صاحب دعا اور صاحب نظر بزرگ سے ملاقات کی خواہش لیے ہی گزار دیتا۔ اگر مجھے پروفیسر احمد رفیق نہ ملتا تو شاید میں باقی زندگی بھی بائبل عالم کی تلاش میں گزار دیتا۔“

لیکن ایسا نہیں ہوا کہ اگر موج، موج ہے تو کناروں سے ضرور ٹکراتی ہے۔ اگر ہوا، ہوا ہے تو قطرہ خون میں ضرور اترتی ہے اور اگر روشنی، روشنی ہے تو وہ اندھیروں کا سبز ضرور چیرتی ہے۔

میں نے پروفیسر احمد رفیق سے پوچھا۔ ”پروفیسر صاحب آپ ایک نظر میں لوگوں کو کیسے جان لیتے ہیں؟“ پروفیسر نے قہقہہ لگایا اور بولا ”جب اللہ سے دوستی کا رشتہ استوار ہو جاتا ہے تو وہ اپنے دوستوں کو بہت سی کھیاں دے دیتا ہے۔ ان کنجیوں میں ایک کنجی دلوں کے قفل کھولنے کی بھی ہوتی ہے۔“

”یہ کیا کنجی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

یہ علم اسما ہے۔ قرآنی اسما جو قدرت کی ہارڈ ڈسکس ہیں، یہ ہارڈ ڈسکس چودہ (حروف مقطعات) ہیں، ہر ڈسک میں مختلف لوگوں کے ذہنی اور روحانی حالات درج ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے ان حروف کے علم سے نوازا ہے لہذا جو کئی کوئی نام میرے کانوں سے ٹکراتا ہے، اس کی پوری شخصیت میرے دماغ میں اتر آتی ہے۔“

میں نے پروفیسر سے پوچھا: ”پروفیسر صاحب آپ کو خدا کیسے ملا؟“

اس نے اسی اطمینان سے جواب دیا: ”صرف خلوص سے، جب میں نے خدا کو پہچان لیا تو میں نے دیکھا کسی بزرگ نے اسے پانے کے لیے چالیس برس جنگوں میں جگے پاؤں گزار دیئے، کوئی کنوئیں میں الٹا لٹکا کر وحیفہ کرتا رہا، کوئی دریا میں ایک ٹانگ پر کھڑا ہو کر اسے یاد کرتا رہا..... تو میں نے اپنے رب سے دعا کی یا اللہ اگر صرف جسمانی طور پر مضبوط لوگ ہی تمہیں یاد کر سکتے ہیں تو شاید میں پوری عمر تمہیں نہ پاسکوں لیکن اگر کمزوروں کا بھی تم پر اتنا ہی حق ہے تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں میں زندگی میں کبھی تم سے رُخ نہیں بدلوں گا، تم سے اپنی ”کنٹنٹ“ بھگاؤں گا“ تو مجھے خدا مل گیا۔

میں نے پروفیسر سے پوچھا: ”پروفیسر صاحب آج کل خدا کی کیا پوزیشن ہے؟“

پروفیسر نے قہقہہ لگایا اور بولا ”آج کل خدا کی پوزیشن کو بڑا خطرہ ہے، ادھر دنیا میں اطلاعات اور علوم کا ایٹم بم پھٹ چکا ہے، وہ ہنوں میں نئے سوال پیدا ہو چکے ہیں لیکن ادھر ہمارے مولوی ابھی تک اونٹ پر سواری کے دور سے گزر رہے ہیں چنانچہ ہم دیکھتے ہیں سوال دنیا کے بہترین اداروں کے پڑھے لکھے اہل ترین دماغ کرتے ہیں لیکن جواب وہ ان پڑھ اور گنوار مولوی دیتا ہے، جسے ابھی تک چاند کی تسخیر کا دعویٰ ہضم نہیں

ہوا۔ لہذا انہیں ہماری سمجھ آتی ہے اور نہ ہم ان کی سمجھ سکتے ہیں۔ اس "کیونیکیشن گیپ" میں اللہ تعالیٰ کا تصور تیزی سے "ڈی فیلپ" ہو رہا ہے، نعوذ باللہ اہل یورپ کی نظر میں اس کی ایک متعصب، تنگ نظر اور وحشی قوم کے "لینڈ" جیسی شکل بن رہی ہے۔ چنانچہ جب تک پڑھے لکھے اور جدید علوم و فنون سے آراستہ لوگ اللہ تعالیٰ کے "ایڈوائزر" بن کر سامنے نہیں آئیں گے، خدا کا تصور وسیع نہیں ہوگا۔

پروفیسر کی کہانی بڑی عجیب ہے۔ ایم اے انگریزی کیا، لاہور کے ایک کالج میں پروفیسری کی، شاعری کی، ایڈورٹائزنگ ایجنسی میں کام کیا، لیکن اس دوران جب اللہ تعالیٰ سے ڈائریکٹ ڈانٹک شروع ہوئی تو گوجر خان آ بیٹھا، جہاں اب دن رات ذہنوں کی پیاس بجھاتا ہے، مگر ایہوں کو راہ دکھاتا ہے، پریشان حال لوگوں کے دکھ سنتا ہے اور آخر میں ہر آنے والے کو کاغذ کی ایک چٹ پر چند اسماء الہی لکھ دیتا ہے، اب پتا نہیں ان اسماء الہی میں کیا "جادو" ہے۔ جو انہیں پڑھتا ہے وہ خدا کا ہو جاتا ہے اور خدا اس کا ہو جاتا ہے اور جب خدا اور بندہ باہم مل کر ایک ہو جائیں تو دنیا کا کوئی مسئلہ، مسئلہ رہ جاتا ہے؟

اگر پروفیسر کی ذات سے "روحانی بلوغت" نکال بھی دی جائے تو بھی اللہ تعالیٰ نے اسے دلوں پر اثر کرنے والی شخصیت، جاذب طرزِ تکلم اور بے پایاں علم سے نوازا ہے۔ جس کے بعد اللہ تعالیٰ کی ذات پر یقین کے لیے کسی دوسرے معجزے کی ضرورت نہیں رہتی۔

Kashif Azad @ G... میں نے پروفیسر سے پوچھا: "پروفیسر صاحب آپ نے اتنا علم کہاں سے حاصل کیا؟"

وہ گہرے اطمینان سے بولا: "خدا سے کہ سارے علوم کے دھارے اسی کی ذات سے نکلتے ہیں۔ جو اس کا ہو گیا وہ گویا علم کے سمندر میں ڈوب گیا۔"

اور میں نے اپنے آپ سے پوچھا کیا آج کا کوئی انسان پروفیسر کے بغیر خدا کے جدید تصور کو چھو سکتا ہے تو جواب ملا نہیں کہ اکیسویں صدی کے لوگوں کو صرف پروفیسر احمد رفیق سے ہی روشنی مل سکتی ہے کیونکہ صرف یہی شخص ہے، جو نہ صرف اکیسویں صدی کے دماغ کو سمجھتا ہے بلکہ یہ بھی جانتا ہے کہ خدا کی بات کو کس لیے اور کس فریکوئنسی میں کہا جائے تو وہ دلوں کے قفل تو ذکرِ ذات میں رنج جاتی ہے، بس جاتی ہے۔



ٹھنڈے سائے والا

مجھ سے اگر کوئی پوچھے تم نے کبھی وہ خضر حیات دیکھا ہے، جو بھٹکے ہوؤں کو راستہ دکھاتا ہے، مایوسوں کو امید دلاتا ہے اور ہمارے ہوؤں کو زندگی دیتا ہے تو میں فوراً کہوں گا "ہاں" وہ سیانے قد کا گورا چٹا شخص ہے، اس کی ناک چمکی اور ہونٹ پتے ہیں، اس کی آواز باریک اور چمید کر دینے والی ہے، اس کی آنکھوں میں دلوں تک پہنچنے والی روشنی ہے، اس کے صماٹے میں قرون اولیٰ کے مجاہدوں کی گرمی اور سحائے میں پرانی، سینکڑوں برس پرانی خانقاہوں کی ٹھنڈک ہے، تو پوچھنے والا کہے گا..... یہ تو اپنے نسیم انور بیگ ہیں، تو میں کہوں گا ہاں آج کے خضر حیات انگل نسیم انور بیگ ہی ہیں۔

شام ہوئے ہی اسلام آباد کے تمام "بڑے دماغ" دفتروں سے نکلتے ہیں، اپنے اپنے موبائل بند کرتے ہیں، پروٹوکول سکواڈ کو چھٹی دیتے ہیں، ٹائی ڈھیل کرتے ہیں، کوٹ اتار کر بھیلی سیٹوں پر اچھاتے ہیں اپنی ذات سے آپ جناب سرکار کی تختیاں اکھاڑ کر پرے بھینکتے ہیں اور اپنی اپنی گاڑیاں خود ڈرائیو کرتے ہوئے "آستانے" پر آ جاتے ہیں، جہاں انکس سینڈ وچر ملتے ہیں، سمو سے ملتے ہیں، جلیبیاں اور کیک ملتے ہیں، الٹی ہوئی گرم چائے ملتی ہے اور اس حد سے اس حد تک بھیلی محبت ملتی ہے، پھر وہ ڈائننگ ٹیبل، "ہاؤس آف کامنز" بن جاتی ہے، سب کھل کر باتیں کرتے ہیں، پنجابی، سندھی اور پشتو بولتے ہیں، اپنی ریا کاریوں، اپنی سیاسی، سفارتی اور سرکاری مجبوریوں کا ذکر کرتے ہیں، کیا ہو رہا ہے، کیا ہوتا چاہیے اور کیا نہیں ہوتا چاہیے پر بلا خوف و تردید بولتے جاتے ہیں بولتے جاتے ہیں، اس دوران انگل کے چہرے پر ایک شفیق سی مسکراہٹ ہوتی ہے، وہ سب کو دیکھ کر اس طرح خوش ہوتے ہیں، جس طرح ماں اپنے شریں بچوں کو دیکھ دیکھ کر زیر لب مسکراتی ہے۔ اس لمحے اگر کسی کا ہاتھ رک جائے یا کسی کی پلیٹ خالی ہو جائے تو وہ فوراً نرے اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دیتے ہیں اور پھر اصرار اور انکار کا ایک سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ ہدف لاکھ انکار کرے، بس جی انگل بس، نسیم بھائی پیٹ بھر چکا ہے، بیگ صاحب میرا کوٹ پورا ہو چکا ہے لیکن انگل اپنی منوائے بغیر نہیں ملتے، لہذا مجبوراً چلیں پھر آباد ہو جاتی ہیں، چٹک اور کانٹے دوبارہ بولنے لگتے ہیں، چائے کی گرمی ایک بار پھر رکیں نرم کرنے لگتی ہے، ٹھنڈا کر دیا یا ایک بار پھر رواں ہو جاتا ہے۔

انگل نسیم کی ساری عادتیں عجیب ہیں۔ وہ جب کسی سے اختلاف کرتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے اس سے اتفاق کر رہے ہیں، جب کوئی اچھی بات کرتے ہیں تو فوراً "یہ تمہاری انپازیشن ہے، یہ تم نے مجھے دیا" کہہ کر اسے دوسرے کے کھاتے میں ڈال دیتے ہیں۔ اپنے کسی کارنامے کا ذکر کرتے ہیں تو اسے "کرم خاک پائے رسول ﷺ" کے خلاف میں اس طرح لپیٹ دیتے ہیں کہ سننے والا فوراً روضہ رسول ﷺ کا تصور کر کے سرود آہیں بھرنے لگتا ہے۔ جب کسی کو مشورہ دینے لگتے ہیں تو اپنی آواز اتنی نیچی، مدھم اور مضمحل بنا لیتے ہیں کہ محسوس ہوتا ہے مشورہ نہیں دے رہے، چندے کی درخواست کر رہے ہیں۔ ہر شخص سے اتنے والہانہ انداز سے ملتے ہیں کہ وہ سوچنے لگتا ہے "باباجی" کسی دوسرے کی غلط فہمی میں مجھ سے بغل گیر ہیں، کسی کو مخاطب کرتے ہوئے اس محبت اور گرم جوشی سے پکارتے ہیں کہ وہ سمجھتا ہے بزرگ مجھ سے نہیں کسی دوسرے سے مخاطب ہیں۔

انگل نسیم کی ساری زندگی فارن سروس میں گزری، تیس برس تک یونیسکو میں افسر رہے، کم وبیش اتنے ہی برس بیرون میں گزارے لیکن یہ سب "دھکم" مل کر ان کا ایک بال بھی بیکانہ کر سکے، لہذا دیکھنے والے دیکھتے ہیں انگل کی ساری زندگی میں سفارتی منافقت کا شائبہ تک نہیں، دور دور تک افسرانہ "شہ شہا" نہیں، گوروں کی احتیاط اور نخوت نہیں، بس ایک دیسی سا "بابا" ہے، جو روزگاہوں سے باہر گیری کے نیچے لسی کا پیالہ اور تندور کی سوکھی روٹی بے کرا پیچھا جاتا ہے۔ کوئی آجائے تو جیسے اس کے سارے بھگت جاگ اٹھے اور اگر کوئی مہمان نہ آئے تو وہ اسے اپنے رب کی طرف سے اظہارِ ناراضی سمجھ کر ساری رات مصلے پر گر یہ زاری کرتے گزار دیتا ہے۔ یہاں تک کہ صبح اس کی پیشانی پر دستک دیتی ہے اور وہ اٹھ کر دوبارہ گیری کے نیچے آ بیٹھتا ہے۔

میں پچھلے دو تین برسوں میں جب بھی ان سے ملائے جانے کیوں نبی رسالت ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دو واقعات فوراً آنکھوں میں اتر آئے:

صحابیؓ نے فرمایا جب بھی ہم رسول اللہ ﷺ کی محفل میں بیٹھتے ہیں، ہم میں سے ہر شخص کو محسوس ہوتا جیسے رسول اللہ ﷺ کی تمام تر توجہ مجھ ہی پر مرکوز ہے، وہ اس ہجوم میں صرف اور صرف مجھے ہی چاہتے ہیں۔ دوسرے صحابیؓ نے فرمایا جب جنگ کی شدت بڑھ جاتی، کھوار چلاتے چلاتے ہمارے بازو ٹل ہو جاتے، دھوپ سویوں کی طرح چھینے لگتی اور موت کا خوف ہماری روحوں کو چھو کر گزرنے لگتا تو ہم فوراً نبی اکرم ﷺ کے سایہ اقدس میں پناہ لیتے، ان کے پاس کھڑے ہو جاتے وہ ہمیں مسکرا کر دیکھتے اور پھر سارے خوف ختم ہو جاتے۔ ساری تھکن دور ہو جاتی، سارے حوصلے پلٹ کر واپس آ جاتے، ہم نعرہ بھگیر بلند کرتے اور دوبارہ رزم گاہ میں کود پڑتے۔"

اور میں نے دیکھا اور میں نے سنا انگل کی محفل میں آنے والا ہر شخص یہی دعویٰ کر رہا تھا، وہ صرف مجھے چاہتے ہیں، وہ صرف مجھ سے محبت کرتے ہیں، وہ صرف مجھ پر توجہ دیتے ہیں۔ اور کہنے والوں نے تو یہ بھی کہا، جب ہم روزگار کی کھوار چلا چلا کر تھک جاتے ہیں، اختیار کا اچھا معائنہ کر، دیکھو، وہ صرف مجھے چاہتے ہیں۔

مکرو فریب کے صحرائیں چل چل کر جاں بلب ہو جاتے ہیں تو ہم آکر انگل کے سائے میں پناہ لیتے ہیں۔
کہ رسول ﷺ کے سچے عاشقوں کے سائے بھی بڑے ٹھنڈے ہوتے ہیں۔

اور مجھ سے اگر کوئی پوچھے، تم نے کبھی خضر دیکھا ہے تو میں فوراً کہوں گا، ہاں میں نے قد کا یہ گورا چنا
فحش اگر خضر نہیں ہے تو خضر جیسا ضرور ہے کہ اس کی مجلس میں بیٹھنے والا کوئی شخص گمراہ نہیں ہو سکتا، حالات کے
سمندر میں ڈوب نہیں سکتا برائی کے صحرائیں بھٹک نہیں سکتا۔

اور مجھے یہ بھی یقین ہے روز قیامت جب ہم انگل نسیم کے ساتھ اُٹھائے جائیں گے تو نبی
رسالت ﷺ صرف اس بات پر ہماری شفاعت فرمائیں گے کہ ہم سب انگل نسیم کے بیٹے ہیں، ان کے چاہنے
والے ہیں۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

باغی

چکوال سے ذرا دور، مگر کہار سے ذرا باہر اور مینارہ سے ذرا پیچھے لوہے کا ایک پھاٹک بگی بگی اینٹوں کی چند کونھریاں، کھانے کا ایک طویل ہال اور ایک سادہ سا ملاقاتی کمرہ ہے، اس پھاٹک، ان کونھریوں، اس ہال اور اس ملاقاتی کمرے میں چند بارش مسلح نو جوان ٹہل رہے ہیں، ان نو جوان مجاہدین کے سینے کشادہ، ہاتھ چوڑے اور پیشانیاں فراخ ہیں، ان کی آواز میں نرمی، آنکھوں میں صلیبی اور بشرے پر یقین کی سرخی ہے، یہ مولانا اکرم اعوان کے ان بزاروں "باغیوں" میں سے چند ہیں جو وفاتی اور صوبائی دارالحکومتوں سے سینکڑوں میل دور کھڑے ہو کر انقلاب کی چاپ سن رہے ہیں، یہ لوگ بیک وقت فریڈ فوجی، بہترین ایڈمنسٹریٹر، شاندار معلم اور کارکنات کی دستوں میں اترنے اور انسانی باطن میں جھانکنے والے مکمل صوفی ہیں، آپ ان سے ہاتھ ملائیں آپ کو ان میں مجاہد کی گرمی اور فوجی کی سختی ملے گی، آپ ان کی آنکھوں میں جھانک کر دیکھیں آپ کو وہاں میزبان کی صلیبی اور شاعری کی نرمی ملے گی، آپ ان کی باتیں سنیں آپ کو ان میں صوفی کے لہجے کی مناس اور مفتی کے گلے کی نزاکت ملے گی۔

میں نے ان کے "کمانڈر" مولانا اکرم اعوان سے پوچھا، ساڑھے چھ فٹ اونچے، سرخ سپید رنگت اور چیتے جیسی آنکھوں والے اکرم اعوان سے پوچھا ان حضرت جی سے جن کی ذات میں ایک شوکت، مخاطب کو مبہوت کر دینے والا دیدہ اور گردنیں جھکا دینے والا رعب ہے اور جو جب بولتے ہیں تو منہ سے لفظ نہیں رہنم کے نازک تار نکلتے ہیں، میں نے پوچھا "یہ کون لوگ ہیں؟" اطمینان سے لبریز لہجے میں بولے۔ "یہ کل کے حکمران ہیں، ان میں کچھ گورنر ہیں، کچھ چیئرمین، کچھ سیکرٹری اور کچھ کمانڈر" میں نے حیران ہو کر پوچھا "کون سا کل؟" اسی سکون سے بولے "وہ کل جب پاکستان دنیا کی واحد اسلامی سپر پاور ہوگا۔" میں نے انہیں حریف کریدنے کی کوشش کی "موجودہ نظام کا کیا بنے گا؟" بلند قامت صوفی نے اتنا ہی بلند و بالا قہقہہ لگایا "یہ سوال مجھ سے گورنر صاحب نے بھی پوچھا تھا، میں نے انہیں جواب دیا تھا، جناب یہ نظام اب گیا تو آپ لوگوں کو ساتھ لے کر جائے گا، گورنر نے کہا، مولانا بات سیدھی اور واضح کریں، میں نے عرض کیا جناب منافقت اور ظلم پر ایسا وہ نظام جب جاتے ہیں تو بیرونی کارروائی کو بھی ساتھ لے کر جاتے ہیں، کہنے لگے نہیں، اب بھی نہیں سمجھا تو میں نے عرض کیا، گورنر صاحب آپ کی حکومت، آپ کا احتساب بیورو، آپ کی عدالتیں اور آپ کی پولیس جس آصف علی زرداری کو کرپٹ، چور اور ڈاکو قرار دے رہی ہے وہی آصف علی زرداری نہ صرف ملک کے معزز

ترین ایوان کا رکن ہے بلکہ ملک کی تقدیر کے فیصلوں کے لیے بلائے جانے والے ہر اجلاس میں اپنا ووٹ بھی ڈالتا ہے، یہ منافقت نہیں تو کیا ہے، یہ ظلم نہیں تو کیا ہے کہ ایک نظام ایک شخص کو چور بنا کر کٹہرے میں بھی کھڑا کر رہا ہے اور اسی وقت اسے کٹہرے کے حقوق بھی دے رہا ہے۔

میں نے پوچھا ”کیا اس نظام کے خاتمے کی واحد وجہ یہی ہوگی۔“ ان کے لہجے میں صوفیانہ مخاس بڑھ گئی۔ ”نہیں بچے گا یہ نظام صلاحیت کا قائل ہے، انسانی صلاحیتوں کی بربادی کا مجرم ہے، ہمارے علاقے میں ایک ڈاکو تھا، محمد خان ڈاکو، یہ شخص تین تباہیوں کا خان جیسے مضبوط حکمران سے لڑتا رہا، پورے ملک کی پولیس، ساری انتظامیہ اس کا حوصلہ نہ توڑ سکی، جب گرفتار ہوا تو اسے 62 بار پھانسی کی سزا سنائی گئی یہ 26 برس تک قید میں رہا لیکن یہ قید، کال کوٹھڑی اور عداوتیں اس کے احصاب نہ توڑ سکیں وہ ترو تازہ رہا اس نے 72 برس کی طویل عمر پائی، ذرا سوچو یہ شخص اگر فوج میں ہوتا تو کیا اس جیسا کوئی دوسرا کمانڈر ہوتا، وہ کسی نیپولین، نیپو، ہٹلر یا ڈیگال سے کم ہوتا لیکن افسوس اس نظام نے اسے جرنیل کی بجائے ڈاکو بنا دیا، یہ نظام صلاحیت کا قائل ہے یہ محض کوثر ابن خطابؓ بناتا ہے اسے امیر المومنین حضرت عمر فاروقؓ نہیں بناتا، ہم نے اپنے اس ادارے میں ایسے لوگ ہی جمع کر رکھے ہیں جنہیں یہ نظام ”عام شخص“ کہتا تھا ہم نے ثابت کیا یہ عام لوگ نہیں ہیں یہ سب محمد خان ہیں، ہم نے انہیں ٹریننگ دی، اب یہ لوگ دیل ٹرینڈ سولجر ہیں، بیدار مغز جرنیل ہیں، کامیاب منصوبے ساز، اعلیٰ پائے کے معلم اور بہترین منتظم ہیں، شریعت کو سمجھتے ہیں، تصوف کے راہی ہیں، معاشرتی بقاؤ کی اصلاح کے خواہش مند ہیں۔“

”تہدیلی کب آئے گی؟“ میرا سوال سن کر مجاہد صوفی مسکرایا، اس کی آنکھوں میں ستاروں کی چمک مٹھائی اور لہجے میں برساتوں کی مہک پھڑپھڑائی۔ ”انشاء اللہ ایک آدھ برس میں کیونکہ فصلیں پک چکی ہیں، سکائی کا موسم آچکا ہے اب بس ایک اعلان کی دیر ہے اور جوشِ عمل سے لہریز دہقان درختیاں لے کر کھیتوں میں اتر جائیں گے۔“ کیا عام شہری آپ کا ساتھ دیں گے؟“ وہ مسکرائے ”ہاں سو فیصد کیونکہ تہدیلی کی خواہش چند لوگوں کی بات نہیں ہر زبان کی دعا اور ہر نظر کی تمنا ہے۔“

باہر، اس سادہ سے ملاقاتی کمرے سے باہر لوہے کا ایک پھاٹک، کچی کچی اینٹوں کی چند کوٹھڑیاں اور کھانے کا ایک طویل ہال تھا جہاں چند باریش لوجوان ٹہل رہے تھے، جن کے سینے فراخ، ہاتھ چوڑے اور پیشانیوں فراخ تھیں جن کی آواز میں نرمی، آنکھوں میں حلیمی اور بشرے پر یقین کی سرخی تھی جن کے قدموں کی برآہٹ اور جن کے بدن کی ہر حرکت پکار پکار کر کہہ رہی تھی ہم سب محمد خان تھے لیکن خدا کے اس بندے نے ہمیں؟ اکو بجنے سے بچا لیا اب ہم میں سے کوئی نیپولین، نیپو، ہٹلر اور ڈیگال سے کم نہیں کیونکہ ہم جمال اور جلال، علم اور حکم کا حسین امتزاج ہیں، ہم صوفی بھی ہیں اور مجاہد بھی، ہم سپاہی بھی ہیں اور عالم بھی اور جب یہ سارے عناصر ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں تو پھر ایسے باقی جسم لیتے ہیں انقلاب جن کی منزل کا پہلا سنگ میل اور تہدیلی جن کی کتاب کا پہلا ورق ہوتی ہے۔

مقناطیس کا پہاڑ

بچ پوچھیں تو پہلی ملاقات پر ایک میٹھی مسکراہٹ، ایک نیم گرم مصافحے اور بھاپ اڑاتے خوشبودار قہوے کے ایک پیالے کے سوا میرے ہاتھ کچھ نہ آیا لیکن اس کے باوجود میں نے باہر کھلی ہوا میں آکر اعلان کر دیا "بندہ دلچسپ ہے اس کے ساتھ خوب وقت گزرے گا۔"

یاد نہیں بری امام کے اس درویش کے پاس جسے زیادہ تر لوگ راجہ صاحب اور خال خال راجہ اکرم کہتے ہیں مجھے پہلی بار کون لے کر گیا، انکل جیم انور بیک، شاید قاضی ہمایوں یا پھر بھائی ڈاکٹر رفیق لیکن اتنا ضرور یاد ہے پہلی ملاقات تھی بڑی ہوش ربا، میں ڈرا ڈرا، سہا سہا سا اندر داخل ہوا لیکن ایک فاتح کی طرح سینہ پھلا کر اٹھا، میرے خوف کی ایک جگہ تھی وہیں دراصل وہاں ۲۰ ویں صدی کی آخری ساتھیوں کے ایک ایسے روشن ضمیر درویش سے ملنے گیا تھا جس کے بارے میں میرا گمان تھا وہ مقناطیس کا ایک ایسا پہاڑ ہے جو اپنے پاؤں سے اکھڑنے والے لوہے کے ہر ذرے کو اپنے جسم کا حصہ بنا لیتا ہے بس اس ذرے میں چھوٹی حقیقت سے بڑی حقیقت کی طرف جانے کا جذبہ ہونا چاہیے، رہا میرا سینہ پھلا کر باہر نکلنا تو اس کی بھی ایک وجہ تھی، مجھے دراصل وہاں کوئی درویش ہی نہیں ملا، وہاں کوئی مقناطیس کا پہاڑ تھا اور نہ ہی سرے سے کوئی بڑی حقیقت، وہاں تو ایک عام، سادہ، دیہاتی شخص بیٹھا تھا، ہاں البتہ اس کے چہرے پر دو بڑی حیران کن چیزیں تھیں، ایک چاندنی جیسی نرم میٹھی مسکراہٹ اور دوسری آدھ کھلی گہری عمیق آنکھیں۔

میں نے سوچا "یاد یہ کیسا شخص ہے، بولتا ہی نہیں، یہ کیسا درویش ہے، ڈانٹتا ہی نہیں، یہ کیسا ولی ہے جو سامنے بیٹھے شخص کو گنہگار ہونے کا احساس ہی نہیں دلاتا، بھلا صوفی ایسے ہوتے ہیں، اسے تو کامل ولی کی ٹریننگ دینا پڑے گی۔" لیکن انہوں نے اس نشست میں اہل تصوف کی گونا گوں خوبیوں سے بہرہ مند نہ کر سکا کیونکہ راجہ صاحب نے اپنے "طریقہ و اردات" کے مطابق مجھے "اپنی بیڑ تو" قسم کے پتھر میں ڈال دیا اور میں اس غیر اہم شخص کی طرح جسے کبھی گھر والوں نے بھی قابل توجہ نہ سمجھا ہو آدھ گھنٹہ تک مسلسل یادہ کوئی کرتا رہا اور مجھ سے راجہ صاحب بڑے مزے سے، میں نے میز پر کیسے پاس کیا، میں نے ایف اے میں کتنے نمبر لیے، میں نے پنجاب کی بجائے بہاولپور یونیورسٹی سے ایم اے کیوں کیا، میں نے فلاں نوکری کیوں

چھوڑی، مجھے زرافوں کی بجائے ذہیرے کیوں پسند ہیں، سن ۲۰۰۲ء، خبریوزوں کی فصل پر کیوں بھاری ہوگا اور دل کے مرض میں ڈسپرین کی آدھی گولی کیوں لینی چاہیے وغیرہ وغیرہ قسم کا عارفانہ کلام سنتے رہے۔ یہاں تک کہ رات بھیک گئی اور میں اپنے وعدہ معاف گواہ کے ساتھ واپس لوٹ آیا تاہم میں نے رخصت ہونے سے پہلے اپنے آپ سے یہ وعدہ ضرور لے لیا کہ اس بار تو یہ سچ لکھے ہیں لیکن اگلی ملاقات پر میں انہیں ایک "کپی فینٹ" مسونی کی خوبیوں سے ضرور آراستہ کروں گا۔"

پھر ان سے ملاقاتوں کا ایک طویل سلسلہ چل نکلا، میں ان سے کئی بار ملا، انہیں لطیفے سنا کر ہنسانے کی کوشش کی، جھوٹے سچے سیکندرز بتا کر متاثر کرنے کی سعی کی، گستاخانہ قبضوں سے ان کی توجہ حاصل کرنے کا جتن کیا لیکن ان کا ایک ہی رد عمل تھا چاندنی کی طرح ایک نرم مٹھی مسکراہٹ، ان ملاقاتوں میں میں نے انہیں صرف ایک بار کچھ کہتے سنا، پورے دس منٹ کا طویل خطاب جس میں انہوں نے پاکستان کے مستقبل پر اپنا تھیسس پیش کیا، کس طرح اللہ کا ایک بندہ ظہور پذیر ہوگا، وہ کس طرح ساری ملاقات اپنے ہاتھ میں لے لے گا، کس طرح سب کو کڑے احتساب کے پیلے سے گزرتا ہوگا، کس طرح گلیوں، بازاروں اور چوراہوں پر لٹکلیاں لگائی جائیں گی، کس کو کون کتنے کوڑے مارے گا اور پھر کس طرح پورے ملک میں امن ہی امن ہوگا، خوشحالی ہی خوشحالی ہوگی، انصاف ہی انصاف ہوگا اور امریکہ۔۔۔" وہ چونک کر کہے، گھبرا کر آگے پیچھے دیکھا اور پھر "خاصوں" کی بات "عاموں" میں کرنے پر شرمندہ سے ہو کر چہرے پر دوبارہ مسکراہٹ کا ماسک چڑھا لیا اور پھر اس کے بعد میں انہیں جب بھی ملا وہاں مجھے ایک عام سادہ سادیاتی ہی ملا، وجہ اگر کم صاحب نہیں ملے۔

کل رات میں اپنے اور ان کے مشترکہ استاد جناب چوہدری فضل حسین کے ساتھ ان سے ملاقات کے بعد واپس لوٹا تو سارے راستے اپنے آپ سے الجھتا رہا، ہر بار ایک ہی سوال اُٹھ کر کھڑا ہو جاتا "اس شخص میں کیا خوبی ہے؟ یہ بولتا ہے، واعظ کرتا ہے، اور نہ ہی کسی کو متاثر کرنے کے لیے چمکنیں مارتا ہے پھر اس کے پاس اتنا مجمع کیوں رہتا ہے، لوگ اس کے پاس کیوں آتے ہیں اور لوگ بھی وہ کہ ان میں ہر شخص اپنی ذات میں ارسطو بھی ہے اور فرعون بھی۔" میں سوچتا چلا گیا، جواب تراشتا چلا گیا، تاویل پر تاویل کھڑی کرتا چلا گیا لیکن اپنے سوال کے مرتبے کے مطابق مجھے کوئی جواب نہ ملا لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا میں جوں ہی شاہراہ دستور کے اس مقام پر پہنچا جہاں سے ایک سڑک مری روڈ کی طرف جاتی ہے اور دوسری بری امام کے مزار کی طرف مڑتی ہے تو میرے ذہن میں روشنی کا ایک کوندا سا لپکا، میں رگ گیا، میں نے دیکھا میرے سوال کا جواب میرے سامنے دھرا تھا بالکل اس طرح جس طرح چائے کا گرم کپ میرے سامنے میز پر رکھا ہے اور میں اس کی گرمائش محسوس کر رہا ہوں۔

جواب نے کہا "بے وقوف اس خوبی کے بعد بھی کسی خوبی کی منتخباتش رہتی ہے کہ کسی شخص کے پاس بیٹھ کر چھوٹے سے چھوٹے شخص کو اپنے چھوٹے ہونے کا احساس نہ ہو۔" جواب نے کہا "بے وقوف دنیا کہنے

والوں سے بھری پڑی ہے لیکن رجب صاحب کی طرح سننے والے چند ایک ہی ہیں۔" جواب نے کہا۔ "بے وقوف جسے اللہ تعالیٰ نے مسکراہٹ کی کرامت دے رکھی ہو اس سے بڑا دلی کون ہوگا۔" جواب نے کہا۔ "بے وقوف جس شخص میں اتنی پڑائی کے باوجود میں نہ ہو اس سے بڑا صوفی کون ہوگا۔" جواب نے کہا۔ "دنیا جس شخص کے دروازے پر پڑی رہتی ہو لیکن وہ اس کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتا ہو اس سے بڑا بزرگ کون ہوگا۔" جواب نے کہا۔ "جس شخص میں مرعوبیت نہ رہی ہو جس کی چہرہ ختم ہو گئی ہو اس سے بڑا بزرگ کون ہوگا۔" یہاں پہنچ کر میں پسینے میں بھیگ گیا مجھے یوں محسوس ہوا میں لوہے کا ایک چھوٹا سا ذرہ ہوں اگر میرے قدم اکھڑ گئے، ایک لمبے کے لیے اکھڑ گئے تو میں اڑ کر مقناطیس کے پہاڑ کا حصہ بن جاؤں گا، چھوٹی حقیقت سے نکل کر بڑی حقیقت میں گم ہو جاؤں گا۔

میں نے فوراً اپنے قدم مضبوطی سے زمین پر جما لیے۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

دولائیں

چوہدری فضل حسین صاحب کا اداس ہونا بالکل ایسے ہے جیسے گلاب کی ٹہنیوں پر آک کی "امبیاں" اگ آئیں یا مویجے کے پھولوں سے سزے ہوئے چڑے کی بو آنے لگے۔

آج سے بارہ تیرہ برس پہلے جب میں زمیندار کالج گجرات میں ایف اے کا طالب علم تھا تو چوہدری صاحب پر پہل تھے، میں نے انہیں سننے سے پہلے اور انہیں سننے کے بعد کوئی ایسا استاد نہیں دیکھا جو طالب علموں میں اتنا پاپور ہو بلکہ اگر آپ تھوڑی سی جسارت کی اجازت دیں تو میں عرض کروں گا شاید ہی ملک میں ان جیسا صاحب علم، میٹیک مدبر اور جوش عمل سے بھرپور کوئی دوسرا استاد ہو، آپ انہیں سنیں آپ کو یوں محسوس ہوگا آپ کے سامنے جو دھماکا پان سا شخص کھڑا ہے، جس نے سفید براق لباس پہنی رکھا ہے اور جس کے سر پر جناح کیپ ہے، ذرا سی ترجمانی جناح کیپ، اس کے حلق میں اللہ تعالیٰ نے زبان نہیں مگراریاں لگا رکھی ہیں وہ بولتا نہیں، کہتا ہے اور کہتا بھی ایسا کہ سننے والے کی طبیعت میں بٹا شت آجائے، اس کے وجود میں سینکڑوں ڈانٹنے جاگ اٹھیں۔

کسی شخص کا پر مزاح ہونا کوئی بڑی بات نہیں، قہقہہ تو بھانڈ بھی لگوا لیتے ہیں تالی تو جو کر بھی بجوا لیتے ہیں لیکن چوہدری صاحب جیسی حس مزاح کا مالک ہونا واقع بڑی بات ہے کیونکہ چوہدری صاحب کی بات، طنز اور چبھتی میں کات کی بجائے مناس ہوتی ہے، آپ نے شاید ہی ایسا شخص دیکھا ہو جو کسی پر تنقید کی چاند ماری کر رہا ہو اور ہدف بھی اسی خروش سے قہقہے لگا رہا ہو جس اہتمام سے سامعین پیٹ پکڑے بیٹھے ہوں، بس چوہدری صاحب کی یہی خوبی ہے وہ بڑی سے بڑی علمی، گھمبیر سے گھمبیر تقریر اور تیز سے تیز چکی بات اس جگہ پھلکے انداز میں کہہ جاتے ہیں کہ سننے والے کو عرصے بعد پتہ چلتا ہے جس بات پر وہ قہقہے لگا رہا تھا وہ دراصل لطیف نہیں سرشت تھا، رہی ان کی تنقید تو وہ اس تیر انداز کی طرح ہیں جو کمان پر تیر چڑھانے سے پہلے اسے شہد میں بھگو لیتا تھا یا اس ماں کی طرح ہیں جو غصے میں اپنے بچے کو مارتی ہے تو جسم کے ایسے حصوں کا انتخاب کرتی ہے جہاں سے ٹیس نہیں اٹھتیں۔

گزشتہ روز جناب شعیب شاہ کے گھر چوہدری صاحب سے ملاقات ہوئی تو وہ مجھے تجھے تجھے سے نظر

آئے۔ میں نے انہیں غور سے دیکھا، ان کا ستر برس "پرانا" چہرہ بدستور بے شکن تھا، سر پر جتنا کپ بھی تھی، بے داغ براق لباس بھی زیب تن تھا، باتوں میں شوشی اور آنکھوں میں جوانی کی چمک بھی اسی طرح قائم تھی، علم اور فکر کا دریا بھی ابھی تک جو بڑنکس بنا تھا لیکن اس کے باوجود ان میں کسی چیز کی کمی تھی، کوئی ایسا ملال، کوئی غیر محسوس تاسف، کوئی بلکی بلکی غلط ضرورت تھی جو چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی میں یہ وہ چوہدری فضل حسین نہیں ہیں جو کبھی ہوا کرتے تھے، ان باتوں میں ریت آچکی ہے، اب ان باتوں سے رنگ اڑتے جا رہے ہیں، لالہ موسیٰ سے جہلم کی طرف بڑھتے ہوئے، جب شام افق سے اتر کر دلوں پر دستک دے رہی تھی تو میں نے ان سے اس تبدیلی کی وجہ پوچھی وہ خلاف معمول ایک طویل اور ٹھنڈی آہ بھر کر بولے۔ "جاوید میاں پچھلے کچھ عرصے سے ایک کہانی نگار کر رہی ہے۔" ایک لمحے کے لیے رکے، پھر سانس لیا۔ "نہیں چوہدری کہانی نہیں صرف دو لائینیں، جب بھی تنہا ہوتا ہوں جب بھی سوچتا ہوں، یہ دو لائینیں کلوے میں مچھے کانے کی طرح دماغ میں چبھنے لگتی ہیں، زندگی عذاب بن کر رہ گئی ہے۔" سورج اندھیرے کی چادر میں چھپ چکا تھا، اب وہاں افق سے سڑک تک ایک لمبا سا اندھیرا تھا، میں نے پوچھا۔ "یا استاد وہ کون سی ایسی بھاری لائینیں ہیں جنہوں نے آپ جیسے آہنی شخص کا حوصلہ توڑ دیا۔" چوہدری صاحب شخصے سے باہر جھانک کر بولے۔ "میں نے کہیں بہت پہلے منٹو کا ایک افسانہ پڑھا تھا، اتنا پہلے کہ مجھے اس کا عنوان، اس کی کہانی، اس کے سارے کردار تک بھول گئے، بس یاد رہی تو دو چیزیں، ایک یہ کہ وہ کہانی تقسیم ہند کے شہادت پر لکھی گئی تھی اور دوسری یہ کہ اس میں دو ایسی لائینیں تھیں جو بذات خود ایک مکمل کہانی ہیں۔" وہ پھر خاموش ہو گئے۔

بابر اندھیرا گہرا ہو رہا تھا، سڑک کے کنارے کھڑے درخت مکروہ دیوڑادوں کی طرح ڈرا رہے تھے، میرا تجسس آخری حدود کو چھو رہا تھا، انہوں نے شہادت کی انگلی سے پیشانی پر دستک دی۔ "وہ لائینیں کچھ یوں ہیں، دو شخص جا رہے تھے، ایک نے دوسرے سے پوچھا تمہارا نام کیا ہے، اس نے سبے ہوئے لہجے میں کچھ کہا، اتنا نہ کہ اس کی آواز خود اس کے کانوں تک نہیں پہنچ پائی، دوسرے نے فوراً نعرہ لگایا اور اس کے پیٹ میں جھرا گھونپ دیا۔" میں نے کچھ نا سمجھنے کے باوجود گردن ہلا دی، چوہدری صاحب بھی آخر پورے استاد تھے۔ فوراً میری جہالت تک پہنچ گئے۔ لہذا آہستہ سے بولے "بیٹا میں محسوس کر رہا ہوں، ہمارے شہروں، ہمارے قصبوں میں لوگ اب اپنے ناموں کے وہ جیسے کات رہے ہیں جن سے ان کے شیعہ یا سنی ہونے کا گمان ہوتا ہے، مجھے ڈر ہے اگر فوری طور پر فرقہ پرستی کی یہ آگ بجھائی نہ گئی تو شاید آنے والے چند برسوں میں ایسا وقت آ جائے جب ایک راہ گیر دوسرے سے اس کا نام پوچھے، دوسرا بتانے سے پہلے اس کا نام پوچھے، دونوں جب سے ریوالتور نکالیں، دونوں گولیاں چلائیں اور دونوں ڈھیر ہو جائیں۔"

رات گہری ہو چکی تھی، ہم جہلم سے باہر آچکے تھے، ابھی چند لمحوں میں کالا گوجر اس آئے گا جہاں میری زندگی کے حیران کن شخص نے آ کر جانا تھا اور اس کے بعد میں نے اسلام آباد تک ان دو چھٹی، آگ لگائی اور

سلکتے ریز کی طرح دھواں چھوڑتی لائینوں کے ساتھ سفر کرتا تھا، میں نے ہلکی ٹھنڈی ہوا کا کھونٹ بھرا اور اپنے آپ سے سوال کیا۔ "ایک ستر برس کا بوڑھا جس نے پوری زندگی امید ہوئی اور امید ہی کافی ہو، زندگی کی آخری ساعتوں میں، ایک ایسے بدترین دور میں خود کو مایوس ہونے سے کیسے بچا سکتا ہے جب لوگ موت کے خوف سے اپنے نام تک بدلنے لگیں؟" مجھے میرے سوال کا کوئی جواب نہیں ملا۔

چوہدری صاحب کا لاگو جراثیم میں اتر گئے لیکن چھیتی ہوئی آگ لگاتی ہوئی اور دھواں چھوڑتی ہوئی دو لائینیں مجھے تختے میں دے گئے اور اب یہ میرے کمرے میں مجھے کانٹے کی طرح ہر قدم پر نہیں بن کر اٹھتی ہیں اور چیخ بن کر نکلتی ہیں۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

لارنس آف عربیہ

تقریباً ایک صدی پرانا قصہ ہے۔

برٹش آرمی میں ایک کرنل تھا، کرنل نینڈو، وہ کسی اہم سرکاری ذمہ داری پر لندن سے ہندوستان آیا تو اس نے وہاں سے قبل "ہنگ آف انڈیا" کے مشاہدے کا فیصلہ کیا، عراق و رویشانہ تھا چنانچہ ایک عام سیاح کی حیثیت سے سیاحت کے لیے نکل کھڑا ہوا، ہندوستان کے مختلف شہر، قصبے اور تاریخی مقامات سے ہوتا ہوا آخر میں گھرگ جا پہنچا۔ اس وادی کے حسن نے اس کی آنکھیں خیرہ کر دیں۔ لوگ بتاتے ہیں کرنل نینڈو کو وہ جگہ اتنی پسند آئی کہ وہ ہفتوں وہیں پڑا رہا۔ سارا دن کچے کچے راستوں، پہاڑی جھرنوں، آبشاروں اور وند میں لپٹے درختوں کی تلاش میں گھومتا رہتا، ایک روز عجیب واقعہ پیش آیا جب وہ گھرگ کے باہر کسی جنگی چنڈی پر حیران پھر رہا تھا تو ایک گنوار کو جبر لڑی اس سے آکر لائی، اس گنوار نے وہی کام کر دکھایا جو ہندو کے آدم میں ماچس کا شعلہ دکھاتا ہے یا پتے تو سے پر مٹی کی بوند دکھاتی ہے۔ کہنے والے کہتے ہیں کرنل نینڈو اس معمولی سی لڑکی کے لیے پاگل ہو گیا، نوکری سے استعفیٰ دے دیا، لندن کے مصافحات میں اپنی استغیا جاگیر سے دستبردار ہو گیا اور سارے پرانے یار احباب چھوڑ دیئے۔

عشق آگے بڑھا تو لڑکا لڑکی نے شادی کا فیصلہ کر لیا لیکن گوجر قبیلے کی شرطیں بڑی کڑی تھیں پر نینڈو بھی اس لڑکی کے لیے ہر عذاب بھیننے کو تیار تھا چنانچہ اس نے سوٹ کی جگہ پسینے میں بھیگا بد بودار قرن پہنا، گوجری زبان سیکھی، کلمہ پڑھ کر مسلمان ہوا۔ بھیڑ بکریاں چرائیں، نگڑیاں کاٹیں، چارے کے گھسے اٹھائے، جنگلی ریچھوں سے کشتی کی، مقامی نوجوان سے "گھٹکا" کھلیا اور سیاہ اندھیری راتیں جنگلوں میں گزاریں جب جا کر کہیں قبیلے کی ریت رسوں میں اس اجنبی کی گنجائش پیدا ہوئی۔ یوں نینڈو اور وہ گوجر لڑکی ایک طویل آزمائش کے بعد یک جان ہو گئے، شادی ہوئی، دو سال بعد ایک بیٹی پیدا ہوئی۔

کرنل بندہ سمجھدار تھا، لہذا اس نے پوری زندگی بھیڑ بکریاں پالنے کی بجائے بھیڑ بکریوں کا کاروبار شروع کر دیا، ٹیک نیت بھی تھا اور پڑھا لکھا بھی، چنانچہ کاروبار چمک اٹھا تو بستی سے گھرگ آئے وہاں بکریاں بیچ کر ریسٹورنٹ بنایا، پھر ہوٹل اور پھر بڑے بڑے ہوٹل۔ انفرض میں برسوں میں اس کا شمار ہندوستان

کے بڑے سرمایہ داروں میں ہونے لگا۔

ہم کچھ دیر کے لیے اس کہانی کو یہیں روکتے ہیں۔

برٹش آرمی کا بین الاقوامی شہرت یافتہ کردار کرنل لارنس (جسے عرف عام میں لارنس آف عربیہ کہا جاتا تھا) عجیب سخت جان شخص تھا۔ وہ بغیر کچھ کھائے بچے ہفتوں صحرا میں زندہ رہ سکتا تھا، صفر درجے سے نیچے جہاں پانی برف بن جاتا ہے، وہ تنگ دھڑنگ گھنٹوں کھڑا رہ سکتا تھا، تیز بہاؤ کے الٹ گھنٹوں تیر سکتا تھا، وہ بھوکے شیروں کے غاروں میں داخل ہوتے چند سیکنڈ لگا کر قابل میں ہاتھ ڈال کر سانپ کو پھین سے پکڑ کر باہر کھینچ لیتا تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ چاروں آسمانی کتابوں کا حافظ تھا عربی، فارسی، انگریزی اور فرانسیسی اس روانی سے بولتا تھا کہ بڑے سے بڑا صاحب زبان بھی دھوکہ کھا جائے، اتنا سحر البیان تھا کہ مخاطب کی سانس تک کھینچ لیتا تھا۔ شاید انہی خوبیوں کے باعث اسے "درندے کی چوڑی میں دانشور کا دماغ" کہا جاتا تھا۔

کرنل لارنس جب "ترک سلطنت" کی "بغاد" پھل کر "وزیرت آف ڈیجھ" سے واپس لوٹا تو اسے کمانڈر کی طرف سے نوراہندوستان پہنچنے کا حکم ملا وہ اگلے ہی روز دہلی روانہ ہو گیا، جہاں نیا حکم اس کا منتظر تھا۔ قصہ مختصر جب وہ وائسرائے کے "محل" میں داخل ہوا تو وائسرائے نے اس کا اس طرح استقبال کیا، جس طرح بڑی قومیں اپنے بہرہ دار کا کیا کرتی ہیں، دن بھر کے جشن کے بعد جب رات نے دستک دی تو نشے میں چور وائسرائے نے اسے وہ حکم نامہ سنا دیا جس میں لارنس کی نئی ذمہ داری درج تھی۔ لارنس نے حکم نامہ پڑھا اور کچھ دیر سوچ کر بولا "ہزار کیسے لینی! مجھے داڑھی بڑھانے کے لیے چند دن لگیں گے۔ آپ کسی ایسے مسلمان کا بندوبست کر دیں جو مجھے اسلامی شعائر سکھا دے۔" وائسرائے نے سینے پر ہاتھ رکھا اور بولا "آپ سمجھیں آپ کا کام ہو گیا۔"

کرنل لارنس کی ہندوستان آمد کے چھ ماہ بعد لاہور میں مدینہ شریف سے آنے والے ایک بزرگ کا غلطہ بچا، "شاہ جی" پرانی اتارکلی کے ایک تنگ دھار ایک گھر میں رہتے تھے۔ بڑے قرآن فہم تھے، اللہ تعالیٰ نے گھا بھی اچھا دیا تھا لہذا جب سورہ فتح کی تلاوت فرماتے تو چلتے قدم رک جاتے اور پرندے پرواز بھول جاتے، دعاؤں میں اس قدر اثر تھا کہ جو کہہ دیتے دوسرے ہی روز پورا ہو جاتا، مہمان نواز اسنے کہ سارا دن نگر جاری رہتا چنانچہ ہر وقت زائرین کا تاتا بندھا رہتا، ادھر ان کی شہرت تھی کہ پھلتی ہی جاری تھی، یہاں تک کہ چند ماہ میں ان کے عربین پورے ہندوستان میں پھیل گئے۔

اب ہم پہلی اور دوسری کہانی کو ملا دیتے ہیں۔

جب یہ شہرت پھیلنے پھیلنے لگی تو نیند و جسے اب بزرگوں کی تلاش کا خلیہ ہو چکا تھا، شاہ جی سے ملاقات کے لیے لاہور آ پہنچا، آستانے پر حاضری دی تو شاہ جی نے نیم وا آنکھوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "نیند و ہم تمہارے ہی منتظر تھے۔" کرنل نیند و کے لیے شاہ جی کا فرمانا بڑا حیران کن تھا کیونکہ پچھلے ۳۲ برسوں سے لوگ

اسے عبد اللہ کے نام سے جانتے تھے، بہر حال چند منٹوں کی اس ملاقات کے دوران عبد اللہ (نیزو) "شاہ جی" کے ہاتھ بیعت ہو گیا جس کے بعد ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا، سال چھ ماہ میں شاہ جی گھر گ کا چکر لگا لیتے جبکہ ہر دوسرے تیسرے ماہ عبد اللہ (نیزو) ہفتہ دس دن کے لیے لاہور آ جاتا، انہی ملاقاتوں کے دوران کسی کمزور لمحے میں عبد اللہ (نیزو) نے اپنی پابند صوم و صلوة بیٹی شاہ جی کے مقدمے میں دینے کا فیصلہ کر لیا۔ شاہ جی سے عرض کی گئی تو شاہ جی نے اس ٹیک کام کے لیے فوراً حاضری بھری یوں چند ہی روز میں عبد اللہ نے اپنی بیٹی عین سنت کے مطابق دو کپڑوں میں شاہ جی سے بیاہ دی۔

شادی کے دو مہینے بعد جب عبد اللہ لاہور آیا تو بیٹی نے اس کے پاؤں میں گر کر رونا شروع کر دیا۔ عبد اللہ پریشان ہو گیا۔ بہر حال قصہ مختصر بیٹی نے باپ کو بتایا کہ شاہ جی کے بھیس میں یہ شخص "لارنس آف عربیہ" ہے جو مسلمان نہیں، یہودی ہے اور مسلمانوں میں فرقہ واریت کا زہر پھیلانے کے لیے ہندوستان آیا ہے۔

عبد اللہ (نیزو) فوراً شاہ جی کے "حضور" حاضر ہوا جہاں دونوں کے مابین طویل ٹکراہٹ ہوئی، جس میں "لارنس آف عربیہ" نے نہایت ڈھٹائی سے نہ صرف سارے الزامات تسلیم کر لیے بلکہ "کرو جو کرنا ہے" قسم کی دھمکیاں بھی دے ڈالیں، قصہ مزید مختصر لڑکی کو اندر بند کر دیا گیا۔ عبد اللہ کو دھکے دے کر بھاگ دیا گیا اور شہر میں مشہور کہہ دیا گیا عبد اللہ طحہ ہے۔ جو شخص اس کو جہاں دیکھے فوراً قتل کر دے۔ قصہ کو مزید مختصر کرتے ہیں۔ یہ عبد اللہ رستم ناماں گاماں پہلوان کے پاس گیا اور اسے ساری کہانی سنائی۔ "گاماں" پہلوان ہونے کے ساتھ ساتھ سچا عاشق رسول ﷺ بھی تھا وہ فوراً اپنے پنوں کے ساتھ اسی وقت پرانی اماں کی بیٹی "شاہ جی" کو گریبان سے پکڑ کر باہر لایا اور تھڑے پر کھڑے ہو کر لارنس آف عربیہ کو پاؤں سے پکڑ کر الٹا لٹکا دیا اور اعلان کیا جب تک یہ شخص عبد اللہ کی بیٹی کو طلاق نہیں دیتا یہیں لٹکا رہے گا۔ الغرض چند گھنٹوں کی کوشش کے بعد شاہ جی نے سینکڑوں لوگوں کی موجودگی میں نہ صرف اپنے سارے گناہوں کا اعتراف کیا بلکہ عبد اللہ کی بیٹی کو بھی آزاد کر دیا۔ بعد ازاں یہ لڑکی شیخ برادری کے ایک گورے چنے نوجوان عبد اللہ سے بیاہی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے بعد ازاں اس شیخ لڑکے کو بڑی عالمگیر شہرت اور عزت سے نوازا۔ جی ہاں اس لڑکے کا نام شیخ عبد اللہ تھا اور یہ خاتون مقبوضہ کشمیر کے موجود کھ پتلی وزیر اعلیٰ ڈاکٹر فاروق عبد اللہ کی والدہ ہیں۔

جب مجھے دنیا کے نامور دست شناس اور عبد اللہ خاندان کے قریبی دوست شمیم قریشی نے یہ قصہ سنایا تو میں نے بے اختیار کہا۔ "قریشی صاحب اس عفت ماب خاتون کا مقدر ہی خراب تھا۔" شاہ جی کے ہاتھ سے نکلی تو "شاہ جی" کے ہاتھ جا گئی، ایک لارنس سے بچی تو دوسرے لارنس آف عربیہ کے جال میں جا پھنسی۔"



فلاش

روز ٹھیک چوبیس بجے ایک جہاز میرے گھر کے اوپر سے گزرتا ہے، اس کی آواز جوں ہی میرے کانوں سے ٹکراتی ہے، میں بھاگ کر چھت پر جاتا ہوں اور پھر اس وقت تک پاٹھوں کی طرح آسمان پر نظریں لگائے کھڑا رہتا ہوں، جب تک جہاز باریک نقطہ بن کر میری نظروں سے معدوم نہیں ہو جاتا۔

یہ جہاز جب بھی گزرتا ہے، مجھے بھی محسوس ہوتا ہے، ڈاکٹر شفقت فاروق ملک چھوڑ کر جا چکی ہیں۔ اب سیم زدہ زمینوں پر کوئی کونسل نہیں چھوٹے گی، اب زمین کا تصور بھی نہیں ٹوٹے گا، اب اس ملک کے باقی کبھی اپنی مٹی کی گندم نہیں کھا سکیں گے، اب یہ ملک کبھی خوراک میں خود کفالت کی منزل نہیں پاسکے گا۔

۱۹۷۸ء میں جب، یاب (نیکو سیرا سینیٹ) فارا گمری پھر ایڈ بانیالوئی، فیصل آباد) میں ملازم ہوں، تو ان کی زندگی کی ایک ہی خواہش تھی۔ "میں پاکستان کی ایک ایک انچ پر گندم اگاؤں گی۔" لوگ ان کی باتیں سن کر ہنستے تھے، انہیں ہنسنا بھی چاہیے تھا، کیونکہ ان کے سامنے ایک ایسے محروم اور بکھر ملک کی ایک کمزور "تیلا" سی لڑکی تھی جو ہالیوڈ جتنے اونچے دعوے کر رہی تھی، ایک ایسے ملک کی لڑکی جو ہر سال لاکھوں ڈالر کی گندم درآمد کرتا ہے، جس کی زمینوں پر اگنے والی گندم کی ۵۰ ہتھیریں میکسیکو سے درآمد ہوتی ہیں اور جس کی ۴۰ فیصد زرعی زمین سیم اور تھور کا شکار ہے۔ "آپ یہ معجزہ کیسے دکھائیں گی؟" پوچھنے والوں کی آنکھوں میں طنز اور ہونٹوں پر شرارت ہوتی تھی۔ "میں سیم اور تھور کی شکار زمینوں پر گندم اگاؤں گی۔" شفقت فاروق کی آواز میں لوہے جیسا عزم اور آنکھوں میں ہیرے جیسی چمک ہوتی تھی۔ سننے والوں کے لیے یہ الفاظ فقرہ کم اور گدگدی زیادہ ہوتے تھے، لہذا وہ دیر تک ہنستے رہے، لیکن وہ تھنیک نفرت اور طنز کی اس فضا میں، ہر دوسرے شخص کے قبیلوں اور محنتوں سے لاقطع اپنے کام میں منہمک رہیں۔

ڈاکٹر شفقت نے سیم اور تھور کے علاقوں میں گندم اگانے کے لیے ایک تحقیقاتی ادارہ بنایا، پوری دنیا کے دورے کیے، گندم پر ریسرچ کرنے والے اداروں میں گئیں، انہیں اپنا منصوبہ سمجھایا، گھنٹوں میزوں پر بیٹھ کر میکسیکو کے شاطر سائنس دانوں سے گفتگو کی، آخر میں جب ساری دنیا قائل ہوئی تو انہیں امداد ملی، لیبارٹری کے آلات اور نوجوان سائنس دانوں کی ٹریننگ کے لیے وظائف ملے اور انہوں نے ایک مکمل اطمینان کے

ساتھ کام شروع کر دیا۔

جب وہ سیم اور تھور کا شکار زمینوں کا معائنہ کر رہی تھیں تو ان کے مشاہدے میں آیا ایسی زمینوں پر جہاں مضبوط ترین جیج بھی مٹی ہو جاتا ہے ایک خاص قسم کی گھاس بغیر کسی محنت کے اُگ آتی ہے، ڈاکٹر شفقت نے پوری دنیا سے اس گھاس کے نمونے اکٹھے کیے، انہیں سیم اور تھور کی شکار زمینوں پر بویا، زیادہ تیزی سے پروان چڑھنے والی گھاس کے "جیج" حاصل کیے، ان میں وہ "کریکٹر" تلاش کیا جو ناموافق زمین پر پودے کو زندہ رکھتا ہے، پھر اس کریکٹر کو "ڈویلپ" کیا، جب وہ ایک مخصوص سطح پر پہنچ گیا تو اسے گندم کے پودے میں منتقل کیا، اس کے جیج لیے، انہیں بویا، پھر جیج لیے، انہیں بویا، سٹ آیا، وہ جیج بڑی رہیں، نئے آتے رہے، گھاس کا کریکٹر گندم کے بطن میں پروان چڑھتا رہا، یہاں تک کہ جب ڈاکٹر شفقت نے یہ جیج سیم زدہ زمین پر پھینکا تو چند ہی روز بعد کوئیل نکل آئی۔ اس وقت ان کی خوشی کا کوئی محاکنہ نہ رہا، وہ بچوں کی طرح جالیاں پھینکیں اور پاگلوں کی طرح قہقہے لگا رہی تھیں..... پھر اس وقت "نایاب" کے ابو جملوں نے اگلیاں دانوں میں دیا لیں۔

ڈاکٹر شفقت کا تجربہ کامیاب ہو گیا۔ سیم اور تھور کی شکار زمین پر اُگنے والی گندم نے عام زر خیز زمین سے زیادہ پیداوار دی جب کہ اس کو کھاد، پانی اور دوسرے لوازمات کی ضرورت بھی نہیں پڑی۔ اپنی "دریافت" ثابت کرنے کے لیے ڈاکٹر شفقت نے بچوں کی کھپ پوری دنیا میں بھجوائی، میکسیکو، برطانیہ، مراکش، ایران، عراق، چین اور افغانستان کے علاقوں قندھار، ہرات اور جلال آباد میں یہ جیج بو کر دیکھا گیا، ہر جگہ اس نے سو فیصد نتائج دیے، ہر ملک کے سیم زدہ علاقوں نے یہ جیج قبول کر لیا۔

ڈاکٹر شفقت کامیاب تو ہو گئیں لیکن یہ کامیابی ان کی زندگی کے ۲۰ سال کھامنی، جب انہوں نے تجربے کا آغاز کیا تھا تو وہ ایک پتلی پننگ کی لڑکی تھیں، لیکن جب ٹیسٹ نیوب سے سر اٹھایا، دستانے اتارے، ایچرن کھولا تو ان کا نصف سرفید ہو چکا تھا، چہرے پر چربی آچکی تھی، گردن کی جلد ڈھیلی پڑ چکی تھی، ہاتھوں کی مٹھلت اور پیروں کی نسوانیت دم توڑ چکی تھی، اب بیڑھیاں پڑھتے ہوئے ان کا دم پھولتا تھا اور جھٹکتے ہوئے ان کی کمر دکھتی تھی، لیکن اس کے باوجود ان کے چہرے پر گز رے وقتوں کا ملال نہیں تھا، ان کی باتوں میں شکوے اور ان کی آنکھوں میں بڑھاپے کی بے جا دگی نہیں تھی اور یہ ہونی بھی نہیں چاہیے تھی کہ وہ ایک کامیاب خاتون تھیں، ایک ایسی کامیاب سائنس دان جس کے چہرے دنیا بھر کے سائنس میگزینوں اور جدید آلات سے مزین لیبارٹریوں میں ہوتے تھے۔

اور اکثر ایسا ہوتا، جب ان کا سارا شاف چلا جاتا اور وہ بھوک سے نڈھال ہو جاتیں تو گھر جانے سے پہلے وہ لیبارٹری کا چکر ضرور لگاتیں۔ نیو یو میں لگے پودے دیکھتیں، نرے میں بھی کوئیلوں پر انگلیاں پھیرتیں اور فریزر میں جمی "زندگی" سے حرارت لیتیں اور سوچتیں چند ہی دنوں کی بات ہے، یہ جیج اس لیبارٹری سے نکلے گا اور پاکستان کے سارے سیم زدہ علاقوں میں ہریالی آ جائے گی، پاکستان آزاد ہو جائے گا، پھر گندم

کی درآمد پر لاکھوں ڈالر ضائع نہیں ہوں گے، بڑی طاقتیں ہمیں بلیک سیل نہیں کر سکیں گی..... لیکن یہ خواب تھا اور خواب ہی رہا۔

آنے والے دنوں میں دو حادثے ہوئے۔ ”نایاب“ کی انتظامیہ بدل گئی، نیا ڈائریکٹر جنرل آگیا، انگریز پتھر کے بجائے فوڈ سائنسز کا بندہ ان کا انسر بن گیا اور انسر بھی وہ جسے پرانی نوکری سے کرپشن کے الزامات میں ترانسفر کیا گیا تھا، دوسرا حادثہ پنجاب کی سیاسی قیادت تھی، جس نے اپنے ایک دوست سائنس دان کو نوازنے کا فیصلہ کر رکھا تھا، حکم آیا ”دوست“ کو ڈائریکٹر لگا دیا جائے۔ ”نایاب“ کی انتظامیہ نے سوچا ڈائریکٹر کیسے بنایا جائے۔ ”دوست“ نے جواب دیا ایک نیا سنٹر بنایا جائے، جہاں اسے ڈائریکٹر لگا دیا جائے۔ چنانچہ اسے ڈائریکٹر بنانے کے لیے ”کائن سنٹر“ بنایا گیا، اب ایک نیا مسئلہ کھڑا ہو گیا، نئے ڈائریکٹر کے لیے سٹاف کی ضرورت تھی۔ لیبارٹری، آلات اور فرنیچر کی ضرورت تھی، چنانچہ ایک روز نیا آرڈر آیا اور ڈاکٹر شفقت کو نیب جی (N.I.B.G.E) ٹرانسفر کر دیا گیا، ان کے سارے لفٹائے فرنیچر سے نکال کر کوڑے دانوں میں پھینک دیئے گئے، سارے ٹرے، ساری ٹیبلٹیں خالی کر دی گئیں، سارے آلات ”کائن سنٹر“ کے ڈائریکٹر کے حوالے کر دیئے گئے اور سارا سٹاف مختلف شعبوں میں تقسیم کر دیا گیا۔

اس روز ڈاکٹر شفقت پھوٹ پھوٹ کمرہ روئیں۔ بالکل ان باتوں کی طرح جو اپنے جوان بچوں کی مرگ پر روتی ہیں یا اس چڑیا کی طرح جو اپنا بچہ گھوسلے سے گرنے پر گریہ زاری کرتی ہے۔ اس واقعے کو پورا سال گزر چکا ہے۔ ڈاکٹر شفقت کے پاس اب کوئی کام نہیں، بس ہر ماہ انہیں تنخواہ مل جاتی ہے، لیکن وہ اس بے چینی کا کیا کریں، جو ۲۰ برس تک مسلسل اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کام کرنے سے ان کی ہڈیوں کا حصہ بن چکی ہے، جو انہیں دس منٹ تک فارغ نہیں بیٹھنے دیتی، اس ایک سال میں وہ مزید ۲۰ برس بوڑھی ہو گئیں۔

انہیں باہر کی دنیا بلا رہی ہے، میکسیکو کے تحقیقاتی ادارے، فلپائن کی زرعی یونیورسٹیاں، لندن اور اسپین کے انسٹی ٹیوٹ، پوری دنیا ان کے لیے کھلی ہے، ایسی دنیا جہاں کام کرنے والے شخص اور ٹیلنٹ کی قدر ہے، وہ خود بھی پاگل پن سے بچنے کے لیے ملک سے فرار ہونا چاہتی ہیں (شاید اب تک ہو بھی چکی ہوں) میں ڈاکٹر شفقت فاروق سے کبھی نہیں ملا، میں ان سے ملنا بھی نہیں چاہتا، اس قسم کے لوگوں سے ملاقات مجھے ہائی کر دیتی ہے، میرے معدے کی تیزابیت بڑھ جاتی ہے میرے ذہنی خلجان میں اضافہ ہو جاتا ہے، ہاں البتہ میرے ایک دوست نے طویل عرصے تک ڈاکٹر شفقت کے ساتھ کام کیا، جب وہ مجھے یہ کہانی سنا رہا تھا تو میں سوچ رہا تھا کہ ملک سے محبت کرنے والے باصلاحیت لوگوں کے بغیر بھی کوئی ملک خود انحصاری کے راستے پر چل سکتا ہے؟

ہاں محترم قارئین، قوموں کا سرمایہ کھیت، ٹیکسٹائیاں، گاڑیاں، ادارے اور فنونوں سے لبالب بھری

تجربیاں نہیں ہوتا، لوگ ہوتے ہیں، اپنے ملک سے محبت کرنے والے ہنرمند لوگ۔
 کسی قوم کا ایک دانشور، عالم یا سائنس دان حالات سے پریشان ہو کر نقل مکانی کر جائے تو اس قوم
 سے بڑی فلاح قوم کوئی اور نہیں ہوتی، خواہ اس کے سارے پہاڑ سونا بن جائیں، ساری ندیوں، سارے
 دریاؤں اور سارے پیراجوں میں تیل بہنے لگے اور اس کے سارے درختوں سے اشرفیاں اُترنے لگیں۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

طیقا بد معاش

طیقا بد معاش نے چنگی بجا کر راکھ جھاڑی اور ناک آسمان کی طرف اٹھا کر منتوں سے دھواں اٹھنے لگا۔
 "تو تمہارا خیال ہے معاشرے میں ساری خرابی ہم نے پھیلا رکھی ہے۔" اس کے منہ کے کناروں سے جہاں سے ہونٹوں کی کمانیں اٹک ہوتی ہیں، دھوئیں کی ایک پتلی سی لکیر اٹھی اور سارے کمرے میں کڑوے تباہی کو بو پھیل گئی۔ وہ کچھ دیر تک دھوئیں کی لکیر پر نظریں جمائے بیٹھا رہا، جب سرنگی لکیریں نفا میں تحلیل ہو گئیں تو وہ بولا۔

"لیکن میں سمجھتا ہوں اس ملک میں جو قصور بہت امن، غیرت، شرم، حیا، ایمانہ ادبی اور خوفِ خدا بچا ہے، وہ صرف ہم بد معاشوں کی وجہ سے ہے۔"

"تم یقین کرو میرے محلے کی بچیاں رات گئے تک گلی میں پھرتی رہتی ہیں لیکن کسی کی مجال نہیں ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے۔ میرے محلے کی لڑکیاں شہر کے دوسرے کونے میں بڑھنے جاتی ہیں لیکن آج تک کسی اوہاٹ نے ان پر آواز سے کہنے کی جرأت نہیں کی۔ میرے محلے میں مدت سے کبھی چوری نہیں ہوئی، کوئی قتل نہیں ہوا، کوئی ڈاکو نہیں پڑا، کسی نے کسی کی جائیداد پر قبضہ نہیں کیا، کسی نے کسی کو بے عزت نہیں کیا، کوئی جھگڑا نہیں ہوا، کوئی تنازع نہیں اٹھا، کوئی لڑکی اغوا نہیں ہوئی، کوئی کاشییل نہیں آیا..... کیوں؟ کیونکہ لوگ جانتے ہیں، یہ طیقا بد معاش کا علاقہ ہے اور اگر طیقا کا میسر پھر جائے تو وہ ناگ پر ناگ رکھ کر بندہ چیر دیتا ہے۔"

"تم یقین کرو جب کوئی بڑا افسر شہر میں آتا ہے تو علاقے کا ایس ایچ او مجھے بلا کر کہتا ہے، بھائی طیقا ڈی آئی جی صاحب آرہے ہیں، اب میری عزت تمہارے ہاتھ میں ہے، مہربانی کرو شہر میں دو دن تک کوئی واردات نہیں ہونی چاہیے۔"

تو میں سینے پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہوں، ملک صاحب آپ فکر ہی نہ کریں یہ شہر دو دن کے لیے مکہ مدین بن جائے گا اور پھر دو دن شہر میں چڑی نہیں پھڑکتی، کیوں؟ کیونکہ لوگ جانتے ہیں، یہ طیقا بد معاش کا علاقہ ہے اور اگر طیقا کا میسر پھر جائے تو وہ ناگ پر ناگ رکھ کر بندہ چیر دیتا ہے۔"

"تم یقین کرو جب پلس ساری کوششیں کر کے تھک جاتی ہے تو رات کے اندھیرے میں ایس ایچ او

میرے ڈیرے پر آتا ہے اور ہاتھ جوڑ کر کہتا ہے۔ "ٹیلے کسی طریقے سے ملزم پیدا کرو، نہیں تو میری نوکری گئی اور میں دوسرے روز آلہ قتل کے ساتھ بندہ پیش کر دیتا ہوں۔ تمہیں پتا ہے جب ایم این اے کے بیٹے کی گاڑی چوری ہوئی تو وہ کس نے برآمد کرائی تھی؟ میں نے، جب جنازے کے دوران وزیر کا پرس نکل گیا تو جب کس نے کس نے چلس کے حوالے کیا، میں نے، جب شیخ صاحب کی لڑکی نکل گئی تو وہ کس نے واپس کرائی؟ میں نے، جب شہر میں پاؤڈر بکے لگا تو "سودا" بیچنے والے کس نے پکڑوائے؟ میں نے، کیوں؟ کیونکہ لوگ جانتے ہیں یہ ٹیلے بد معاش کا علاقہ ہے اور اگر ٹیلے کا میٹر پھر جائے تو وہ ناگ پر ناگ رکھ کر بندہ چیر دیتا ہے۔"

"تم یقین کرو جب گلیاں کچی کرنے کا وقت آتا ہے تو سب سے پہلے بجری، ریت اور سر یا ٹیلے کے محلے میں آتا ہے، جب فون کٹنے لگتے ہیں تو پہلے ٹیلے کے محلے میں لگتے ہیں، جب بجلی اور گیس آتی ہے تو پہلے ٹیلے کے محلے میں میٹر لگتے ہیں، جب زکوٰۃ فنڈ تقسیم ہونے لگتا ہے تو رقم پہلے ٹیلے کے محلے میں آتی ہے، جب نوکریوں کا "کوئ" آتا ہے تو پہلے ٹیلے کے محلے کے بے روزگاروں کو "لیز" ملتے ہیں اور جب داخلے کھلتے ہیں تو پہلے ٹیلے کے محلے کے بچوں کو داخلے ملتے ہیں، کیوں؟ کیونکہ لوگ جانتے ہیں یہ ٹیلے بد معاش کا علاقہ ہے اور اگر ٹیلے کا میٹر پھر جائے تو وہ ناگ پر ناگ رکھ کر بندہ چیر دیتا ہے۔"

"تم یقین کرو جب گھروں میں کوئی جھگڑا ہو جائے، جب مہمان بھائی سے لڑ پڑے، جب کسی کا داماد اس کی بیٹی کو مارتا یا بیٹنا شروع کر دے، جب جائیداد کی تقسیم تنازعہ بن جائے، جب رشتے لینے اور دینے پر سر کھٹنے کا خطرہ پیدا ہو جائے، جب مولوی مولوی سے الجھنے لگے، جب بچہ باپ کے سامنے کھڑا ہو جائے، جب خاندانی شادی کرنے لگے، جب باپ بچوں کو پھینکی لگانے لگے، جب ادھار یہ دکاندار کے پیسے دینے سے انکار کر دے، جب سوتیلی ماں بچوں کو باہر نکال دے اور جب بچوں کی لڑائی بڑوں تک پہنچنے لگے تو فریقین تھاتے تھپانے کی بجائے ٹیلے کے ڈیرے پر آ جاتے ہیں اور طینا اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کو گواہ بنا کر ایمان قرآن کے مطابق فیصلہ کرتا ہے اور اس کے بعد کسی کی مجال نہیں کہ اس فیصلے سے بھاگ سکے کیوں؟ کیونکہ لوگ جانتے ہیں یہ ٹیلے بد معاش کا علاقہ ہے اور اگر ٹیلے کا میٹر پھر جائے تو وہ ناگ پر ناگ رکھ کر بندہ چیر دیتا ہے۔"

"تم یقین کرو، ہمارے محلے کی استائیاں اور ماسٹر کبھی غیر حاضر نہیں ہوتے، ڈپسٹری کا ڈاکٹر کبھی لیٹ نہیں ہوا، خاکروب نے کبھی چھٹی نہیں کی، ہماری ٹالیاں کبھی گھنٹی نہیں ریں، ہمارے کوڑے دانوں نے کبھی بد بو نہیں چھوڑی، ہمارے بجلی کے تار کبھی نہیں ٹوٹے، ہمارے ٹیلی فون کبھی بند نہیں ہوتے، گیس لیک نہیں ہوتی، دالی نے کبھی خڑو نہیں کیا، ناموں کا اندراج کرنے والے کلرک نے کبھی پیسے نہیں لیے۔ حفاظتی ٹیکوں والوں نے "فرلو" نہیں لگایا اور لوتنیوں سے کبھی ہوا خارج نہیں ہوئی۔ کیوں؟ کیونکہ لوگ جانتے ہیں یہ ٹیلے بد معاش کا علاقہ ہے اور اگر ٹیلے کا میٹر پھر جائے تو وہ ناگ پر ناگ رکھ کر بندہ چیر دیتا ہے۔"

"ہاں تو تم کہتے ہو معاشرے میں سارا ہکا بکا ہم نے پھیلا رکھا ہے۔ نہیں باؤ نہیں۔ یہ سارا گند

شریف لوگوں کا پھیلا یا ہوا ہے، ہم تو اپنے گھروں، اپنے ہمسایوں کے گھروں کی حفاظت کر رہے ہیں، تم ذرا خود ایمان سے بناؤ اگر کسی محلے میں ادبائش لڑکے روز کسی لڑکی کو تنگ کرتے ہوں اور محلے کا مولوی ان لڑکوں کو روک کر کہے "تم لوگ اگر کل ادھر آئے تو میں تمہاری ٹانگیں توڑ دوں گا۔" تو کیا وہ لڑکے اپنی حرکتوں سے باز آجائیں گے، نہیں وہ لڑکے کل پھر اس لڑکی کے پیچھے آئیں گے۔ کیوں؟ کیونکہ وہ جانتے ہیں مولوی شریف آدمی ہے، وہ کبھی ٹانگیں نہیں توڑ سکتا، لیکن اگر طیف بد معاش ان لڑکوں کو روک کر صرف ایک بار کہہ دے، تم میں سے کل کوئی ادھر نظر نہ آئے، تو وہ لڑکے پوری زندگی اس گلی کا زخ نہیں کریں گے۔ کیوں؟ کیونکہ وہ جانتے ہیں یہ طیف بد معاش کا علاقہ ہے اور اگر طیف کا میٹر پھر جائے تو وہ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بندہ چیر دیتا ہے۔

"ہاں باؤ! جو شرافت کسی ایک ادبائش شخص کا راستہ نہ روک سکے وہ شرافت نہیں بیماری ہوتی ہے، بزدلی، کمزوری اور منافقت ہوتی ہے۔"

"ہاں باؤ! جب شریفوں کو شرافت بیمار بنا دیتی ہے تو بد معاشوں کی بد معاشی ہی معاشروں کی حفاظت کرتی ہے۔"

طیف بد معاش نے چنگی بجا کر راکھ جھاڑی اور تاک آسمان کی طرف اٹھا کر منتھنوں سے دھواں اگلنے لگا۔

Kashif Azad @ OneUrdu.com



تیسرا ڈنگ

۱۹۹۱ء کی ایک روشن صبح تھی۔

ہمارے اس وقت کے سیکرٹری جنرل خارجہ اکرم ذکی دفتر میں داخل ہوئے تو باٹ لائن پر وزیراعظم کا فون آگیا۔ ”ذکی صاحب میں مری میں ہوں، اگر آپ کل فارغ ہیں تو بیچ میرے ساتھ کیجیے گا۔“ اب ظاہر ہے ذکی صاحب کے پاس تو انکار کی گنجائش ہی نہیں تھی لہذا ان کی طرف سے رضامندی کا اعلان سنتے ہی وزیراعظم نے دوسرا حکم دیا۔ ”آپ آتے ہوئے میاں صاحب کو بھی ساتھ لے آئیے گا۔“ ابھی ذکی صاحب ملاقات کا ایجنڈا معلوم کرنے کے لیے پر تول ہی رہے تھے، فون بند ہو گیا۔

دوسرے روز ذکی صاحب نے ”میاں صاحب“ کو ساتھ لیا اور مری کی طرف روانہ ہو گئے سنی بینک کے قریب میاں صاحب نے ذکی صاحب کے کان پر جھک کر پوچھا۔ ”ذکی! تمہیں اس بیچ کے ایجنڈے کا کچھ علم ہے؟“ اکرم ذکی نے سرگوشی میں جواب دیا۔ ”کچھ، کچھ“ میاں صاحب کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی اور وہ کھسک کر ذکی صاحب کے مزید نزدیک ہو گئے، اکرم ذکی نے اپنی روایتی خوش دلی سے کہا۔ ”آپ کا دوست ڈاکٹر محبوب الحق آپ کی جگہ آنا چاہتا ہے، میرا خیال ہے وزیراعظم آپ کی رائے دریافت کریں گے۔“ میاں صاحب کی آنکھیں جھجھکیں، انہوں نے گھبرائے ہوئے انداز سے اکرم ذکی کو دیکھا اور کھسک کر ان سے دور ہو گئے۔

وزیراعظم کی میز پر کھانے سے چند لمحوں قبل جب گفتگو شروع ہوئی تو نواز شریف نے سوپ کی چمکی لیتے ہوئے پوچھا۔ ”ذکی صاحب اگر خارجہ امور میاں صاحب کو دے دیئے جائیں تو آپ کے مسائل کم نہیں ہو جائیں گے؟“ ذکی صاحب نے سوپ کے پیالے میں بیچ چلاتے ہوئے گردن اثبات میں ہلا دی۔ وزیراعظم نے میاں صاحب کی طرف دیکھا، مسکرائے اور بولے۔ ”کیوں میاں صاحب آپ کی کیا رائے ہے؟“ میاں صاحب نے بیچ پیٹ میں رکھا، چمکین سے ہاتھ پونچھے اور نہایت سنجیدگی سے بولے۔ ”اگر آپ میری جگہ محبوب الحق کو لانا چاہتے ہیں تو میں چپ چاپ سازشی اور غیر محبت وطن لوگوں میں چلا جاؤں گا۔“ وزیراعظم نے قبضہ لگایا اور پیالے پر جھک گئے۔

یہ میاں صاحب ماضی کے وزیر خزانہ اور آج کے وزیر خارجہ سرتاج عزیز ہیں جو اپنی روایتی جرأت اور

منہ پر جواب دینے کی عادت سے 1991ء میں تو "سازشی اور غیر محبت وطن" لوگوں میں جانے سے بچ گئے لیکن 98ء میں کیونکہ فیصلہ ڈانٹنگ ٹیمیل کی بجائے ڈرانٹنگ روم میں ہوا تھا اور اس دوران فیصلہ کرنے والی قوتوں کے سامنے سوپ کا پیالہ بھی نہیں تھا لہذا سرتاج عزیز کو اسٹروں کی یہ مالا جھنپی ہی پڑی لیکن افسوس ڈاکٹر محبوب الحق جو 1991ء میں سرتاج عزیز کی جرأت کے باعث وزیر خزانہ نہ بن سکے۔ 98ء میں بھی سرتاج عزیز کے "سریڈر" کے باوجود اپنی حسرت پوری نہ کر سکے اور وزیر اعظم کو مجبوراً مرحوم کی جگہ ان کے شاگرد رشید حفیظ پاشا کو مٹی پڑی۔

وزارت خارجہ سے سرتاج عزیز کی نفرت آج کی بات نہیں، یہ 26 برس پرانا قصہ ہے وہ ان دنوں پلاننگ کمیشن میں جوائنٹ سیکرٹری ٹریڈ اور ڈاکٹر محبوب الحق مرحوم جوائنٹ سیکرٹری انکنامک پلاننگ ہوا کرتے تھے، ان دنوں بزرگوں میں ان دنوں دیسی ہی دوستی جیسی کوئے اور ٹیمیل میں ہوتی ہے۔ اس جنگ و جدل کے باعث سرتاج عزیز نے محاذ بدلنے کا فیصلہ کیا اور وہ نوڈ اینڈ ایگزیکٹو آرگنائزیشن (ایف اے او) سے وابستہ ہو کر روم چلے گئے جہاں انہوں نے اپنی روایتی محنت اور ان تھک کام کرنے کی صلاحیت سے ڈائریکٹر جنرل ایف اے او مسٹر بورما کا دل جیت لیا، یہ ان کی شانہ روز محنت ہی کا نتیجہ تھا کہ 1974ء میں جب ایف اے او نے "ورلڈ فوڈ کانفرنس" کے منصوبے پر کام شروع کیا تو بورما نے سرتاج عزیز کو اس کا آرگنائزر بنادیا۔ پہلی کانفرنس ہوئی تو سرتاج عزیز نے دو بڑی قراردادیں پاس کرا کر پوری دنیا میں تھلک مچا دیا، پہلی قرارداد کی روشنی میں تیسری دنیا کو قحط اور غذائی بحران سے بچانے کے لیے "ورلڈ فوڈ کونسل" تشکیل پائی جبکہ دوسری قرارداد کے نتیجے میں انٹرنیشنل فنڈ فار ایگزیکٹو ڈیولپمنٹ (آئی ایف اے ڈی) کی بنیاد پڑی جس کا کام چھوٹے ممالک کو زرعی قرضے فراہم کرنا تھا۔

امریکہ اور یورپ نے ان اداروں کی تشکیل پر کوئی اعتراض نہیں کیا کیونکہ ان کا خیال تھا سرتاج عزیز جیسے شخص کے لیے فنڈ جمع کرنا ممکن نہیں ہوگا جس کے نتیجے میں دونوں ادارے اپنی موت آپ مر جائیں گے لیکن سرتاج عزیز نے عرب ممالک اور یورپ کے ایک ہی دورے میں یہ خیال باطل ثابت کر دیا یوں ڈاکٹر محبوب الحق سے ان کے اختلافات امریکہ سرتاج دشمنی میں تبدیل ہو گئے جسے سرتاج عزیز ایک وضع داد دشمن کی طرح چھپلے 26 برس سے بھرا ہے ہیں۔

1975ء میں ایک طرف سرتاج عزیز کی شہرت کا ڈھکا پورے کرۂ ارض پر بچ رہا تھا تو دوسری طرف جمنہ تیسری دنیا کے نجات دہندہ کا ٹائٹل دیا جا رہا تھا۔ ان کی انھان سے محسوس ہوتا تھا آنے والے برسوں میں دنیا کی کوئی طاقت انہیں عالمی دانشور بننے سے نہیں روک سکتی جب ان کی یہ ٹیک نامی، حالات کو بھانپنے اور وقت کے تیور سمجھنے والے ذوالفقار علی بھٹو تک پہنچی تو انہوں نے سرتاج عزیز کو ڈائریکٹر جنرل ایف اے او کے ایکشن میں کھڑا کر دیا، اس دور میں دنیا کے ہر اخبار نویس کو ان کی کامیابی واضح دکھائی دے رہی تھی، اس کی دو

وجوہات تھیں، ایک، نیکری ہڑی جنرل ایف اے اوسید مرے (یہ مصر کے نائب صدر بھی تھے) ان کے مداح تھے، دوسری، تمام ووٹران کی مالا جپتے تھے، پوری دنیا کا میڈیا ان کے ترانے گاتا تھا لیکن بد قسمتی دیکھیے امریکہ ان کی شہرت سے خائف ہو گیا، اس نے ان کے خلاف سازش تیار کی اور پاکستان کی وزارت خارجہ میں اپنے ایجنٹوں کو اشارہ کیا۔ یہ لوگ فوراً اپنے ہی امیدوار کے خلاف کمر کس کر میدان میں آئے چنانچہ ان برادران یوسف نے ان کے ووٹ توڑنے کے لیے وہ وہ حرکتیں فرمائیں جن کے ذکر ہی سے زبان میں لکنت اور کانٹوں میں پیپ پڑ جاتی ہے۔

سرتاج عزیز ہار گئے، ملک واپس آ گئے لیکن ان کے حوصلے نہ لوٹے، انہوں نے اپنی الیکشن مہم جاری رکھی یہاں تک کہ بارہ برس بعد 1987ء میں جب وہ جوئے حکومت میں اینڈ وائزر تھے انہیں اپنی پوزیشن بحال کرنے کا موقع مل گیا لیکن عین وقت پر صاحبزادہ یعقوب خان نے یونیسکو کے ڈی جی کے الیکشن میں کاغذات جمع کرا دیئے۔ وزارت خارجہ میں اس وقت بھی امریکہ بڑا پاکستانوں کا قبضہ تھا، کچھ صاحبزادہ یعقوب علی خان کی لائیک بھی مضبوطی لہذا دفتر خارجہ نے اعلان کر دیا ”ہم بیک وقت دو امیدواروں کی انتخابی مہم نہیں چلا سکتے۔“ مینٹگ ہوئی تو اس سرتاج عزیز کو ڈراپ کر دیا گیا جس کی کامیابی کے نوے فیصد امکانات تھے اور اس یعقوب علی خان کو میدان میں اترنے کی اجازت دے دی گئی جسے اپنے ہی ملک کے وزیر اعظم کی تائید حاصل نہیں تھی لہذا پاکستان کو کوئی شکست نہ ملی۔

وہ دن اور آج کا دن، سرتاج عزیز جب بھی وزارت خارجہ گئے انہیں اس عمارت اور اس کے باسیوں کے دیے ڈھم یاد آ گئے جس کے بعد ان کے لیے آواز کی تلخی اور لہجے کی نفرت چھپانا ممکن نہ رہا۔

بہر حال آج یہ سرتاج عزیز ”عقار کل“ بن کر اسی عمارت میں آ بیٹھے ہیں جس نے ہمیشہ ان کا راستہ کاٹا، جو 25 برس تک ان کی کردار کشی کرتی رہی، جہاں سے ان پر الزامات کے گولے داغے جاتے رہے، جہاں سے انہیں انہی دھماکے کا مخالف قرار دیا گیا اور جہاں سے آج کل یہ خبریں نشر کی جا رہی ہیں ”سرتاج عزیز کو سی ٹی وی پر دستخط کرانے کے لیے وزیر خارجہ بتایا گیا۔“ لیکن اصل صورتحال یہ ہے، وزارت خارجہ میدان بن چکی ہے۔ جس میں ایک طرف کیل کانٹے سے لیس سینکڑوں امریکی ایجنٹ صف آراء ہیں اور دوسری طرف ہمارا تنہا پٹھان مجاہد کھڑا ہے جبکہ امریکہ سمیت پوری دنیا رنگ سے باہر کھڑی نتیجہ کا انتظار کر رہی ہے۔

جی ہاں محترم قارئین، اگر پاکستان نے وزارت خارجہ میں سرتاج عزیز کی موجودگی میں سی ٹی وی پر ایف ایف ایم سی ٹی پر دستخط کر دیئے تو امریکہ پٹھان مجاہد کو تیسری مات دیئے میں کامیاب ہو جائے گا، ساری محبت وطن تو تیس اس صورتحال سے پریشان ہیں لیکن میں مطمئن ہوں کیونکہ مجھے معلوم ہے ایک کمرور ایمان مومن تو شاید ایک سوراخ سے دوسری اور تیسری بار ڈسا جائے لیکن ایک پٹھان نہیں، خواہ وہ پٹھان سرتاج عزیز جیسا حلیم، سادہ اور عاجز ہی کیوں نہ ہو۔

مدینے کا شہید

پچھلے موسم سرما میں ایک نامور پاکستانی دانشور بھارت گئے، دورے کے اختتام پر ایک غیر سرکاری تنظیم نے دہلی میں ان کے اعزاز میں ایک نشست کا اہتمام کیا جس میں پاکستانی دانشور کو "خراج عقیدت" پیش کرنے کے لیے چوٹی کے بھارتی دانشور تشریف لائے، نشست کے آخر میں جب سوال و جواب کا سلسلہ شروع ہوا تو ایک ہندو دانشور نے اپنے معزز مہمان سے ایک عجیب سوال پوچھا، پوچھنے والے نے پوچھا۔ "یہاں بھارت میں تو مسلمان مساجد میں نماز ادا کرتے ہیں وہاں پاکستان میں کہاں پڑھتے ہیں؟" پاکستانی دانشور نے اس سوال کو مذاق سمجھ کر فلک شکاف قہقہہ لگایا لیکن جب انہیں محفل کی طرف سے کوئی خاص رد عمل موصول نہ ہوا تو انہوں نے کھسکا تا سما ہو کر سوالی کی طرف دیکھا، ہندو دانشور کے چہرے پر سنجیدگی کے ڈھیر لگے تھے، پاکستانی دانشور نے بے چینی سے پہلو بدل کر جواب دیا۔ "ظاہر ہے مسجدوں ہی میں پڑھتے ہیں۔" یہ جواب سن کر ہندو دانشور کھڑا ہوا، ایک نظر حاضرین پر ڈالی اور پھر مسکرا کر بولا۔ "لیکن ہماری اطلاعات کے مطابق تو پاکستانی مسجدوں میں نماز پڑھنے والوں کو کوئی مار دی جاتی ہے۔" ہندو دانشور کا یہ تبصرہ پاکستانی دانشور کو سکتہ میزائل کی طرح لگا، اس کا ہاتھ پسینے سے بھیگ گیا، ہاتھوں میں لرزہ طاری ہو گیا اور آنکھوں میں سرفی آ گئی، منتظمین موقع کی نزاکت بھانپ گئے لہذا انہوں نے فوراً نشست کے اختتام کا اعلان کر دیا یوں پاک بھارت تعلقات مزید بگڑنے سے بچ گئے۔

یہ واقعہ مجھے مرحوم حکیم سعید نے سنایا تھا، مجھے آج بھی وہ گرم سہ پہر یاد ہے جس ہمدرد و خانہ داد پلنڈی میں حکیم صاحب کے کمرے میں بیٹھا تھا، مرحوم خلاف معمول تھکے تھکے سے لگ رہے تھے میں نے ادب سے طبیعت کے اس بوجھل پن کی وجہ دریافت کی تو دل گرفتہ لہجے میں بولے "ہم نے اس دکھ سے بھارت چھوڑا تھا کہ ہمیں وہاں مذہبی آزادی حاصل نہیں تھی، ہم نماز پڑھنے جاتے تھے تو ہندو مسجدوں میں سوڑ چھوڑ دیتے تھے، خانہ خدا کے دروازے پر ڈھول پیٹتے تھے، بول و براز کی تھیلیاں ہمارے اوپر بھینکتے تھے، ہندو شر پسند کچلی صفوں میں کھڑے نمازیوں کو چھرے گھونپ کر بھاگ جاتے تھے، ہم نے سوچا چلو پاکستان چلتے ہیں وہاں کم از کم ہمارے سجدے تو آزاد ہوں، ہماری مسجدیں، ہماری درگاہیں تو محفوظ ہوں گی لیکن افسوس آج

مسلم گارڈز کے پہرے کے بغیر پاکستان کی کسی مسجد میں نماز کا تصور تک نہیں، مجھے میرے بڑے بھائی حکیم عبدالحمید دہلی سے لکھتے ہیں، مسجد واپس آ جاؤ، پاکستان کے حالات ٹھیک نہیں، یہاں، ادھر کم از کم مسجدیں تو محفوظ ہیں۔ لیکن میں۔۔۔ ان کی آواز اکٹری گئی۔

”پاکستان آنے پر آپ کو کبھی بچھتا ہوا؟“ میں نے نرمی سے پوچھا۔ ”انہوں نے انجمن کے مبن سہلائے نہیں، ہرگز نہیں، یہ سوراہم نے خود کیا تھا، حمید بھائی میرے اس فیصلے سے خوش نہیں تھے، ان کی خواہش تھی میں دہلی ہی میں ان کا ہاتھ بناؤں لیکن مجھے لفظ پاکستان سے عشق تھا لہذا ادھر چلا آیا، اللہ تعالیٰ نے کرم کیا اور وہ ادارہ جس کی بنیاد میں نے بارہ روپے سے رکھی تھی آج پاکستان کے چند بڑے اداروں میں شمار ہوتا ہے، یہ سب پاکستان سے عشق کا کمال ہے۔“ ان کی آواز میں بدستور ملال تھا۔ ”لیکن پاکستان کے حالات سے دکھ تو ہوتا ہوگا؟“ میں نے اپنے سوال پر اصرار کیا۔ ”ہاں، بہت ہوتا ہے، اخبار پڑھتا ہوں، سیاستدانوں کے حالات دیکھتا ہوں، عوام کی دگرگوں صورتحال پر نظر پڑتی ہے تو بہت دکھ ہوتا ہے، جب ادھر دہلی سے کوئی عزیز رشتے دار پاکستان آ کر کہتا ہے، کیوں پھر تو دل پر چھری سی چل جاتی ہے، لیکن کیا کریں، گھر جیسا بھی ہے، ہے تو اپنا، ہم اسے چھوڑ تو نہیں سکتے، لہذا لگے ہوئے ہیں اور لگے رہیں گے آخری سانس تک۔۔۔“

”کوئی ایسی خواہش جس کا آپ نے آج تک کسی کے سامنے اظہار نہیں کیا؟“ انہوں نے کچھ دیر تک سوچا۔ ”ہاں، کبھی کبھی جی چاہتا ہے میری موت حمید بھائی سے پہلے ہو، وہ میرے جنازے پر آئیں، میرے چہرے سے چادر سر کا کر دیکھیں اور پھر آہستہ سے مسکرا کر کہیں ”ہاں سعید تمہارا فیصلہ درست تھا۔“

وہ گرم دوپہر ڈھل گئی تو اس کے بلن سے آج کی تنک اور غمناک صبح طلوع ہوئی، میرے سامنے میز پر آج کے اخبار بکھرے پڑے ہیں، ہر اخبار کی پیشانی کے ساتھ آج کے سب سے بڑے انسان کی تصویر چھپی ہے، خون میں نہائی اور حسرت میں ڈوبی ہوئی تصویر جو ہر نظر سے جیج جیج کر ایک ہی سوال کر رہی ہے۔ ”میرا جرم کیا تھا، مجھے کیوں مارا گیا، میں تو زخموں پر مر رہا رکھنے والا فیصل تھا پھر میرے جسم کو زخم کیوں بنا دیا گیا۔“ میرا دماغ سنگی کلکیوں کی طرح جھنجھنے لگا، میں نے سوچا، یہ تصویر آج دہلی کے کسی اخبار میں بھی چھپی ہوگی، وہ اخبار بھر دھڑکے کے ایک چھوٹے سے فریاد کمرے میں بھی پہنچا ہوگا، چٹائی پر بیٹھے بیسی (82) برس کے ایک بوڑھے نے بھی اسے اٹھایا ہوگا، اس کی آنکھیں بھی ہزاروں لاکھوں لوگوں کی طرح چٹک چڑی ہوں گی، اس نے بھی شدت جذبات سے اخبار پرے پھینک دیا ہوگا، اس نے بھی بازو پر دانت جما کر جیج ماری ہو گی، اس نے بھی اپنی چھاتی پر ہاتھ مارا ہوگا، اس نے بھی چلا چلا کر کہا ہوگا۔ ”سعید تمہارا فیصلہ غلط تھا، مجھے دیکھو 82 برس کے اس بوڑھے کو دیکھو، یہ بغیر محافظ کے مسجد جاتا ہے، پیدل مطلب پہنچتا ہے، روز صبح شام کافروں کے درمیان چہل قدمی کرتا ہے لیکن اس پر کبھی کوئی گولی نہیں چلی، اس کا کبھی کسی نے راستہ نہیں روکا۔“ ہاں اس 82 برس کے کمزور بوڑھے نے چلا چلا کر کہا ہوگا۔ ”سعید میں کربلا میں زندہ رہا تم دینے میں مارے گئے۔“

نقب زن

میں گوروں کا بہت احترام کرتا تھا لیکن برطانیہ کی سابق وزیراعظم مارگریٹ تھیچر نے یہ انکشاف کر کے مجھے تو بالکل ہی مایوس کر دیا کہ 10 ڈاؤننگ سٹریٹ (برطانیہ کا وزیراعظم ہاؤس، وزیراعظم سیکرٹریٹ) میں صرف 70 افراد پورے برطانیہ کا نظام چلا رہے ہیں۔

سز تھیچر کا کہنا ہے: ”10 - ڈاؤننگ سٹریٹ آفس کم اور گھر زیادہ تھا، جہاں ہم 70 افراد ایک خاندان کی طرح رہتے تھے۔ میری مصروفیات اتنی زیادہ تھیں کہ مجھے نہیں یاد میں کبھی 4 گھنٹے سے زیادہ سوئی ہوں، میرے آفس کے لیے وزیراعظم کے لیے ایک چھوٹا سا فلیٹ تھا۔ اس تک پہنچنے کے لیے کوئی الٹ نہیں تھی، لہذا مجھے سیز جیوں کے ذریعے ہی آنا جانا پڑتا تھا۔ لیکن اس کا ایک فائدہ تھا کہ اس طرح اس اوپر نیچے آنے جانے سے میری امیجی خاصی ورزش ہو جاتی تھی، کچھ فلیٹ بھی چھوٹا سا تھا، دوسرا اس کی صفائی کے لیے وقت نہ ہونے کے باعث مزید چھوٹا محسوس ہوتا تھا، ویسے عام حالات میں مجھے اس کے مختصر ہونے کا احساس نہیں ہوتا تھا، لیکن جب کوئی مہمان آ جاتا تو مجھے اخبارات، فائلیں اور کاغذات سمیٹ کر اس کے لیے جگہ بناتے ہوئے بڑی شرمندگی ہوتی۔“

تھیچر کہتی ہیں: ”میں اور میرا خاندان اس فلیٹ (وزیراعظم ہاؤس) میں اکیلے رہتے تھے، نوکر ہمارے پاس تھا نہیں، لہذا سارا کام ہمیں خود کرنا پڑتا تھا۔ دوپہر کو جب بھوک سے بری طرح بے حال ہو جاتی تو بھانگی ہوئی اوپر فلیٹ میں جاتی، لٹچ تیار کرتی اور ”فائف“ کھا کر نیچے آ جاتی۔ رات کو گیارہ بجے جب تمام ساتھی اپنے گھروں کو لوٹ جاتے تو میں تھکاوٹ سے چورسیر جیوں کی ریٹنگ پر ہاتھ رکھ کر آہستہ آہستہ اوپر فلیٹ تک آتی جہاں ڈش (تھیچر کا خاوند) میرا منتظر ہوتا۔ پھر ہم لوگ کچن میں مصروف ہو جاتے، کھانا تیار کرتے، کھاتے اور پھر میں تازہ دم ہو کر دوبارہ فائلوں میں کھو جاتی۔ جب کبھی ہمارے ذاتی مہمان آتے تو میں اپنے پولیٹیکل سیکرٹری کو بھی اوپر ہی بلا لیتی، وہ کمال محبت کرتے اور میرے ساتھ کچن ہی میں کھڑے ہو جاتے۔ میں مہمانوں کے لیے کھانا تیار کرتی، ان سے گپ شپ کرتی اور ساتھ ساتھ پولیٹیکل سیکرٹری کی مدد سے امور سلطنت بھی انجام دیتی۔ ویسے تو مجھے اس مصروفیت کے بہت سے فوائد حاصل ہوئے، جن میں سب سے بڑا فائدہ اپنے

لوگوں، اپنے ملک کی خدمت تھا، لیکن مجھے اس کا ایک نقصان بھی اٹھانا پڑا اور وہ تھا اپنے خاندان سے کٹ کر رہنا۔ آپ یقین کریں میری فلفلسفہ میں مقیم اپنے خاندان سے دنوں نہیں، مہینوں نہیں، بلکہ سالوں میں کہیں ایک آدھ بار ملاقات ہوتی تھی۔ جب کبھی پچھلی رات کے سنانے میں مجھے اپنے یاد آتے تو میں سوچتی میں کتنی بد نصیب ہوں۔ میرے پیارے چند میل کے فاصلے پر ہیں، لیکن میں انہیں سال بھر سے نہیں ملی تو میری آنکھوں میں آنسو آ جاتے، لیکن میں انہیں فوراً پونچھ دیتی کیونکہ مجھے معلوم تھا، برطانوی شہری کمزور لیڈروں سے محبت نہیں کرتے۔

تھمپس کا کہنا ہے: "۷۰ افراد کے گھلے میں چند ڈپٹی کلرک، کچھ پریس آفیسر، گارڈن رومز گرلز، پارلیمنٹری سیکشن کے کچھ لوگ، خطوط کی سریاں بنانے والے آفیسر، چرچ کے معاملات دیکھنے والے چند لوگ، پولیٹیکل آفیسرز، پالیسی یونٹ کے افراد اور پیغام رساں (چیز اسی) شامل تھے۔ ہم لوگوں پر نہ صرف پورے برطانیہ کا نظام چلانے کی ذمہ داری تھی بلکہ دنیا بھر میں برطانوی ایجنسی کی حفاظت اور تھرو ورلڈ کی ترقی کا خیال رکھنا بھی ہمارا ہی کام تھا۔ عملہ بہت ہی کم اور کام بہت ہی تھا کہ دینے والا تھا، لہذا ہم لوگ دن رات مصروف رہتے تھے۔ مجھے کبھی کبھی وائٹ ہاؤس اور جرمن چانسلری پر بوزارٹک آتا تھا، جہاں بالترتیب ۳۰۰ اور ۵۰۰ افراد یہی کام کرتے تھے، لیکن ہم نے تو اپنی چادر دیکھ کر ہی پاؤں پھیلانے ہیں نا، ہوا اس مختصر سے گھلے سے ہی کام چلانا پڑا، جو میں نے چلایا۔"

تھمپس کا دعویٰ ہے: "مجھے پہلے میں ۳۰ سے ۷۰ ہزار تک خطوط موصول ہوتے تھے جو خطوط والے سیکشن سے ہو کر مجھ تک پہنچتے ان میں سے ایک بھی ایسا خط نہیں ہوتا تھا، جسے میں ردی کی نوکری میں بھیجنے کی جرات کر سکتی۔ چنانچہ خطوط کو پڑھنا، ان میں دیئے گئے نکات پر غور اور پھر ان پر حکم جاری کرنے سے قبل برطانوی آئین اور قانون کے تقاضوں کو مد نظر رکھنا بڑا کڑا مرحلہ ہوتا تھا، لیکن کرنا تھا سو کیا۔"

تھمپس نے بتایا: "۱۰۔ ڈاؤننگ سٹریٹ میں سب سے اہم عہدہ پرنسپل سیکرٹری کا ہوتا ہے جبکہ اس کے بعد پریس سیکرٹری ہوتا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ اس کی معمولی سی غلطی سے پریس وزیراعظم اور اس کی پارٹی کی دھجیاں بکھیر سکتا ہے۔ میں جب ۱۰۔ ڈاؤننگ سٹریٹ میں داخل ہوئی تو مجھے معلوم ہوا، وہاں کے پریس سیکرٹری ہرنارڈ رنگ بیگم کا تعلق ہماری حریف سیاسی جماعت لیبر پارٹی سے ہے اور وہ نظریاتی طور پر سمری جماعت کنزرویٹو پارٹی کا اتنا ہی مخالف ہے جتنا ایک لیبر پارٹی کا کارکن ہو سکتا ہے، لیکن پیشہ ورانہ سطح پر اس سے اچھا پریس سیکرٹری پورے برطانیہ میں نہیں تھا لہذا میں نے اسے اس کی جگہ سے نہیں ہلایا۔ وہ جب فارغ وقت میں میرے ساتھ بحث کرتا تھا تو مجھے اس کے نظریات سے لیبر پارٹی کے مشہور کارکنوں کی بولتی تھی، لیکن جب وہ ڈیلیک پرنسٹنٹا تو اس وقت وہ گریٹ برٹن کا انتہائی محب وطن آفیسر ہوتا اور مجھے یہ بھی یقین تھا جب کبھی میں نے انکسٹنٹا لڑا ہر بار تو میرے مخالف امیدوار ہی کو ووٹ دے گا، لیکن بحیثیت

وزیر اعظم وہ میری ذمہ داریوں کی مدت کے دوران ایک مجلس ساجھی کی طرح میرا ساتھ دیتا رہے گا اور اس نے ایسا ہی کیا۔"

ہاں محترم قارئین، میں گوروں کا بہت احترام کرتا تھا لیکن برطانیہ کی سابق وزیر اعظم مارگریٹ تھیچر نے یہ انکشاف کر کے مجھے تو بالکل ہی مایوس کر دیا کہ ۱۔ ڈاؤننگ سٹریٹ میں صرف ۷۷ افراد پورے برطانیہ کا نظام چلا رہے ہیں۔

میں سوچتا ہوں۔ یہ ملک، یہ میرا ملک، پاک سرزمین شاد باد، گرین برٹن سے بڑی سلطنت ہے اور اس کا وزیر مارگریٹ تھیچر اور ٹونی بلیر سے بڑا وزیر اعظم ہے کہ اس کے تصرف میں سینکڑوں ایکڑ پر پھیلا وزیر اعظم ہاؤس، چھ منزلہ عظیم الشان سیکرٹریٹ اور ڈیڑھ دو ہزار کا محلہ ہے لیکن اس کو پوچھنے والا کوئی نہیں؟ میں جب سوچتا ہوں سلطنتوں کی امارت اور غربت کا پیمانہ کیا ہوتا ہے؟ تو جواب آتا ہے جن ملکوں کے حکمران غریب ہوتے ہیں، وہ ملک امیر ہوتے ہیں لیکن جن ملکوں کے حکمران فرعون بن کر ایمان میں داخل ہوتے ہیں اور قارون بن کر باہر نکلتے ہیں، وہ ملک غریب ہوتے ہیں۔

سیانے کہتے ہیں امیر چوکیدار، چوکیدار نہیں نقب زن ہوا کرتے ہیں۔

(نوٹ: اس کالم کے لیے تمام معلومات مارگریٹ تھیچر کی خود نوشت "ڈی ڈاؤننگ ایئرز" سے لی گئیں۔)

Rashid Azad @ OneUrdu.com



احتجاج نہ احتساب

جی ہاں، جب میں نے عرض کیا، امیر چوکیدار، چوکیدار نہیں نقب زن ہوتا ہے تو بے شمار دوستوں نے خطوط اور ٹیلی فون کے ذریعے پوچھا، کیا ساری جدید دنیا کے تمام صدور اور وزرائے اعظم کی طرز معاشرت ۱۰ ڈاؤننگ سٹریٹ جیسی ہی ہے؟ کیا تمام امیر ممالک کے حکمران برطانوی وزیراعظم ہی کی طرح ”سنجوسی“ کی زندگی گزار رہے ہیں؟ تو یقین فرمائیں، جوں جوں یہ سوالات میرے دماغ سے گزرتے گئے، مجھے جدید دنیا کے بڑے بڑے حکمرانوں کی ذاتی زندگی کی بے شمار محرمات، کیاں اور ”گمزوریاں“ یاد آتی رہیں۔

مجھے فیلڈ مارشل عسکری یاد آیا، جنگ عظیم دوم کا سپریم کمانڈر، جس کی کمان میں اتحادیوں کی فوج نے نازیوں کی پچھلی سولی آگے بھجوا دی، جس کے انکسارات نے جاپان بھی عکاسی عکاسی کو گورے سپاہیوں کے قدموں میں سرخوں ہونے پر مجبور کر دیا اور جس کی جنگی حکمت عملی آج بھی دنیا بھر کے عسکری افسران کا حصہ ہے، جب یہ جہول رہنا نہ ہوا تو اس کے پاس رہنے کے لیے ایک قلیت تک نہیں تھا، وہ کبھی کرائے پر اس گلی میں رہتا اور کبھی مالک مکان سے لڑ بھگڑ کر کسی دوسری جگہ جا ٹھکانہ بناتا، جب یہ نقل مکانی اذیت دینے لگی تو وہ وزیراعظم کے پاس گیا، ملک کے آئینی سربراہ نے ۱۰ ڈاؤننگ سٹریٹ کے گیٹ پر دنیا کے عظیم سپہ سالار کا استقبال کیا، اسے نہایت عزت و احترام سے دفتر لایا، کرسی پر بٹھایا اور خود احترام اس کے سامنے کھڑا رہا، چند فکروں کے تبادلے کے بعد وزیراعظم نے تکلیف کرنے کی وجہ پوچھی تو فیلڈ مارشل نے بریف کیس کھول کر ایک درخواست وزیراعظم کے سامنے رکھ دی، وزیراعظم نے ٹیبل لیپ چلایا، چشمہ ناک پر درست کیا اور درخواست پڑھنا شروع کر دی، درخواست میں فیلڈ مارشل نے دوسری جنگ عظیم میں اپنے کارنامے گنوانے کے بعد حکومت سے درخواست کی میرے پاس رہنے کے لیے گھر نہیں ہے، بہت بوڑھا ہو چکا ہوں، ہار پار گھر نہیں بدل سکتا، مہنگائی بھی بہت ہے، کرایہ نہیں دے سکتا، لہذا مہربانی فرما کر مجھے ایک قلیت یا زرعی زمین کا ایک ٹکڑا الاٹ کر دیا جائے، وزیراعظم نے چشمہ اتارا، ٹیبل لیپ بھجایا اور بڑے احترام سے بولا: ”سر، اس میں کوئی شک نہیں دوسری جنگ عظیم میں آپ کی خدمات پوری دنیا کے لیے قابل احترام ہیں، اس میں بھی کوئی شک نہیں دنیا میں اس وقت تک آپ کے پائے کا کوئی جرنیل نہیں، لیکن سر، آپ زندگی بھر اپنی خدمات کا معاوضہ لیتے رہے ہیں،

گریٹ برٹن نے کبھی آپ کی تنخواہ لیٹ نہیں کی اور سر اگر اس کو بھی فراموش کر دیا جائے تو بھی پرائم منسٹر آف گریٹ برٹن کے پاس ایسا کوئی اختیار نہیں، جس کے ذریعے وہ سریم کمانڈر کو ایک فلیٹ الاٹ کر سکے، آئی ایم سووری سر" ساتھ ہی وزیراعظم نے ایڑھیاں بجا کیں اور بوڑھے لیلڈ مارشل کو سارٹ ساسلیوٹ پیش کر دیا۔

مجھے گولڈہ مائیر یاد آگئی۔ اسرائیل کی وزیراعظم گولڈہ مائیر، جس نے چند پہاڑیاں، تھوڑے سے غجر جنٹیل میدانوں اور دنیا میں بکھرے چند لاکھ لوگوں کو دنیا کی سب سے بڑی اقتصادی قوت بنا دیا، ۷۳ء کی "یوم کپور جنگ" سے پہلے جب ایک امریکی سینئر (جو کانگریس کی کمیٹی آف آرڈر کا سربراہ بھی تھا) اس سے ملنے اسرائیل آیا تو اسے سیدھا گولڈہ مائیر کی رہائش گاہ پر لے جایا گیا، جہاں امریکی سینئر ایک عام سی گھریلو خاتون کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ خاتون نے سینئر کا استقبال کیا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے سیدھی کچن میں لے گئی، جہاں اسے چھوٹی سی ڈائننگ ٹیبل پر بٹھا دیا گیا، گولڈہ مائیر نے سفارتی گفتگو کے آغاز کے ساتھ ہی چولہے پر چائے کے لیے پانی رکھ دیا، پھر ٹیبل پر آ بیٹھی اور امریکی سینئر سے جہازوں اور ایم ۱۶ کا سودا شروع ہو گیا۔ بھانڈاؤ اور ابتدائی شرائط پر گفتگو کے دوران ہی گولڈہ مائیر چپکے سے اٹھی اور پیالیوں میں چائے بھر کر لے آئی۔ ایک کپ امریکی سینئر کے سامنے رکھا اور دوسرے میٹ پر کھڑے امریکی کارڈز کو پکڑا آئی۔ گفتگو پھر شروع ہوئی، شرائط طے پانے لگیں، اسی دوران اس نے پیالیاں سمیٹیں اور نوئی کھول کر انہیں دھونے لگی۔ دوبارہ ٹیبل پر بیٹھی اور امریکی سینئر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "مجھے یہ سودا منظور ہے، آپ تحریری معاہدے کے لیے اپنا سیکرٹری میرے سیکرٹری کے پاس بھجوا دیجئے۔"

مجھے سوئزر لینڈ کا صدر آیا، ہمارے ضیا جالندھری ایک سنور سے خریداری کر رہے تھے، اچانک ان کے دوست نے انہیں کہنی چھو کر کہا: "ضیا تم اس شخص کو دیکھ رہے ہو؟" جالندھری صاحب نے چونک کر سامنے دیکھا، وہاں ایک بوڑھا گورا مختلف رنگس سے چھوٹی چھوٹی چیزیں جن رہا تھا، ضیا صاحب نے دوست کی طرف استہنامی نظروں سے دیکھا تو دوست سرگوشی میں بولا "سوال مت کرو، بس اسے دیکھتے جاؤ۔" ضیا جالندھری صاحب دوبارہ مڑے، غور سے بوڑھے کی حرکات و سکنات نوٹ کرنے لگے۔ بوڑھا پورے سنور میں گھوما، چھوٹی چھوٹی چیزیں جمع کیں، کاؤنٹر پر جا کر بل بنوایا، بریف کیس کھولا، ساری چیزیں اندر رکھ کر اسے تالا لگایا اور سیل میں کو سلام کر کے باہر نکل گیا، سڑک پر پہنچ کر وہ رکا، اس نے اوور کوٹ کے کارٹھائے اور انہیں کانوں پر لپیٹ کر آہستہ آہستہ فٹ پاتھ پر چلتے لگا۔ جب وہ اسی طرح چلتے چلتے نظروں سے اوجھل ہو گیا تو ضیا جالندھری صاحب نے دوست سے پوچھا: "ہاں، اب بتاؤ یہ کون تھا اور اس پر نظر رکھنا کیوں ضروری تھی؟" دوست مسکرایا اور پھر سرگوشی میں بولا: "یہ بوڑھا گورا سوئزر لینڈ کا صدر ہے۔" ضیا صاحب نے حیرت سے پوچھا: "لیکن پروٹوکول کی گاڑیاں کہاں ہیں؟" دوست مسکرا کر بولا: "پروٹوکول کی گاڑیاں تو جیں ایک طرف، اس کے پاس تو اپنی گاڑی تک نہیں یہ پیدل دفتر آتا ہے اور پیدل ہی واپس جاتا ہے۔"

مجھے سوئڈن کا "اولف پالنے" یاد آیا، ہمارے الطاف گوہر جب "ساؤتھ" کے ایئر پورٹ تھے تو اس کا انٹرویو کرنے گئے۔ دوران گفتگو ٹیچ کا وقت ہو گیا، اولف نے الطاف گوہر صاحب کو کھانے کی دعوت دی، گوہر صاحب مان گئے۔ وہ کرسی سے اٹھا اور انہیں ڈائننگ ہال میں لے گیا، جہاں ایک عام سی میز اور چند بے ترتیب کرسیاں پڑی تھیں۔ اس نے الطاف گوہر صاحب کو بٹھایا، الماری کھولی، اپنا فن کیرئیر کھول کر "سائن" پلیٹ میں ڈالا اور پلیٹ نرے میں رکھ کر الطاف گوہر صاحب کے سامنے رکھ دی۔ دوسرے ڈبے سے چند سلائس اور سلاڈ کے چند ککڑے بھی نکال کر ٹیبل پر سجادیے اور پھر مسکرا کر بولا: "ایئر میز شروع کرو۔"

مجھے اندرا گاندھی یاد آگئی، ہمارے شیم قریبی صاحب (پاسٹ ہیں، بنارس یونیورسٹی سے پاسزری میں ایم اے کر رکھا ہے، شہر و خاندان سے بڑی دوستی تھی) جب اس سے ملنے وزیراعظم ہاؤس گئے تو وزیراعظم "بھوجن" کر رہی تھی، قریبی صاحب کو سیدھا ڈائننگ ٹیبل پر لے جایا گیا، ایک عام سی میز تھی، جس پر پلاسٹک کی سستی سی شیٹ پڑی تھی، میز پر چینی کی درمیانے درجے کی پلیٹوں میں ابلے چاول، مسور کی وال اور ملی جلی سبزی تھی، شیشے کے دیسی گلاس اور تختہ پانی کا ایک سستا سا جگ تھا، اوپر پرانے "زمانے" کا پنکھا چل رہا تھا، وزیراعظم کے اشارے پر ایک ملازم نے قریبی صاحب کے سامنے چینی کی پلیٹ رکھ دی۔

مجھے لوک سہا کا منظر یاد آگیا، یہ گہوال کی حکومت کے خاتمے کا منظر تھا، میں نے دور روشن پر دیکھا امریکہ تک کو لٹکارنے والی جمہوریت اور دنیا کے چند بڑے صنعتی ممالک میں شمار ہونے والے ملک کے نمائندے بچوں پر بیٹھے تھے، ایوان کی چھتوں پر جالے لٹک رہے تھے اوپر لمبے لمبے راڈوں پر تقسیم ہند سے قبل کے جہازی ساز کے چنگے جھول رہے تھے۔

مجھے گور باچوف یاد آگیا، جسے ایوان اقتدار سے فراغت کے بعد ماسکو میں فلیٹ نہیں مل رہا تھا، ہاں۔ مجھے بہت سے غریب لوگ یاد آگئے، جو امیر ممالک کے غریب چوکیدار تھے اور جنہیں عوام نے اپنی حفاظت اور اپنے نظام کی حفاظت کے لیے ایوانوں میں بھیجا تھا۔

ہاں، قارئین کرام میں آپ سے پھر سوال کرتا ہوں، اتنے بڑے بڑے گورنر ہاؤسز، وزیراعظم ہاؤس، ایوان صدر، پارلیمنٹ ہاؤس اور پرائمری سیکرٹریٹ کی موجودگی میں اس ملک کو غریب کہا جاسکتا ہے؟ اور اگر یہ غریب ہے تو پھر حکمران طبقے کو اس عیاشی پر نوکے والا کوئی نہیں؟ خدا کی قسم اگر صرف وزیراعظم ہاؤس اور ایوان صدر کی ایک روز کی بجلی بچائی جائے تو پندی بھنیاں جیسے نصف درجن قصبوں کے پورے ماہ کے بل ادا کیے جاسکتے ہیں۔

لیکن انفس، اس ملک میں کوئی احتجاج کرنے والا بچا ہے نہ ہی احتساب کرنے والا۔



پاک سوسائٹی
711
DEC-2010

پرائم منسٹر سیکرٹریٹ

قمر بھٹی کا دعویٰ ہے پاکستان برطانیہ سے کہیں زیادہ جدید، امیر اور خوشحال ہے..... لیکن مختصر یہ ہے، آگے چلنے سے قبل قمر بھٹی کا تعارف بھی ضروری ہے۔ قمر کے والدین گوجر خان کے ایک پسماندہ گاؤں کے رہنے والے ہیں۔ اچھے وقتوں میں برطانیہ چلے گئے تھے جہاں بڑے بھٹی صاحب نے دن رات محنت کر کے نہ صرف اپنا کاروبار سیٹ کر لیا بلکہ سوسائٹی میں اپنا ایک مقام بھی پیدا کر لیا۔ قمر بھٹی کی ساری پرورش برطانیہ کے آزاد ماحول میں ہوئی۔ تعلیم وہیں پائی، زندگی گزارنے کے سارے آداب وہیں سے سیکھے۔ جب بڑا ہوا تو والدین سے دو چیزیں ورثے میں ملیں۔ ایک جمنا جھاپا کاروبار اور دوسری گوجر خانی پنجابی۔ قمر بھٹی ایک عرصے بعد اور یز پاکستان کا ڈیپارٹمنٹ کے کنونشن میں شرکت کے لیے پاکستان آیا۔ یہاں دھچکا پانچ سو "غیر ملکی" پاکستانیوں کے ہمراہ اس نے کنونشن منسٹر، وزیراعظم سیکرٹریٹ (نیا تعمیر شدہ)، پارلیمنٹ ہاؤس، شاہراہ دستور، دامن کوہ اور دو فورا اور فائینو سٹار ہوٹل دیکھے۔ سڑکوں پر رواں دواں گاڑیاں اور شاہانگ منسٹروں میں خریداری کرتی بیگمات دیکھیں، دروازوں تک پیکے ریسٹورنٹ اور سڑکوں تک پھیلی دکانیں ملاحظہ کیس، سرکاری ملازمین کو بیسوں میں ہاتھ ڈال کر نوٹوں کے بنڈل نکالتے اور پھر بغیر گنے کاؤنٹر پر پھینکتے دیکھا تو حیرت سے اس کا منہ کھل گیا۔

اس نے سوپ کی "سپ" لی اور فینکین کے کونے سے ہونٹوں کے کنارے صاف کرتے ہوئے کہا "یقین کریں میں نے لیبر پارٹی کے ایڈوائزر کی حیثیت سے پورا برطانیہ دیکھا، ایک ایک گونہ، ایک ایک گلی دیکھی، لیکن خدا کی قسم گوروں کے پورے دیس میں اسلام آباد کنونشن منسٹر جیسی ایک بھی سرکاری عمارت نہیں اور نہ ہی مستقبل میں ایسی شاندار عمارت بننے کا امکان ہے کیونکہ برطانیہ کی کوئی بھی حکمران جماعت اتنی فضول خرچی کے بعد پھر ایک سو سال تک الگیشن نہیں لڑ سکتی۔ آپ یقین فرمائیں، جس شاہی محل کی شہرت پوری دنیا میں پھیلی ہے، میں نے اسے اندر سے دیکھا ہے، لیکن وہ ہمارے پارلیمنٹ ہاؤس کا کسی بھی محلے سے مقابلہ نہیں کر سکتا، پرائم منسٹر سیکرٹریٹ، تو یقین کیجیے گا دنیا کے "بازھے ہادشاہ" کے پرائم منسٹر سیکرٹریٹ کی آپ کے جدید مغلیائی سیکرٹریٹ کے سامنے وہی حیثیت ہے جو گاؤں کے چودھری کے سامنے کسی "کمی" کی ہوتی

ہے۔ آپ ۱۰۔ ڈاؤننگ سٹریٹ "جائیں آپ کو نگہبانی کا ایک بھداسا دروازہ ملے گا۔ آپ اس کے اندر داخل ہوں سامنے "کیبنٹ ہال" ہے جس میں بمشکل پچاس افراد کے بیٹھنے کی گنجائش ہے۔ اس کے گرد دو چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں جن میں صوفے لگے ہیں، اس سے اوپر (دوسری منزل) وزیراعظم کا آفس ہے، معمولی سا کمرہ جس میں ایک دفتری میز، ایک بڑی کرسی اور چند چھوٹی کرسیاں ہیں، کمرے میں ایک تولیے، چند فائلوں اور ایک آدھ تصویر کے سوا کوئی قابل ذکر چیز نہیں۔ اس آفس کے باہر وزیراعظم کے محلے کے چند دفتر ہیں، ایک کیبنٹ سیکرٹری کا دفتر، ایک پرنسپل سیکرٹری اور اس کے سیکرٹری کا دفتر اور ایک پروٹوکول افسر کا دفتر اور بس۔ تیسری منزل "وزیراعظم ہاؤس" ہے جہاں وزیراعظم اپنی فیملی کے ساتھ اپنی آگینی مدت پوری کرتا ہے، یہ وہ بیڈروم کی معمولی سی رہائش گاہ ہے جس میں کوئی خانسامان، کوئی بٹلر اور کوئی چونکیدار نہیں، مگر کے تمام کام خاتون اول کرتی ہے جبکہ دروازہ کھولنا اور بند کرنا وزیراعظم کی ذمہ داری ہوتی ہے، سرکاری خدمات کی بجائے آوری کے بعد مسز نوٹی بلینر اور مسز بلینر سر جوڑ کر گھر چلانے کے لئے "ڈسکس" کرتے ہیں۔ ذاتی دوستوں سے ملنے کے لیے اپنی پرانی کار میں جاتے ہیں، خریداری کے لیے سیل کے میزوں کا انتخاب کرتے ہیں اور مہمان کی آمد پر دونوں میاں بیوی "اب کیا کریں" کی کھس پھس بھی کرتے ہیں۔ لیکن آپ کا وزیراعظم سیکرٹریٹ، اللہ معاف کرے، اگر مسز بلینر اس کی ایک جھلک بھی دیکھ لے تو شاید بیہوش ہو جائے، چھ منزلہ عظیم مقامی عمارت جس میں ایک وسیع بیکنگ ہال، کانفرنس ہال، کیبنٹ میٹنگ ہال، پورے فلور پر وزیراعظم کا آفس، سیکرٹریز کے لیے شاہانہ دفاتر اور تہہ بنائے کیا گیا ہے۔ ہم لوگ برطانیہ میں ایسی عمارت "افورڈ" نہیں کر سکتے۔" اس نے فیکٹن سے دوبارہ ہونٹ صاف کیے، میں نے قہقہہ لگایا اور پھر سرگوشی میں کہا: "شاہانہ عمارت کے باوجود، ہم نے وزیراعظم کی رہائش کے لیے ایک الگ محل بنا رکھا ہے، جس کی حفاظت کے لیے اڑھائی تین سو نوک ملازم ہیں۔" "اوہ" "قمر کے منہ سے نکلا اور اس کی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔

ہمارے دوست ملک اکرم کو وائٹ ہاؤس کی "زیارت" کا موقع ملا تو انہوں نے واپس آکر تمام دوست جمع کیے اور انہیں یہ بتا کر حیران کر دیا کہ دنیا کے دارالحکومت "وائٹ ہاؤس" میں پوری دنیا کے "بادشاہ" کے تصرف میں صرف دو کمرے ہیں۔ "اول آفس" جس کا مجموعی رقبہ اڑھائی سو فٹ سے زیادہ نہیں ہوگا، اس میں چڑا ہی تک نہیں، دنیا کا صدر مہمان کے لیے خود دروازہ کھولتا ہے، پردے کھینچتا ہے اور فائلیں تلاش کرتا ہے، آفس کے ساتھ ہی میٹنگ ہال ہے، جس میں ایک لمبی میز کے ساتھ دو تین درجن کرسیاں رکھی ہیں، پھر صدر کے ذاتی محلے کے چند دفاتر ہیں، یہ چھوٹے چھوٹے کمرے ہیں، جن میں آسائش نام کی کوئی چیز نہیں اور باقی وائٹ ہاؤس ایک عرصے سے عجیب گھر قرار دیا جا چکا ہے جہاں دنیا بھر کے سیاح ٹکٹ لے کر داخل ہوتے ہیں اور مختلف کمروں میں گھوم پھر کر امریکی روایات کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ ملک اکرم نے گائیڈ سے اس "واردات" کی وجہ پوچھی تو اس نے کندھے اچکا کر کہا "مجبوری مائی ڈیئر" وائٹ ہاؤس کی مین ٹینس کے

اخراجات بہت زیادہ تھے، جنہیں پورا کرنے کے لیے حکومت کو مجبور اس کا ایک بڑا حصہ میوزیم ڈیپلکٹر کرنا پڑا۔
 "کیا امریکی خزانہ اپنے اہوان صدر کے اخراجات پورے نہیں کر سکتا؟" ملک اکرم نے حیرت سے پوچھا۔
 "ہاں خزانے میں اس فضول خرچی کی کوئی گنجائش نہیں" کانیز نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
 "کیوں کیا امریکہ ایک غریب ملک ہے؟" ملک اکرم کی تحقیقاتی حسیں جاگ اٹھی تھیں۔ "میں غریب تو نہیں
 لیکن امریکی شہری حکومت کو اپنی ملاح و بہبود کے لیے ٹیکس دیتے ہیں، وائٹ ہاؤس کی تزئین و آرائش کے لیے
 نہیں۔ چلیں دفع کریں، آئیے میں آپ کو امریکی صدر کو کام کرتے ہوئے دکھاتا ہوں" اور پھر کانیز اپنے
 سیاحوں کو ایک ایسے زاویے پر لے گیا جہاں ششے کی دیوار کی دوسری جانب صدر ٹیل لیپ کی روشنی میں ایک
 فائل کا مطالعہ کر رہا تھا۔

میرا ایک سفارتکار دوست آسٹریلیا سے واپس آیا تو اس نے ایک عجیب واقعہ سنایا، کہنے لگا: "ہم
 پاکستان سے آنے والے مہمانوں کو ایک بوسیدہ سی عمارت کے احاطے میں لے جاتے تھے، جہاز جھنکار سے
 اٹھتے، کانٹوں سے بچتے بچاتے اور اونچے نیچے راستوں سے ٹھڈے کھاتے ہوئے جب ہم قدیم دور کی اس
 عمارت کے قریب پہنچتے تھے تو ششے سے آنکھیں لگا کر مہمان سے کہتے سامنے دیکھو، مہمان غور سے دیکھتا تو
 معمولی سے درجے کے ڈرائنگ روم میں ایک بوڑھے کو آتش دان میں لگنیاں برکتے اور ایک بوڑھا کو آرام چیئر
 پر سویر بنے پاتا، پھر حیرت سے واپس مڑ کر استفہامی نظروں سے پوچھتا، یہ کون ہیں؟ ہم مسکرا کر کہتے آسٹریلیا
 کی منتخب حکومت کا آئینی سربراہ اور خاتون اول، تو وہ اچھل کر دو قدم پیچھے آگرتا۔

میاں محمود جب جنرل ضیا کے ساتھ جاپان گئے تو جاپانی وزیر اعظم کو ایک معمولی سے کمرے میں
 معمولی سی میز پر بیٹھے پایا۔ میز کے ایک کونے پر شیش کے چھوٹے سے راز پر جاپان کا جھنڈا لگا تھا جبکہ میز پر
 لٹھے کا ایک معمولی سا میز پوش بچھا تھا۔ دنیا کی سب سے بڑی انڈسٹریل سٹیٹ کے آئینی سربراہ نے اسی میز پر
 بیٹھے بیٹھے جنرل ضیا اور ان کے وفد کا استقبال کیا، اسی میز پر ان سے گفتگو کی اور اسی میز پر اربوں ڈالر کے
 کھجوتوں پر دستخط کیے۔ اسی دورے کے دوران جب پاکستان کی ایک بڑی شخصیت نے وزیر اعظم ہاؤس دیکھنے
 پر اصرار کیا تو میزبان انہیں ایک کھنڈر میں لے گئے، پتھروں کو دیمک کھا چکی تھی، دروازے ٹوٹ کر قبضوں پر
 جمول رہے تھے، چھتیس فٹک رہی تھیں، سیٹن فرش کی ٹانگیں توڑ کر اوپر آچکی تھیں اور دیواروں کا پسترا اینٹوں کا
 ساتھ چھوڑ چکا تھا۔ حیرت زدہ مہمان نے میزبان سے پوچھا "کیا واقعی یہی وزیر اعظم ہاؤس ہے؟" میزبان
 نے مسکرا کر جواب دیا۔ "ہاں بڑا کیسی لٹنسی، یہی ہمارا وزیر اعظم ہاؤس ہے۔" "مگر یہ تو بھوت بنگلہ ہے۔"
 مہمان نے خوف سے پوچھا۔ "ہوا کرے، ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں کیونکہ ہم نے جنگ عظیم دوم کے بعد
 فیصلہ کیا تھا کہ جب تک پورا جاپان قیصر نہیں ہو جاتا وزیر اعظم ہاؤس میں سفیدی ہوگی اور نہ ہی کوئی اینٹ لگائی
 جائے گی۔" میزبان دوبارہ مسکرایا۔

سوئڈن کی ایک فرام میں جب ہمارے ایک دوست نے کہنی سے اپنے بوڑھے ہم سفر کو دوسری طرف دھکیلا تو میزبان نے سرگوشی میں کہا۔ "یار بے چارے کو تنگ مت کرو یہ ہمارا وزیر داخلہ ہے۔" دوست نے چونک کر دیکھا بوڑھا ایک کونے میں سٹ کر معذرت خواہانہ انداز سے انہیں دیکھ رہا تھا۔ ادھر تاروے میں جب میزبان کی گاڑی خراب ہوئی تو اس نے ایمر جنسی لائسنس آن کر دیں دو منٹ بعد فلپک والی ایک گاڑی قریب آ کر رکی۔ اس میں سے ایک مسکراتا ہوا چہرہ اترا، مسئلہ پوچھا اور پھر میزبان کو گاڑی میں بیٹھنے کی ہدایت کر کے خود خراب گاڑی کو دھکا لگانے لگا، آدھے گھنٹے کی مشقت کے بعد جب گاڑی سٹارٹ ہوئی تو دھکا لگانے والے کے کپڑے، ہاتھ اور منہ بری طرح گندے ہو چکے تھے، ایک گھومٹر بعد میزبان نے کیسٹ پیسیر کی آواز نیچی کی اور مہمان سے پوچھا، تم اس شخص کو جانتے ہو؟ مہمان نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔ "یہ تاروے کا وزیراعظم ہے۔ اس کو بے چارے کو اب اپنی ذاتی جیب سے کپڑے دھلوانے پڑیں گے۔"



Kashif Azad @ OneUrdu.com

کاش یہ سوئڈن ہوتا

۱۹۶۱ء میں اس وقت کے نوجوان وزیر ذوالفقار علی بھٹو ادا لینے کے لیے سوئڈن گئے، پاکستانی وفد مقررہ وقت پر سینٹگ روم پہنچ گیا لیکن سوئڈش وزیراعظم اولف پالے غائب تھے، جب بھٹو صاحب کو انتظار کرتے ہوئے پورے پانچ منٹ گزر گئے تو انہوں نے اس زیادتی پر پروٹوکول آفسر سے احتجاج کیا، ابھی آفسر کسی مناسب جواب کے لیے پر تول رہا تھا، دروازہ کھلا اور اولف پالے اس شان سے ہاتھتے ہوئے اندر داخل ہوئے کہ ان کے بال بکھرے تھے، مائی ڈیوٹی ہو کر ٹنگ رہی تھی اور ماتھے پر پسینے کے قطرے چمک رہے تھے، میزبان وزیراعظم نے آتے ہی مہمانوں سے کہا ”میں تاخیر سے آنے پر معذرت خواہ ہوں، میں نے دراصل ایٹمی بیوی کو کہیں ڈراپ کرنا تھا، اس ”ڈیوٹی“ سے فارغ ہو کر واپس پہنچا تو آپ لوگوں کی گاڑیوں کی وجہ سے پارکنگ میں جگہ نہیں تھی لہذا گاڑی دو میل پیچھے کھڑی کر کے وہاں سے بھاگتا ہوا یہاں پہنچا، معافی، معافی۔“

ملاقات کے بعد جب بھٹو صاحب ہوٹل واپس پہنچے تو انہوں نے وفد میں شامل ایک سینئر سفارتکار سے پوچھا۔ ”مسٹر بیک میرا خیال ہے اولف پالے اس واقعے کے ذریعے ہمیں کچھ سمجھانا چاہتے تھے۔“ من پھٹ سفارتکار نے فوراً جواب دیا۔ ”جی ہاں معزز وزیر اولف یہ کہنا چاہتے تھے آپ لوگ ۶۷ افراد کے وفد کے ساتھ جس ملک میں امداد لینے آئے ہیں اس کے تو وزیراعظم ہی کو پارکنگ میں جگہ نہیں ملتی۔“ بھٹو نے سادگی سے پوچھا۔ ”ایسا کیوں ہوتا ہے؟“ سفارتکار نے جواب دیا۔ ”سراسر اس لیے کہ یہ پاکستان نہیں سوئڈن ہے۔“

میرا خیال ہے اگر ہم پاکستان کی بجائے سوئڈن کے شہری ہوتے تو ہم نواز شریف کے اس بیان ”وفد میں ۱۲۰ نہیں صرف ۵۱ افراد شامل تھے“ کے بعد بھی حکومت سے سینکڑوں سوال پوچھ سکتے تھے۔ مثلاً ہم پوچھ سکتے تھے ”جناب ان ۵۱ افراد کے علاوہ جو ۶۹ دانشور، نیوروکریٹ، سفارتکار اور صحافی وزیراعظم کے پہنچنے سے پہلے ہی امریکہ میں خیمہ زن ہو چکے تھے، وہاں کس ملک کی ”خدمت“ کے لیے گئے تھے، ان کے قیام و طعام، فنائی، بری اور بحری سفر کے اخراجات کس نے ادا کیے، ہم پوچھ سکتے تھے، جب اوول آفس میں وزیراعظم کے ساتھ صرف پانچ حضرات (شہباز شریف، اسحاق ڈار، سرتاج عزیز، شمشاد احمد اور ریاض کھوکھر) بائیسکے تھے تو پھر اپنے ساتھ ۵۱ سالار لے جانے کی کیا ضرورت تھی، ہم پوچھ سکتے تھے، جب اس دورے کے لیے ۱۵ افراد ضروری تھے تو پھر تین دستوں میں ۱۲۰ افراد امریکہ منتقل کیوں کیے گئے، ہم پوچھ سکتے تھے اس

سیکرٹری کی اہلیہ اور اس کے لندن میں بیٹے کی امریکہ میں کیا ضرورت پڑ گئی تھی جسے آخری وقت میں وفد کا حصہ بنایا گیا تھا، ہم پوچھ سکتے تھے، اس ورلڈ وزٹ (جس میں امریکی صدر کوئی بڑی کنفٹ نہیں دیتا، مہمان وزیر اعظم کو وائٹ ہاؤس میں گارڈ آف آنر نہیں دی جاتی، صدر مہمان کو ڈنر نہیں دیتا، وائٹ ہاؤس کے دروازے پر اس کا استقبال نہیں کرتا) سٹیٹ وزٹ بنا کر کیوں پیش کیا گیا؟

اگر یہ سوئڈن ہوتا تو ہم لوگ پوچھ سکتے تھے "جناب اس دورے پر ایک ملین ڈالر کی خلیہ رقم کس کی اجازت سے خرچ کی گئی، پلی آئی اسے کا ایک ہزارہ دس روز تک امریکہ میں کھڑا کرنے کی کیا ضرورت تھی، جس کے اب اڑھائی کروڑ روپے بطور لینڈنگ چارج ادا کیے جائیں گے، ۴۰ ڈالر (۴۴ سو روپے تقریباً) فی گھنٹہ پر تین روز کے لیے ۵۰ لیموزین کرائے پر کیوں لی گئیں۔ وفد کے ارکان نے معمولی سی تکلیف برداشت کر کے ان لیموزینز پر خرچ ہونے والے ۴ لاکھ ۴۰ ہزار روپے کیوں نہیں بچالے اور کرائے کے نیلی کاپڑوں پر نیا گرافال جانے کی کیا ضرورت تھی؟"

اگر یہ سوئڈن ہوتا تو ہم لوگ پوچھ سکتے تھے "جناب لندن میں اتوار کی رات گیارہ بجے پاکستانی ہائی کمشنر کو گالیاں کیوں دی گئی تھیں، اسے وفاقی وزراء کے لیے فائونٹین ہول کی بجائے فورسٹار کا انتظام کرنے پر سخت ست کیوں کہا گیا تھا، کس کی اجازت سے سر تاج عزیز، عابدہ حسین، نوٹ علی شاہ، چوہدری ثار علی، فخر امام، شمشاد احمد اور حاجی باز گل کو مارہلی آرچ کے فورسٹار کیمپ لینڈ سے پاک لین کے فائونٹین ہول منتقل کیا گیا اور ان فورسٹار اور فائونٹین ہولوں کے کرائے کس کی جیب سے ادا کیے گئے؟"

اگر یہ سوئڈن ہوتا تو ہم لوگ پوچھ سکتے تھے، ہمارے وفاقی وزراء، سفارتکار اور بیوروکریٹ امریکہ اور لندن میں پاکستانیوں سے منہ کیوں چھپاتے پھر رہے تھے، وہ اتنے بڑے وفد، شاہی اخراجات اور قیمتی گاڑیوں کے بارے میں جواب دینے سے کیوں کتر رہے تھے، جناب اسحاق ڈار نے لندن کی پریس کانفرنس میں چڑ کر کیوں کہا تھا "پچھلی حکومت تو مراٹھوں اور ڈانٹروں کو بھی ووروں میں شامل کر لیتی تھی۔" وفاقی وزیر خزانہ اس شخص پر کیوں چڑھ دوڑے تھے جس نے سینکڑوں افراد کی موجودگی میں کہہ دیا تھا۔ "جناب آپ بھی تو اپنے ساتھ میراثی ہی لے کر آئے ہیں۔"

اگر یہ سوئڈن ہوتا تو یقیناً ہمارے وزیر اعظم کو بھی اپنی گاڑی دو میل پیچھے کھڑی کرنا پڑتی، انہیں بھی وہاں سے ہماگ کر میننگ روم آنا پڑتا، انہیں بھی عام فکانتوں پر اکالوئی کلاس میں ستر کرنا پڑتا، انہیں بھی سفارتخانوں کی معمولی گاڑیوں پر وائٹ ہاؤس جانا پڑتا، انہیں بھی نیا گرافال دیکھنے کے لیے وائی جیب سے ٹریوٹوں، نمروں اور ٹیکسیوں میں ستر کرنا پڑتا، انہیں بھی دس روزہ دورے کے لیے آٹھ چھٹیاں لینا پڑتیں۔

ہاں اگر یہ سوئڈن ہوتا تو آج دنیا ہمیں ایسی قوم نہ کہہ رہی ہوتی جو مانگے کی شراب بھی ہیرے جڑے پیالوں میں پیتی ہے۔

اگر یہ سوئڈن ہوتا! کاش یہ سوئڈن ہوتا!

شیشے کی دوکان میں ہاتھی

رٹ سمیری گینڈ (Ritt Bjeregaard) ڈنمارک کی خاتون وزیر تھیں، وہ ایک بین الاقوامی کانفرنس میں شرکت کے لیے جیس گئیں، کانفرنس ختم ہوئی تو ڈنمارک کے ایک اخبار نے رٹ کے سرکاری خرچ پر ہوٹل میں ٹھہرنے کی خبر شائع کر دی، بس خبر چھپنے کی دیر تھی ڈینش عوام سڑکوں پر آ گئے، رٹ کے خلاف جلوس شروع ہو گئے، اس کے پتلے جلنے لگے، یہ عوامی رد عمل اس قدر شدید تھا کہ ڈنمارک کی حکومت کو اس کا فوراً نوٹس لینا پڑا، رٹ کو چارج شیٹ کر دیا گیا جس کے جواب میں خاتون وزیر نے موقف اختیار کیا ”کانفرنس ہال ڈینش ایسیسی سے بہت دور تھا، میں بہت علیل تھی، میرے لیے دن میں دو تین بار ہال تک آنا جانا ممکن نہیں تھا لہذا میں نے مجبوراً کانفرنس ہال کے نزدیک ایک دوسرے دو بجے کے ہوٹل کا ایک معمولی سا کمرہ لے لیا جس کا کرایہ میں نے سرکاری خزانے سے نہیں بلکہ اپنے پی اے ڈی اے سے ادا کیا“ گورٹ کے موقف میں بڑی جان تھی لیکن اس کے باوجود قوم نے انہیں معاف کرنے سے انکار کر دیا چنانچہ وہ نہ صرف مستعفی ہو گئیں بلکہ انہیں ہمیشہ کے لیے سیاست سے بھی عائب ہونا پڑا۔

مجھے یہ واقعہ ایک سفارتی تقریب میں ڈنمارک کے ایک سفارتکار نے سنایا تھا جب وہ رٹ کی کہانی سنا چکے تو میں نے حیرت سے پوچھا ”اتنی معمولی سی بات پر اتنی کڑی سزا“ سفارتکار نے گرجوٹی سے جواب دیا ”آپ شاید ڈنمارک کی سفارتی روایات سے واقف نہیں، ڈینش حکومتی عہدیداروں کو دوروں کے دوران ہوٹلوں میں ٹھہرنے کی اجازت نہیں دیتے۔“ میں نے پریشان ہو کر پوچھا ”پھر وہ کہاں ٹھہرتے ہیں؟“ اس نے اس جوش سے جواب دیا ”ڈنمارک کی ایسیسی 11 میں، سفیروں کے سرکاری گھروں پر یا پھر میزبان ملک کی فراہم کردہ رہائش گاہوں میں۔“ مجھے اس بات پر یقین نہ آیا لہذا میں نے انہیں مزید کریدنے کے لیے پوچھا ”لیکن رٹ کے غدر میں تو بڑا وزن تھا۔“ سفارتکار نے مسکرا کر پلٹ میز پر رکھ دی اور نشو سے منہ صاف کر کے بولا ”بات مجبوری یا غدر کی نہیں، بات یہ بھی نہیں رٹ نے ہوٹل کا بل کہاں سے ادا کیا تھا، بات صرف روایت کی ہے اور روایت یہ کہتی ہے ڈینش عوام اپنے کسی نمائندے کو غیر ملک کے کسی ہوٹل میں برداشت نہیں کرتے اور رٹ نے اس روایت کی خلاف ورزی کی تھی چنانچہ اسے مستعفی ہونا پڑا۔“

سفارتکار کا استدلال میرے سینے پر برہمی کی طرح لگا، میرا جی چاہا میں اس کا دامن پکڑ کر کہوں، میرے دوست تم لوگ کتنے کم ظرف ہو اپنے نمائندوں کی اتنی چھوٹی غلطیاں معاف نہیں کرتے، ہمارے طرف دیکھو، ہم کتنے وسیع القلب ہیں، گزشتہ پچاس برسوں میں ہمارے "رٹوں" نے ۱۱ ہزار غیر ملکی دورے کیے، ہر دورے پر لاکھوں، کروڑوں روپے خرچ ہوئے، وفد کا ہر رکن فائینسٹار ہوئی میں ٹھہرا، ہر شخص نے تین تین بار ناشتہ کیا لیکن ہم نے آج تک کسی "رٹ" کو روک کر نہیں پوچھا۔ "جناب آپ یہ ڈالر کس کی اجازت سے خرچ کرتے رہے۔ کیا آپ کو اس عیاشی کا استحقاق حاصل تھا۔"

میرا جی چاہا میں اس کا دامن پکڑ کر کہوں میرے دوست دیکھو، وسیع القلب لوگ ایسے ہوتے ہیں پچھلے ایک برس میں ہماری اعلیٰ شخصیات نے ہماری وفد کے ساتھ ۳۷ غیر ملکی دورے کیے، ان میں وزیر اعظم کی معیت میں ۲۲ اور وزیر خارجہ کی قیادت میں ۲۲ "لشکر" باہر گئے لیکن ہم نے کسی "رٹ" سے نہیں پوچھا۔ "جناب آپ لوگوں نے ڈیڑھ لاکھ روپے کے دوروزہ دورے پر دو ملین ڈالر (اس وقت ۹ کروڑ روپے) کیوں خرچ کیے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ کانفرنس ہال میں صرف پانچ افراد جاسکتے ہیں آپ چھ درجن "ماہرین" اپنے ساتھ کیوں لے کر گئے، آپ کو سات گاڑیوں کی ضرورت تھی لیکن آپ نے آٹھ سو فرانک (اس وقت ۲۳ ہزار روپے) فی گاڑی کے حساب سے ۲۸ گاڑیاں کرائے پر کیوں لیں، یہ جانتے ہوئے بھی کہ یورپ کے تین وزرائے اعظم کانفرنس میں شرکت کے لیے فریئر پر سوئٹزر لینڈ آ رہے ہیں، آپ جہاز بھر کر کیوں روانہ ہوئے، یہ جانتے ہوئے بھی کہ ۹۰ فیصد سربراہان مملکت اپنے سفارت خانوں، ریٹ ہاؤسز اور دوست احباب کے فیئلس میں قیام کریں گے، آپ نے اپنا "بحری بیڑا" فائینسٹار ہوٹلوں میں لشکر انداز کیوں کیا۔

میرا جی چاہا میں اس کا دامن پکڑ کر کہوں میرے دوست دیکھو وسیع القلب لوگ ایسے ہوتے ہیں، ہمارے "رٹ" امداد کے لیے جھین جانے لگے تو "سواریاں" زیادہ ہو گئیں، فیصلہ ہوا اس باری ۱۳۰ کی بجائے بونگ ۱۳۱۰ ٹیر بس ہی لے جاتے ہیں، حکم جاری ہوا، پی آئی اے کا ایک طیارہ روک لیا جائے، حکم کی تعمیل ہوگئی ۲۲ لاکھ روپے (وزیر اطلاعات کا دعویٰ تھا ۲۲ نہیں صرف ۳ لاکھ روپے خرچ ہوئے) سے اس کی تزئین و آرائش کی گئی جب عوامی جہاز "شاہی سواری" کے قابل ہو گیا تو تب کہیں جا کر دوسو "رٹوں" کا لشکر اس ملک کی طرف روانہ ہوا جہاں آج بھی وزراء سائیکوں پر دفتر جاتے ہیں، جب یہ لوگ "بھالی توت" کے قدیم چینی نسخوں سے لدے پھدے واپس لوٹے تو ۳۱۰ کو "ورلڈ ٹیر ٹریک" سے الگ ہوئے چند رھواں روز تھا، ان ۱۵ ایام میں قوم کو زیادہ نقصان نہیں اٹھانا پڑا بس قومی ایئر لائن ان ۱۰ کروڑ روپے سے محروم ہوگئی جو وہ اس طیارے کے ذریعے کما سکتی تھی۔

میرا جی چاہا میں اس کا دامن پکڑ کر کہوں، میرے دوست دیکھو وسیع القلب لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کی آنکھوں کے سامنے "رٹوں" کا ایک اور لشکر کشن کا شکر یہ ادا کرنے امریکہ روانہ ہوا جہاں فائینسٹار ہوٹلوں

کے صاف ستھرے چمکدار کمرے، برقی رفتار سرسبز گازیاں اور ٹیلی ویزیو روٹینوں والے چمکنے فرش ان کے منتظر ہیں، ہم لوگ جانتے ہیں وہاں کیا ہوگا، اس دورے کے کیا نتائج برآمد ہوں گے، لیکن اس کے باوجود ہم لوگ سڑکوں پر نہیں آئیں گے، جلوس نہیں نکلیں گے، پتے نہیں چلیں گے کیونکہ ہم ہی وہ لوگ ہیں جو شیشے کی دکان میں ہاتھی بٹھا کر امن، ترقی اور خوشحالی کے خواب دیکھتے ہیں۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

مینڈل سن شرمندہ تھا

۱۹۹۶ء کی بھارتی، برطانیہ کی لیبر پارٹی کا مشہور لیڈر پیئر مینڈل سن اپنی سی سیاسی جماعت کے ایک ادب جی راہنما جفری راہن سن کے گھر گیا، باتوں ہی باتوں میں جدید طرز تعمیر کا کردار چل نکلا، مینڈل سن نے راہن سن کے عالیشان گھر پر نظر دوڑائی اور پھر بڑی حسرت سے بولا "اتنا ہی شاندار گھر میرا بھی خواب تھا لیکن....." مینڈل سن خاموش ہو گیا، راہن سن نے کروٹ بدل کر پوچھا "لیکن؟" مینڈل سن نے بھرائی آواز میں جواب دیا "لیکن میں افورڈ نہیں کر سکتا۔" مینڈل سن کا یہ فقرہ سن کر راہن سن نے قہقہہ لگایا اور اسے آسان شرائط پر قرضے کی پیشکش کر دی، راہن سن کی آفر اس قدر شاندار اور برجستہ تھی کہ مینڈل سن نے بلا سوچے سمجھے ہاں کر دی، چنانچہ اگلے دوڑ دوڑوں دوست شہر گئے اور چند ٹھکانوں کی جستجو کے بعد ٹریڈنگ ٹونک مل ایریا (Trendy notting hill area) میں ایک شاندار مکان پسند کر لیا، ۳ لاکھ ۷۳ ہزار پونڈ میں سودا ہوا جو راہن سن نے اسی وقت ادا کر دیئے۔

مئی ۱۹۹۷ء میں برطانیہ میں الیکشن ہوئے، عوام میں پیئر مینڈل سن کی سادگی اور مقبولیت کے باعث لیبر پارٹی نے "لینڈ سلائیڈ وکٹری" حاصل کر لی جس کے نتیجے میں ٹونی بلیر وزیر اعظم بن گیا جبکہ پیئر مینڈل سن وزیر صنعت و تجارت اور جفری راہن سن خزانہ کا نائب وزیر ہو گیا، ٹونی بلیر نے وزیر اعظم کی حیثیت سے اپنی پہلی تقریر میں اعلان کیا "ہماری حکومت اتنی پاکیزہ ہوگی کہ پاکیزگی بھی اس پر رشک کرے گی۔" آنے والے دنوں میں بلیر نے اپنی پالیسیوں اور بعض غیر معمولی اقدامات سے اپنا یہ دعویٰ جج کر دکھایا، یہ سب بھی مینڈل سن کا مہون منت تھا کیونکہ وہ نہ صرف عوام میں مقبول تھا بلکہ تمام وزراء سے بھی ذہن تھا۔

۱۹۹۸ء کے وسط میں مینڈل سن کی وزارت نے جفری راہن سن کے ۴۱ شہ جات کی پڑتال کی جس کی رپورٹ پر وزیر نے قاعدے کے مطابق دستخط کر دیئے، بات ختم ہو گئی لیکن دسمبر ۱۹۹۸ء کے شروع میں لندن کے ایک اخبار کو کسی ذریعے سے مینڈل سن کے خفیہ قرضے کی خبر ہو گئی اخبار کے رپورٹر نے تحقیق کے بعد ۲۱ دسمبر ۱۹۹۸ء کو "مینڈل سن، راہن سن ڈیل" کی خبر شائع کر دی، بس چھپنے کی دیر تھی، برطانیہ کے حکومتی ایوانوں میں زلزلہ آ گیا، دو پہر تک مارکیٹ میں پونڈ امریکی ڈالر اور جرمن مارک کے مقابلے میں خشک پتے کی طرح کاہنے

لکایوں محسوس ہوتا تھا برطانوی معیشت ہی جھنڈ جائے گی، لوگ باہر آگئے، اخبارات نے معمول کی خبریں روک کر مینڈل سن سینکڈل پر خصوصی ٹیمے شائع کرنا شروع کر دیے۔

اسی شام ایوان کا بجلی اجلاس ہوا جس میں خاتون ممبر الزبتھ فیلکن نے مینڈل سن کے بچے ادیجر دیئے، مینڈل سن کا موقف تھا "یہ میرا ذاتی قرض تھا جس میں ذرا برابر بھی حکومتی اثر و رسوخ استعمال نہیں ہوا۔" فیلکن کا کہنا تھا "یہ درست ہے اس قرض سے کسی برطانوی قانون پر زنجیریں پڑی لیکن الیکشن کے دوران جب اثاثہ جات کی فہرست تیار ہوئی تو مینڈل سن نے اس قرض کا اس میں ذکر کیوں نہیں کیا۔ مزید جب رابن سن کے اثاثہ جات کی پڑتال ہو رہی تھی تو مینڈل سن کیوں خاموش رہا لہذا یہ دونوں "جرم" کسی بھی طرح قابل معافی نہیں۔" ایوان کے زیادہ تر ارکان نے الزبتھ فیلکن کے موقف کی تائید کی۔

فیلکن کی جرح ۲۲ اور ۲۳ دسمبر کے اخبارات میں شائع ہوئی جس نے مینڈل سن کے خلاف عوامی نفرت کو بھانپنا دیا، اس روز سیاسی تجزیہ نگاروں کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اگر اس سینکڈل پر بروقت قابو نہ پایا گیا تو شاید چند دنوں میں مینڈل سن کے ساتھ ساری حکومت ہی روزانہ ہو جائے لہذا ۲۳ دسمبر ہی کے روز برطانیہ کے مقبول ترین لیڈر پیٹر مینڈل سن نے یہ کہہ کر استعفیٰ دے دیا "ہم نے اعلان کیا تھا ہماری حکومت اتنی پاکیزہ ہوگی کہ اس پر پاکیزگی بھی رشک کرے گی لیکن انیسویں صدی میں اس دعویٰ پر پورا نہ اتر سکا لہذا مجھے اب حکومت میں رہنے کا کوئی حق نہیں، میں مستعفی ہونے کا اعلان کرتا ہوں۔" میٹوئی پبلشر نے دیکھی دل کے ساتھ اس کا استعفیٰ منظور کر لیا ٹھیک ۳ گھنٹے بعد قرض دینے والا جیمز رابن سن بھی مستعفی ہو گیا، جب دونوں رہنما ۱۰- ڈاوننگ سٹریٹ سے باہر آ رہے تھے تو ان کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وزیر اعظم ہاؤس کے سامنے کھڑے لوگ ان سیاستدانوں کا دکھ سمجھ سکتے تھے کیونکہ وہ جانتے تھے اب برطانوی سیاست کے دروازے ان دونوں پر ہمیشہ کے لیے بند ہو چکے ہیں۔

مجھے ان لوگوں کی آبروروشن سے اتفاق نہیں کیونکہ میرا خیال ہے مینڈل سن کی آنکھوں میں اقتدار چھوڑنے پر آنسو نہیں تھے بلکہ وہ پاکستان کی بجائے برطانیہ میں پیدا ہونے پر دل گرفتہ تھا کیونکہ وہ جانتا تھا اگر وہ پاکستان میں ہوتا تو قرض لینے اور قرض چھپانے کے "جرم" میں آج یوں رسوا نہ ہو رہا ہوتا، وہ ۵۵ لاکھ پونڈ کے خفیہ اکاؤنٹ کے اعتراف کے بعد بھی آفتاب شیر پاؤ کی طرح بدستور چھپڑ پارٹی کا سینکڈل کماٹہ ہوتا، وہ بھی ۱۹ غیر ملکی خفیہ اکاؤنٹس اور ۱۸ پوشیدہ جائیدادوں کے ثبوتوں کے باوجود بے نظیر بھٹو کی طرح اپوزیشن لیڈر ہوتا، وہ بھی ڈیزل ارب ڈالر کے خفیہ اکاؤنٹ (اس کے ثبوت معروف قانون دان اکرم شیخ کے پاس ہیں) کے باوجود "شیر پنجاب" ہوتا، وہ بھی آسٹریلیا میں فارمز اور گوریا میں خفیہ فیکٹریوں کے باوجود مضبوط ترین وزیر ہوتا، وہ بھی لندن، واشنگٹن اور اوٹاروا میں پوشیدہ فرموں کے کھلے رازوں کے باوجود سر پر ڈگ اوزھ کر پھر رہا ہوتا، وہ جانتا تھا اگر وہ پاکستان میں ہوتا تو کوئی انگلی اس کی طرف نہ اٹھتی وہ ہر روز اڑھائی سال بعد منتخب ہو کر آتا۔

لوقا، دم لینے کے لیے چلا جاتا اور پھر لوٹنے کے لیے آ جاتا۔ شیٹ بنک کی طرف سے نادہندہ قرار دیئے جانے کے باوجود اس کی مضبوط کرسی پر کوئی لرزہ طاری نہ ہوتا، اس کا کوئی بال تک ہلکا نہ کر سکتا، اسے کوئی پکڑ نہ سکتا، اسے کوئی سزا نہ دے سکتا۔

بس مینڈل سن اپنی اس غلطی پر تادم تھا، پاکستانی نہ ہونے پر شرمندہ تھا۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

بنیاد سے اکھڑی قومیں

کیا آسمان سے نولے تارے اور بنیاد سے اکھڑی قوموں کے لیے واپسی کا کوئی راستہ ہوتا ہے؟ میں نے گردن گھمائی اور میرے سامنے مٹی کی مکی دیواروں، ٹین کی چھتوں، ٹاٹ کے دروازوں اور دور دور تک پھیلے بوسیدہ خیموں کا ایک وسیع شہر تھا۔ میں نے دیکھا وہاں غربت، مسافرت، مظلومیت اور بے مقصدیت کے ڈھیر لگے تھے۔ کسی چہرے پر گزرے وقت کی خوشحالی، حال کا عزم اور مستقبل کی روشنی نہیں تھی اور جب ان تنگ گلیوں سے ہوا گزرتی تو گھٹے سڑتے گوشت کی بدبو، نولے خوابوں کی چیخیں اور تاسف کا احساس بھی ساتھ لے کر چلتی اور سورج جب اس خوابیدہ بستی سے طلوع ہوتا تو مسافروں کے کل کی زردی اس کے چہرے پر چڑھی ہوتی اور جب شام کی رنگیں نکھرتیں تو رات کی سیاہی کچھ زیادہ ہی سیاہ نظر آتی۔

”شاہ جی! یہ لوگ کب سے یہاں ہیں؟“ میں نے اپنے ہمراہی سے پوچھا۔ ”افغان وار شروع ہوتے ہی یہاں آ گئے تھے۔“ ہمراہی نے تاسف کا گہرا کھونٹ بھرا۔ ”ہاں!“ میں نے سوچا یہ دکھ کئی نسلوں پر محیط ہے ایک نسل جب اپنے وطن سے چلی تو راستے میں جگہ جگہ اپنی ہڈیاں دفن کرتی آئی۔ دوسری نسل نے یہاں خیمے گاڑے اور واپسی کا راستہ کھلنے کا انتظار کرنے لگی۔ تیسری نسل پیٹ کا دوزخ بھرنے کے لیے پورے پاکستان میں پھیل گئی۔ اجنبیوں کے بوٹ پالش کیے، مٹی ڈھوئی، مٹی کے بننے اور چنے بیچے، قبوہ خانے بنائے، بھنوں، کارخانوں اور کھیتوں میں بیچاری، برتن مانجھے، جھاڑو دیے، ٹاکی لگائی اور جیومی نسل، ہاں اس نے آنکھ کھولی تو اس کا کوئی وطن نہیں تھا، قوم؟ افغان، جائے پیدائش؟ مہاجر کھپ پشاور، زبان فارسی/ پشتو۔ کہاں کے رہنے والے ہو؟ کہیں کے بھی نہیں۔ تعلیم؟ جہالت، پیشہ؟ سارے حرام، جائز۔ یہ نسل پچھلے پندرہ سو برس سے مسلسل پیدا ہو رہی ہے۔ ہر روز ان میں دو تین ہزار کا اضافہ ہو جاتا ہے۔“

”یہ سب افغانستان کے دوسرے درجے کے شہری ہیں؟“ میں نے اپنے ہمراہی سے پوچھا۔ ”جی نہیں ان میں اکثریت اعلیٰ طبقے کی ہے۔“ ہمراہی نے اوپر بستی کی پریشانی پر جھکے زرد سورج پر نظریں گاڑ کر کہا۔ ”ان میں اکثر اپنے اپنے علاقوں کے چودھری، ملک، خان، میاں، محسن، زرداری، لغاری، مزاری، جتوئی، گیلانی، قریشی اور بھٹو تھے۔ وہ دیکھیں بغیر استری لٹھے کے رومال جیسے چہرے والا وہ بوڑھا افغان، جس کے بدبودار

لباس نے کبھی صابن کا ذائقہ نہیں چکھا، جس کی پیچھے گرم بستر اور نرم گدے کا گداز بھول چکی ہے اور جس کے دسترخوان پر روٹی کم اور ہاتھ زیادہ ہوتے ہیں، کابل کا امیر ترین شخص تھا۔ اس کے کھیتوں میں رزق اور اس کے باغوں میں ذائقہ آگتا تھا اور اس کے محل میں آسائش، فراوانی اور خوشحالی کا دریا بہتا تھا، لیکن اب وہ بچھلے بارہ برس سے فٹ پاتھوں پر خشک سوے بیٹھا ہے اور یہ بچہ جنوری کے آخری دنوں میں جس کے پاؤں میں جوتا نہیں، میل سے جس کی پوشاک چار تار ہو چکی ہے اور جس نے ایک عرصے سے منہ نہیں دھویا اور جو ہر صبح آنکھ میں مظلومیت بھر کر رزق کی تلاش میں گھر سے نکلتا ہے اور رات کو چند روپوں کی بھیک لے کر واپس لوٹ آتا ہے، افغانستان کی مرحوم پارلیمنٹ کے ایک رکن کا پوتا ہے اور وہ عورت ہنس کی نوکریاں بناتے جس کے ہاتھ قیرہ ہو چکے ہیں، جس کے سفید ہال وقت کی میل سے چپکٹ ہیں اور جو پردہ داری تو رہی ایک طرف ستر پوشی تک کے احساس سے غافل ہو چکی ہے، شہید افغانستان کے ایک مقتول وزیر کی بیوہ ہے۔ ہاں "میرا ہی آہ بھر کر بولا "یہ مظلوم اپنے اپنے وقت کے فرعون تھے۔"

"کیا ان میں عام لوگ بھی ہیں۔" میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

"ہاں، ان میں عام لوگ بھی ہیں لیکن ان کی شناخت ممکن نہیں کہ گھروں سے نکلنے کے بعد خاص اور

عام ایک ہو جاتے ہیں، سب میا جھو جاتے ہیں۔"

"یہ لوگ واپس کیوں نہیں جاتے؟" میرا ہی نے قہقہہ لگایا اور مجھے مستحراث نظروں سے دیکھ کر بولا۔

"یہ اپنے وقت کا سب سے بڑا بے وقوفانہ سوال ہے، شاید تم نہیں جانتے، جس بستی سے ایک بار موت گزر

جائے وہاں زندگی کو نمونہ کے لیے صدیاں درکار ہوتی ہیں، جن کھیتوں میں ایک بار بارود کے ڈھیر لگ جائیں

وہاں برسوں تک صرف اور صرف موت آگتی ہے اور جن راستوں پر ایک بار توپ کا زور دی جائے ان پر واپسی کا

سفر محال ہوتا ہے، یہ قوف انسان اب افغانستان میں کچھ نہیں، سوائے ٹیکسلا، موہنجوداڑو اور ہڑپہ جیسے چند

شہروں، تھوڑی سی آدھ جلی ہڈیوں، بے شمار بے گھر و کفن نعشوں اور ہزاروں لاکھوں راتھلوں، توپوں اور گولوں

کے۔ ہاں اب وہاں کچھ نہیں، جب کہیں سے زندگی، تہذیب اور معاشرت کے قدم اکھڑ جائیں تو انہیں دوبارہ

استوار ہونے کے لیے صدیوں کی جدوجہد چاہیے ہوتی ہے، کئی نسلوں کی قربانیاں، ہزاروں لاکھوں لوگوں کا

خون چاہیے ہوتا ہے۔ یہ لوگ گری و دیواروں، خنجر زمینوں اور جلے باغوں کی آبادکاری کے لیے اپنی بچی بچی نسل

داؤ پر لگانے کے لیے تیار نہیں، کیوں؟ کیونکہ یہ یقین ان کے وجود کا حصہ بن چکا ہے کہ اب افغانستان کبھی آباد

نہیں ہوگا۔"

میں پیچھے مڑا تو میرے سامنے بہت بڑا شہر تھا، پشاور، جدید دنیا کا ایک جدید شہر اور اس سے پیچھے اور

بھی بہت سے شہر تھے زندگی کی گہما گہمی سے لبریز، بھاگتے، دوڑتے، چلتے، چلا تے شہر اور پھر ان شہروں اور ان

بستیوں سے ہوا کا ایک جگولا اٹھا اور آکر میری ناگوں سے پلٹ گیا، میں نے دیکھا، اس جگولے میں گلے سڑتے

گوشت کی تیز بو، بہت سے نوٹے خوابوں کی جھجھکی اور بے راہ روی کی بے انتہا حدت تھی، میں نے پوچھا:
 ”کہیں ایک اور افغانستان تو نقل مکانی کے لیے تیار نہیں کھڑا۔“

ہمراہی نے جواب دیا ”افغان گھر سے نکلے تو پاکستان ان کے لیے جائے اماں بن گیا، لیکن اگر
 پاکستانی گھروں سے نکل پڑے تو کہاں جائیں گے؟“

ہاں، میں نے سوچا، جن کے سامنے کوئی مدینہ ہو، انہیں اپنے مکہ سے ضرور ہجرت کرنی چاہیے، لیکن
 دنیا میں جن کے لیے ایک بھی انصار نہ ہو، انہیں نقل مکانی کی حماقت نہیں کرنی چاہیے کہ آسمان سے نوٹے
 تارے اور بنیاد سے اکھڑی قوموں کے لیے وہیسی کا کوئی راستہ نہیں ہوتا۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

معاف کیجیے گا

سوڈن کی مثال لیں، شہنشاہ کا محل سناک ہوم کے سنٹر میں ہے، شاہان طرز کے اس قدیم محل کے بالکل ساتھ بسوں کا اڈہ ہے، ہر سبھی نے شہر کی انتظامیہ کو لکھا "میری سنڈی میں دن بھر دھواں اور شور آتا رہتا ہے جس سے میرے مطالعے میں خلل پڑتا ہے، آپ مہربانی فرما کر یہ اڈہ کسی دوسری جگہ شفٹ کر دیں۔" انتظامیہ نے طویل غور و خوض کے بعد جواب دیا۔ "بادشاہ سلامت ہم آپ کا مسئلہ سمجھتے ہیں، ہمیں آپ سے ہمدردی بھی ہے لیکن اس تمام تر ہمدردی کے باوجود یہ بھی سچ ہے کہ آپ کا مسئلہ ایک فرد کی پرالہم ہے جس کے ازالے کے لیے ہم اگر اڈہ شفٹ کر دیں تو سینکڑوں افراد متاثر ہوں گے جو کسی بھی طرح قرین انصاف نہیں لہذا جناب بادشاہ سلامت آپ کو باقی زندگی امن و خوشی اور خود کے ساتھ ہی گزارنا ہوگی۔ ہماری معذرت قبول فرمائیے۔"

جرمنی میں تو ایک اور ہی قسم کا "ڈرامہ" ہوا، ان کے ایک وزیر اپنی اہلیہ کو ایک شاپنگ سنٹر میں ڈراپ کرنے گئے، خاتون پلازے کے سامنے اتری، ہاتھ ہلا کر خاوند کو خدا حافظ کہا اور مرکز سیزرہیاں چڑھنے لگی، وزیر موصوف نے گیسر بدلائین اس سے قبل کہ آگے بڑھتے ان کی اہلیہ کا پاؤں رپٹ گیا اور وہ سیزرہیوں سے نیچے لڑھک گئی، وزیر موصوف نے گاڑی واپس چھوڑی اور بیوی کو سہارا دینے کے لیے بھاگ کھڑے ہوئے، اسے اٹھایا، چوٹی دیکھیں، معمولی خراشیں تھیں، ڈراما سہلانے سے بیگم صلیب کی طبیعت بحال ہوگئی، بیوی نے شکر یہ ادا کیا اور دوبارہ ہاتھ ہلا کر شاپنگ سنٹر کے اندر چلی گئی، وزیر موصوف واپس مڑے تو دیکھا سامنے ٹریفک پولیس کا ایک سار جٹ کھڑا ہے، وزیر نے اسے اپنی مجبوری بتائی تو سار جٹ نے مسکرا کر جواب دیا۔ "جناب قانون میں کہیں نہیں لکھا، اگر کسی کی بیوی گر پڑے تو اسے نو پارکنگ ایریا میں گاڑی کھڑی کرنے کا احتیاق حاصل ہو جاتا ہے لہذا جناب کا چالان تو ہوگا....." اور وہ ہوا۔

لندن میں ایک "پڑھا کو" قسم کے بچے نے اچانک پڑھائی میں دلچسپی لینا چھوڑ دی، سکول کی انتظامیہ نے تحقیق کی تو پتہ چلا، بچے کا والد سہ پہر کو اسے کہانیاں سنایا کرتا تھا لیکن کسی وجہ سے وہ اب یہ معمول جاری نہیں رکھ پا رہا جس کا بچے نے بڑا برا اثر لیا، انتظامیہ نے والد کو لکھا لیکن اس نے کوئی جواب نہیں دیا لہذا مجبوراً انتظامیہ کو پولیس کی مدد لینا پڑی، پولیس نے "جرم" کی تفتیش کی تو معلوم ہوا، بچے کا والد 10۔ ڈاؤنک

شریٹ میں وزیر اعظم کے ذاتی سٹاف میں شامل ہے، دفتر میں اچانک کام بڑھ جانے سے وہ پچھلے چند ہفتوں سے وقت پر گھر نہیں جاسکا جس سے اس کی گھریلو زندگی ڈسٹررب ہوئی اس کا اثر اس کے بیچ نے لیا اور وہ چڑچڑاہو گیا، پولیس کے ایک "معمولی" سے افسر نے وارننگ دینے کے لیے وزیر اعظم کو خط لکھا، وزیر اعظم نے اگلے ہی روز بیچ اور اس کے والد کو بلا کر معذرت کر لی۔

فرانس میں ایک وزیر اعلیٰ ریٹورنٹ میں دوپہر کا کھانا کھاتے تھے، ایک روز ان کی رہائش گاہ پر آگم ٹیکس ڈیپارٹمنٹ کا ایک اہلکار آیا، شناخت کرائی اور ان کے سامنے ایک فائل رکھ کر بولے "سر میں نے حساب لگایا سال بھر میں آپ نے جتنے پیسوں کا کھانا کھایا وہ آپ کی تنخواہ سے کہیں زیادہ ہیں۔ آپ بتانا پسند کریں گے آپ نے یہ اضافی رقم کہاں سے حاصل کی اور کیا آپ اس رقم پر باقاعدہ ٹیکس جمع کراتے ہیں؟" اب یہ تو بھلا ہو وزیر صاحب کے بزرگوں کا جو ان کے لیے کچھ پر اپنی چھوڑ گئے تھے جس سے حاصل ہونے والی آمدنی سے وہ "تھج" جیسی عیاشی "انورڈ" کر لیتے تھے ورنہ ان کا وہ حشر ہوتا کہ خدا کی پناہ۔

اب آتے ہی دوبارہ سویڈن کی طرف، وہی شہنشاہ جنہوں نے شہر کی انتظامیہ کو خط لکھ کر اپنی خوب بے عزتی کرائی تھی، ایک روز اپنے پوتے کو لانگ ڈرائیو پر لے گئے، راستے میں پوتے نے دادا کی گود میں بیٹھنے کی ضد کر دی، اب دادا خواہ سویڈن کا ہو، ہوتا دادا ہی ہے لہذا بادشاہ سلامت کا دل بیچ گیا اور انہوں نے پوتے کو اچک کر گود میں بٹھالیا، بادشاہ سلامت کی یہ ناشائستہ حرکت ایک سارا جنت دیکھ رہا تھا، اس نے گاڑی روکوائی، پوتے صاحب کو اٹھا کر پچھلی سیٹ پر بٹھایا اور ادب سے سر جھکا کر بادشاہ کو مخاطب کیا، "ہزار کیسی لینی قانون توڑنا بھرموں کا کام ہوتا ہے بادشاہوں کا نہیں۔"

سویڈن کے شہنشاہ، برطانوی وزیر اعظم اور فرانس اور جرمنی کے وزراء سے قطع نظر میں اپنے عظیم المرتبت صدر، بہت ہی قابل احترام وزیر اعظم اور شریعت کے پابندان 151 ارکان قومی اسمبلی سے ایک سوال کرنا چاہتا ہوں جن کی مسامی سے پاکستان کے عوام کو چند ہوس ترسیم کا تحفہ نصیب ہوا۔ "جناب عالی ذرا یہ تو بتائیے کیا اس شریعت کے نفاذ کے بعد اب سویڈن کے بادشاہ کی طرح ہمارا صدر بھی ایک عام پاکستانی شہری کے شینس پر آجائے گا، ایک عام پولیس انسپکٹر وزیر اعظم کو وارننگ دے سکے گا، وزراء کی گاڑیوں کے چالان ہوں گے اور ان سے ان کی آمدنی کے ذرائع پوچھے جاسکیں گے؟ قانون کی نظر میں ایک موچی اور لارڈ کائنہ اور دادو کے ہزاروں مربعوں کے مالک جاگیر دار برابر ہو جائیں گے؟ اور کیا یہ شریعت غلام اور آقا کا باہمی فاصلہ کی اور چودھریوں کی تفریق، مزارعے اور سردار کی درمیانی طعج منادے گی؟ کیا یہ انسانوں کو ایک نظر، ایک سطح اور ایک زاویے سے دیکھے گی؟

جی ہاں اگر چند حصوں ترسیم کے بعد بھی ہوڑ بھتے رہیں، کھلی پکھریوں میں درخواستیں لے کر آنے والے مظلوموں پر اسی طرح ڈنڈے برسائے جاتے رہیں سیاستدانوں کے پروردہ غنڈے اسی طرح عورتوں کو

بازاروں میں کھینٹے رہیں اور وزیروں، مشیروں اور ارکان اسمبلی کے چاچے، مامے اور بچے ہنگوڑے اسی طرح اپنے ذیروں پر "انصاف" کرتے رہے تو پھر معاف کیجیے گا۔ اس "شریعت" کا نتیجہ بھی وہی نکلے گا جو بہنو کے روٹی، کپڑا اور مکان کا نکلا تھا یا پھر جزل ضیا کی سائیکل سواری کا برآمد ہوا تھا۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

بارود کا لباس

میاں جاوید میرے بزرگ ہیں، پاکستان نیلی کمیونیکیشن اتھارٹی کے چیئرمین ہیں، اخلاقی اور مالیاتی بحران کے اس دور میں بھی ان کا لہجہ ٹکمر اور آنکھ خواہش سے خالی ہے، آپ گفتگو ان کے پاس بیٹھے رہیں وہ آپ کے اعصاب پر بوجھ نہیں بنیں گے، جب بھی آپ کی طرف دیکھیں گے آپ کو ان کی آنکھوں میں ماں جیسی مٹھاس ملے گی، جب بھی بولیں گے آپ کو ان کے لہجے میں صوفی جیسی چلبی اور عالم جیسی عاجزی ملے گی..... سچی بات ہے میں صرف ان کی وجہ سے ان تمام لوگوں کا احترام کرتا ہوں جو اپنے نام کے ساتھ میاں لکھتے ہیں۔

انہی میاں جاوید نے عرصہ پہلے ایک بس ڈرائیور کا ذکر کیا تھا جو برطانیہ میں بس چلاتا تھا، قصہ کچھ یوں ہے یہ بس ڈرائیور لندن کے مضافات میں بس چلا رہا تھا، سڑک کچھ نامور تھی لیکن وہ اپنی زندگی میں آگے بڑھتا جا رہا تھا، اچانک ایک سیاہ رنگ کی کار اس کے قریب سے گزری اور تھوڑا سا آگے جا کر روکنے کا اشارہ کیا، ڈرائیور نے پریشان ہو کر بڑیک لگا دی، بس آہستہ آہستہ کھسکتی ہوئی کار کے قریب پہنچ کر رک گئی، وہ انگریز مسکراتا ہوا ڈرائیور کی کھڑکی کے نزدیک آیا اور نہایت ہی شائستہ لہجے میں معذرت کر کے بولا "بھائی میرے سڑک ناموار ہے آپ ڈرا آہستہ چلیں، سوار یوں کو تکلیف ہو رہی ہوگی۔" ڈرائیور نے صوبہ ہو کر جواب دیا۔ "میر میں نے حد رفتار کا اصول تو پامال نہیں کیا۔" انگریز دوبارہ مسکرایا، اس اصول پسندی پر ڈرائیور کی تعریف کی اور کہا "وقتی طور پر اس اصول کو بدل لینے میں کوئی ہرج نہیں ہوتا جس سے عام لوگوں کو تکلیف پہنچ رہی ہو۔" دوبارہ معذرت کی، ہاتھ ہلایا اور گاڑی میں بیٹھ کر چلا گیا۔ جب گاڑی نظروں سے اوجھل ہو گئی تو ایک مسافر نے ڈرائیور کو بتایا "یہ برطانیہ کے وزیر اعظم ہیرلڈ ولسن تھے۔"

میں نے ایک جگہ پڑھا تھا بھارت کے وزیر اعظم لعل بہادر شاستری جھوٹے سے گھر میں رہتے تھے، چنائی پر سوتے تھے اور ان کی اہلیہ خود اپنے ہاتھوں سے گھر کا کام کرتی تھی جبکہ مراد جی ڈیپائی سڑک پر گاڑی رکوا کر لوگوں کو کیلے کے چھٹکے، پلاسٹک کے لفافے اور آنکس کریم کے خالی پکٹ کچرے کے ڈبے میں چھٹکنے کی ہدایت کیا کرتے تھے، الطاف کو ہر بتایا کرتے ہیں جب دو اندرا گاندھی سے ملے گئے تو وہ ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھی تھی۔ میز پر ڈائننگ شیٹ نام کی کوئی چیز نہیں تھی، عام سستی قسم کی پلیٹوں میں عام سا کھانا تھا، جب گلاس بہت

جی غریبانہ اور سادہ سے تھے، وزیر اعظم نے خود ان کے سامنے پلیٹ رکھی اور گلاس میں پانی ڈال کر دیا۔ میرے دوست ارشد ملک نے مجھے اردن کے شاہ حسین کا واقعہ بتایا، کسی نے شاہ سے شکایت کی جناب ٹریفک پولیس کا نظام بگڑا جا رہا ہے ان کی کھچائی ضروری ہو چکی ہے۔ شاہ نے اثبات میں گردن ہلا کر اصلاح احوال کی یقین دہانی فرمادی۔ اسی شام شاہ حسین عام گاڑی میں خود ڈرائیونگ کرتے ہوئے شہر میں نکلے، اشارہ توڑا اور گاڑی بھگالے گئے، ان کی یہ حرکت ایک سارجنٹ دیکھ رہا تھا۔ اس نے آؤ دیکھنا تہ تاؤ، مونر سائیکل بھگائی اور انہیں جالیا، گاڑی رکوائی، لائسنس طلب کیا، چالان کیا، رسید ہاتھ میں پکڑائی اور سلام کر کے چلا گیا، شاہ حسین وہاں سے سیدھے کچھری گئے، چالان فیس بھری اور واپس آ گئے۔ شکایت کو طلب کیا اور ہنس کر کہا۔ ”نہیں جناب آپ کا خیال درست نہیں ٹریفک پولیس کا نظام بالکل ٹھیک ہے، خدا کی پناہ جو سارجنٹ اپنے حکمران کا چالان کرتے نہیں چوکتا وہ عام آدمی کی غلطی کیسے معاف کرے گا؟“

مجھے کسی صاحب نے بتایا مصر کے جمال عبدالناصر آدمی کے معمولی سے کوارٹر میں رہتے تھے، ان کے بچے عام بس سے سکول جاتے تھے، ایک بار ایک کنڈیکٹر نے ان سے کرایہ نہ لیا، بچوں نے گھر آ کر شکایت کی تو جمال عبدالناصر نے اس بس کا سارا عملہ معطل کر دیا جس کے بعد کسی کنڈیکٹر کو کسی بڑے آدمی، کسی بااختیار شخص کے اہل خانہ کو رعایت دینے کی جرأت نہ ہوئی، یہاں تک کہ ایک بس ڈرائیور نے تو جمال عبدالناصر کے بچوں کے لیے ایک منٹ اضافی رکنے سے بھی انکار کر دیا تھا۔

دنیا حیران ہے وہ صدام حسین جس نے پوری عراقی قوم کو جنگ کے جہنم میں دھکیل دیا تھا، جس کے باعث آج 50 لاکھ عراقی بچے دواؤں کے لیے ترس رہے ہیں، پوری قوم ایک وقت کھانا کھا رہی ہے اور جہاں اب نوئی عمارتوں، شگتہ سڑکوں، قیمتی بیجوں اور مظلوم بیواؤں کے سوا کچھ نہیں بچا، وہ صدام آج بھی عراق کا پاپولر لیڈر ہے، لوگ اب بھی اس پر جان چھڑکتے ہیں اب بھی ملک کے کسی کو نہ سے ”صدام مردہ باد، قومی حکومت لاؤ، صدام کو باہر نکالو“ کی صدائیں سنیں دیتی، کیوں، آخر کیوں؟ صدام میں ایسی کیا خوبی ہے جو دوسروں میں نہیں؟ بات صرف اتنی ہے کہ عراق کا بچہ بچہ جانتا ہے اگر وہ ایک روٹی کھا رہا ہے تو صدام کے دسترخوان پر بھی ایک ہی روٹی ہوگی، اگر اس کے درد کے لیے دوائیں تو صدام بھی درد کی گولی نہیں کھائے گا، دوسرا صدام حسین نے بیٹے کا پورا ایک دن عوام کے لیے وقف کر رکھا ہے، اس روز وہ سارا دن ٹیلی فون پر دستیاب ہوتا ہے، عراق کے کسی بھی گوشے سے کوئی عراقی شاہی محل کا نمبر ڈائل کرے صدام خود فون اٹھائے گا، اس کی شکایت سنے گا، جائز ہوئی تو دو گھنٹے میں اس کا ازالہ ہو جائے گا۔

میرا دعویٰ ہے جس روز وزیر اعظم عام گاڑی پر بس ڈرائیوروں کو ہدایات دیتے نظر آئے، میاں نواز شریف چٹائی پر سوئے، کلثوم نواز شریف نے اپنے ہاتھوں سے گھر کا کام شروع کر دیا، بے نظیر لوگوں کو چھلکے کچھرے کے ڈبوں میں بھیجنے کی ہدایت کرتی دکھائی دی، بلاول، مختیار اور آصف چھ نمبر وین پر سکول گئیں، شہباز

شریف کی گاڑی کا چالان ہوا اور انہوں نے اسے سی کی عدالت میں قطار میں کھڑے ہو کر پیسے جمع کرائے اور ٹوبہ یک سنگھ کے معراج دین نے پی سی او سے فون کیا اور وزیراعظم پاکستان نے خود اپنے کانوں سے اس کی شکایت سنی اسی روز پاکستان کی کسی گلی، کسی چوراہے، کسی چوک سے کتا اور ہائے ہائے کی آواز نہیں آئے گی، کسی قاضی حسین احمد کا جیلر کامیاب نہیں ہوگا، کسی ولی خان، کسی مینگل کی ریلی میں لوگ جمع نہیں ہوں گے، کوئی اشارہ، کوئی جی اور کوئی شیشہ نہیں ٹوٹے گا، کسی لیڈر، کسی وزیر کسی مشیر کو گالی نہیں دی جائے گی۔

اس نظام کو جو لیڈر کو برہمن اور عوام کو شورو بنا دیتا ہے، ختم کر دیں ورنہ یہ نظام آپ کو مٹا دے گا کہ بارود کا لباس پہن کر آگ کے نزدیک کھڑے ہونے والے لوگ زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہتے۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

ذات کے خلا

اس کہانی میں سبق کا کوئی پہلو مضمر تھا اور نہ کوئی چونکا دینے والی بات، بس اس دکھی شام، سفر کے چھیل دینے والے احساس، ذہن سے گزرتی ہوئی جذباتی لہر اور اپنے اپنے دکھ سنانے کی جہلی خواہش نے اس میں معنی بھر دیئے، اسے آفاقی داستان بنادیا، زندگی کے سب سے بڑے واقعے اور سردیوں کی چوٹوں کی طرح دیر تک محسوس ہونے والے درد کی شکل دے دی اور ہم نہ چاہتے ہوئے بھی اس کہانی کے قطرہ قطرہ ٹپکتے زہر میں ڈوبتے چلے گئے۔

دانشور نے ہاتھ کی پشت سے آنکھوں کی دھند صاف کی اور پھر سرگوشی میں بولا "یہ آج سے 30 برس پرانی بات ہے، ان دنوں میرا علی اڑھائی برس کا تھا، سرما کی ایک عجیب شہنشاہی رات کو جب میں تھکا ہارا گھر پہنچا تو میری بیوی، علی کو کندھے سے لگائے میرا انتظار کر رہی تھی، مجھے دیکھتے ہی علی ماں کی گود سے اتر ا اور بھاگتا ہوا میری ٹانگوں سے لپٹ گیا۔ میں نے بیوی سے ماجرا پوچھا تو وہ غلطی سے بولی یہ پچھلے دو گھنٹے سے آپ کا انتظار کر رہا ہے، میں نے اسے لاکھ بہلا دے دیئے، آپ کی تھکاوٹ اور بے چین طبیعت کے قصے سنائے، گیدڑوں کی آوازوں سے ڈرایا لیکن اس کی ایک ہی ضد ہے "میں تو ابو سے ملوں گا" میں نے علی کو اٹھایا، پیاد کیا اور اندر کمرے میں لے آیا۔ چنگ پر لٹایا اور اوپر کھل دے کر پوچھا۔ "جی میری جان کیا بات ہے؟" بچے نے مجھے گردن سے پکڑ کر نیچے جھکایا اور میرے ماتھے پر بوسہ دے کر بولا: "ابو جان آپ میری بات مانیں گے" میں نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ بھیرا اور یقین سے کہا: "کیوں نہیں بیٹا، آپ کہو تو سہی" علی نے گھبرائے گھبرائے انداز میں اپنی ماں کی طرف دیکھا اور پھر میری طرف مڑ کر بولا: "ابو مجھے ہاتھی خرید دیں، اصلی ہاتھی۔" مجھے اس کی معصوم خواہش پر بڑا پیار آیا، میں نے اسے سمجھنے کی سیٹھ سے لگایا اور پھر پوچھا "ابو کی جان یہ تو بتاؤ ہاتھی ملتے کہاں ہیں؟" علی نے جوش سے ہاتھ فضا میں لہرایا اور پھر چمک کر بولا: "بازار سے" میں نے پھر شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ بھیرا اور پیار سے کہا: "بیٹے اس وقت تو ساری دکانیں بند ہو چکی ہیں، کل آپ میرے ساتھ چلے گا، ہاتھی خرید لیں گے۔" علی نے یہ سنتے ہی میرا ہاتھ جھٹکا اور غصے سے چلا کر بولا: "اس وقت بھی مل سکتا ہے آپ تلاش تو کریں۔" میں نے چند لمبے سوچا اور پھر نتیجے پر پہنچ کر اس کے گالوں پر بوسہ دیا

اور کہا: ”اوکے، بیٹا چلو تیار ہو جاؤ، ابھی ہاتھی خرید لاتے ہیں۔“ میرا یہ فقرہ سن کر وہ اپنی ماں کی طرف دیکھ کر چلایا ”دیکھا میں نہ کہتا تھا، اب میرے ساتھ ضرور جائیں گے۔“

دانشور نے دھندلا چشمہ تار کر گود میں رکھا اور پھر غناک لہجے میں بولا ”دسمبر کی دو رات بڑی ہی سرد تھی جب میں اور میرا بیٹا رات کے دو بجے ہاتھی خریدنے کے لیے گھر سے نکلے، شہر میں سنانے، بچ خنڈی ہوا اور گیدڑوں کی توکیلی آوازوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ ہم کانوں پر مظر لپیٹے، ہاتھ بظلوں میں دیے فٹھرتے ہوئے بازار میں آہستہ آہستہ چل رہے تھے، بازار کے آخر میں ایک نانپائی کی دکان تھی جس میں سردی کے مارے تین شخص سرد ہوتے تنور کے گرد بیٹھے صبح کا انتظار کر رہے تھے، میں نے علی سے کہا: ”بیٹا ذرا ان سے پوچھو تو سہی ہاتھی کہاں سے ملے گا؟“ علی نے گردن ہلائی اور دوڑتا ہوا تھڑے پر چڑھ گیا، آگ تاپنے والے تینوں اشخاص نے حیرت سے سزا کر اس کی طرف دیکھا، علی نے سلام کیا اور آنے کی وجہ بیان کر دی، تینوں نے قہقہہ لگایا اور بچے کو پکڑ کر بولے: ”بیٹا ہاتھی تو کھلونوں کی دکان سے ملتا ہے۔“ علی کو ان کا یہ مذاق بالکل نہ بھایا، وہ ہراسا منہ بنا کر بولا: ”میں نفی نہیں اسلی ہاتھی کی بات کر رہا ہوں۔“ آگ تاپنے والوں نے پھر قہقہہ لگایا اور اسے قریب بلا کر بولے: ”بیٹے ہاتھی تو چڑیا گھر میں ہوتا ہے جہاں اسے دیکھا جاسکتا ہے، اس پر سواری کی جاسکتی ہے، پر اسے ساتھ نہیں لایا جاسکتا۔“ علی کو ان کی یہ بات بھی پسند نہ آئی، تھڑے سے نیچے اترتا دوسری انکی پکڑ کر بولا: ”ابو ان لوگوں کو کچھ پتا نہیں، جلیس کسی دوسری دکان سے پوچھتے ہیں۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اسے ساتھ لے کر آگے چل پڑا۔

شہر میں کوئی دکان نہیں کھلی تھی، گلیوں میں کوئی ذی روح نہیں تھا، بس ہم دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے دانٹوں پر دانت جمائے چلتے جا رہے تھے، چلتے جا رہے تھے۔ یہاں تک کہ ریلوے سٹیشن آگیا، ہم پلیٹ فارم پر آ گئے، جہاں زندگی کے کچھ کچھ آثار تھے، ہم سب سے پہلے چائے کے کھوکھے پر گئے اور ہاتھی کا پتا پوچھا، جواب میں چائے والے نے قہقہہ لگا کر ہمیں آگے بھیج دیا، ہم پان سگریٹ کی ریڑھی پر گئے اور ہاتھی طلب کیا اس نے بھی قہقہہ لگایا اور ہاتھ سے گلٹ گھر کی طرف اشارہ کر دیا، ہم بنگ کلرک کے پاس گئے اس نے کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھا تو میرے بیٹے نے ہاتھی کا مطالبہ کر دیا، یہاں بھی نتیجہ نانپائی کی دکان سے مختلف نہ نکلا۔ یہاں پہنچ کر علی رنج ہو گیا، اس نے منہ بسورتے ہوئے میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے کھینچ کر ریلوے سٹیشن سے باہر لے آیا، ہم تین چوراہے میں کھڑے ہو گئے، میں نے شفقت سے اس کے سرد ہوتے گالوں پر ہاتھ بھیرا اور پھر ہوا میں بوسہ دے کر پوچھا ”بیٹا اب بتاؤ کہاں جائیں؟“ علی نے اوپر میری طرف دیکھا اور پھر رو ہنسا ہو کر بولا: ”ابو میرا خیال ہے ہاتھی دکانوں پر نہیں ملتے۔“ میں نے نیچے جھک کر اس کا مظر درست کیا اور پھر اس کے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا: ”ہاں یا میرا بھی ایسا ہی خیال ہے اگر تم کہو تو کل جا کر چڑیا گھر والوں سے پوچھ لیتے ہیں اگر کہیں سے ہاتھی ملتا ہو گا تو جا کر خرید لیں گے کیوں؟“ ”ہاں یہ ٹھیک ہے۔“

مٹی نے پر جوش لہجے میں کہا اور ہم دونوں واپس گھر کی طرف چل پڑے۔

میری بیوی اور میرے والد گھر کے باہر ہمارا انتظار کر رہے تھے، مٹی نے میرا ہاتھ چھڑایا اور بھاگ کر میرے والد کی ناگوں سے لپٹ گیا۔ میرے والد نیچے جھکے اور اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولے: "کیوں پھر ہو آئے بازار سے؟" مٹی نے سر اوپر اٹھایا اور چلا کر بولا: "دادا ابو، دادا ابو، ہاتھی دکانوں پر نہیں ملتے، اگر ملتے ہوتے تو میرے ابو مجھے ضرور خرید کر دیتے۔" ننھے مٹی کے یہ الفاظ میرے والد پر ہم کی طرح گرے، ان کے منہ سے چیخ نکل گئی اور میں اپنے آنسو چھپاتا ہوا اندر چلا گیا۔ "دانشور نے رک کر آنکھوں پر درو مال رکھ لیا۔

دانشور نے دبیز شیشوں والا چشمہ گود سے اٹھایا اور اسے اپنی ناک پر جما کر بولا: "اس لیے کہ بچپن میں جب ایک بار میں نے ہاتھی خریدنے کی ضد کی تھی تو میرے والد نے چھین مار مار کر میرے کال سرخ کر دیئے تھے۔" ہم تینوں خاموش تھے، ہم تینوں اپنے اپنے بچپن کے ہاتھی تلاش کر رہے تھے، ہم تینوں اپنے اپنے کال سہارا رہے تھے، ہم تینوں اپنے اپنے بچوں کو یاد کر رہے تھے۔

اس بار بھی دانشور ہی نے پہل کی اور ہمیں اپنی طرف متوجہ کر کے بولا: "بچپن کی محرومیاں، بچپن کی زیادتیاں، بچپن کی ماریں اور بچپن کے کھجوتے ہماری ذات میں خلا بن جاتے ہیں، جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بڑے ہو جاتے ہیں۔ ہم کبھی اس خلا کو کتابوں سے مھرنے کی کوشش کرتے ہیں، کبھی عورتوں سے، کبھی راگوں سے، کبھی تصویروں اور کبھی شعروں سے، کبھی دولت، شہرت اور تعلقات عامہ سے، لیکن یہ خلا کبھی نہیں بھرتے۔ تم، میں اور اس نے، دانشور نے رک کر تیسرے ساتھی کی طرف اشارہ کیا، بچپن میں اپنے والد کی انگلی پکڑ کر ہاتھی تلاش کیا ہوتا تو آج ہماری ذات میں کوئی خلا نہ ہوتا۔ آج ہمارے آنسو ہمارے حلق میں نہ گر رہے ہوتے، ہم دنیا فتح کرنے کے لیے اپنے اپنے گھروں سے یوں نہ نکلے ہوتے، ہم بھی نارمل زندگی گزار رہے ہوتے۔"

ہم تینوں نے اپنے اپنے چشمے اتارے اور ہاتھوں کی پشت سے آنکھیں سسل کر بولے: "یاد لوگوں کو کبھی ڈرائیونگ کا شعور نہیں آ سکتا، لائسنس سیدھی آنکھوں میں مارتے ہیں، میری تو آنکھیں بھی خراب رہتی ہیں، خواہ مخواہ ہی پانی آ جاتا ہے۔"

(نوٹ: اس کالم کے دانشور مشہور شاعر جناب افتخار عارف ہیں جبکہ ہمارے ساتھ تیسرے صاحب جناب ظلیل ملک تھے۔)



کانڈ کی حکومت

کہر میں لپٹی راول جھیل سے رخ ہوا کا جھونکا اٹھا اور میرے چہرے پر سونئیں کی طرح اتر گیا۔ میں نے ٹرور کی جیسوں سے ہاتھ نکال کر جیکٹ کے کارسیدھے کیے اور انہیں کانوں پر لپیٹ کر زپ چڑھا دی۔ دور جھیل میں کبر زورہ دودھیا پانی سے کیکیا ہوا زرد سورج آہستہ آہستہ اوپر اٹھ رہا تھا۔ میں نے سورج پر نظریں گاڑ کر سینہ ذرا سا ڈھیلا چھوڑا اور میری سانس کی نالی میں برف اتر گئی۔ میں نے فوراً رخ ہاتھ ناک پر رکھ لیا، جس کے ساتھ ہی ایک خیال اڑتا ہوا آیا اور میرے دماغ کو ہلا کر گزر گیا۔ میں نے سوچا دنیا کب ختم ہوگی؟ اس روز جب ساری زمین برف میں دفن ہو جائے گی یا اس روز جب زمین اور آسمان سے آگ برسے گی یا جب کانڈ انسان کی جگہ لے لے گا۔ میں ڈکا، ناک سے ہاتھ ہٹایا اور برف ہوتی اگھیوں پر پھونک مار کر سوچا، اگر یہ پیش گوئی سچ ہے تو پھر قیامت آچکی ہے، دنیا دفن ہو چکی ہے کیونکہ کانڈ انسان کی جگہ لے چکے ہیں۔

ہم کیا ہیں؟ میونسپلٹی کے کانڈوں پر لکھے چند حروف۔ دفنوں، سکولوں، کالجوں، کارخانوں اور جنگلوں کے درختوں پر چڑھے چند نام۔ ایک شخص سولہ برس تک ٹھنڈے کھاس رومز میں سلیبس کی ٹھنڈی ٹھار کتابوں پر سر پٹتا ہے اور آخر میں اسے کیا ملتا ہے، کانڈ کا ایک کلڑا۔ وہ نہ ملے تو ایم اے پاس شخص ان پڑھ ہے۔ ایک شخص ساٹھ برس تک زندگی کی جنگی گھماتا ہے، کمر جھک جاتی ہے، بیٹائی مدہم پڑ جاتی ہے، بال سفید ہو کر جھڑ جاتے ہیں، سانس پھیپھڑوں سے الجھتی رہتی ہے اور جسم بیماریوں کی امانت بن جاتا ہے تو اسے کیا ملتا ہے، کانڈ کے چند بٹنل، دو جمل جائیں، بہہ جائیں یا گم ہو جائیں تو زندگی کا سارا سفر اکارت گیا، ایک شخص اونچے عہدے پر بیٹھا ہے، لوگ اس کے آگے پیچھے بھرتے ہیں، جھک کر سلام کرتے ہیں، اس کی ناگوار سے ناگوار بات پر تیشی نکال کر اسے داد دیتے ہیں، کیوں؟ کیونکہ اس کے پاس کانڈ پر چند حروف لکھنے کا اختیار ہے۔ ایک شخص دوسرے شخص کو جان سے مار دیتا ہے کیوں؟ کیونکہ اسے کانڈ کے چند بیکٹ مل جاتے ہیں۔

میرا بڑھ سرنیکلیٹ ہے، تو میں پیدا ہو چکا ہوں۔ میرا ڈھ سرنیکلیٹ جاری ہو گیا تو میں مر چکا ہوں۔ میرے پاس اردو میں چھپا شناختی کارڈ ہے تو میں پاکستانی ہوں، چمکتے کانڈ پر انگریزی میں چند حروف لکھے ہیں تو امریکی ہوں، پاسپورٹ کے چند ورق پر عربیہ چند کانڈ چپکے ہیں تو پوری دنیا میرا گھر ہے، میرے

پاس کاغذ کا ایک کٹڑا ہے تو میں صحت مند ہوں، میرے سر ہانے پڑی فائل میں چند کاغذ لگے ہیں تو میں موت کا مریض ہوں۔ ایک شخص نے کاغذ جاری کر دیا تو میں مجرم ہوں، دوسرے نے دوسرا کر دیا تو میں بے گناہ معصوم شہری ہوں۔ میرا میری بیوی کے ساتھ ایک کاغذ کا رشتہ ہے، وہ ہے تو ہم میاں بیوی ہیں، نہیں ہے تو ہم گھنگار ہیں۔ میرے پاس کاغذ کا ایک کٹڑا ہے تو میں ڈاکٹر ہوں، انجینئر ہوں، وکیل ہوں، استاد ہوں، منج ہوں، ایک با اختیار افسر ہوں۔ میرے پاس کاغذی نوٹوں کے انبار ہیں تو میں زندگی کی ہر نعمت سے لطف اٹھا سکتا ہوں، سارے دروازے میرے لیے کھلے ہیں۔ نہیں ہیں تو میں ایسے قید خانے میں بند ہوں، جہاں میں پانی کا ایک گلاس نہیں پی سکتا۔ مجھے ایک روٹی نہیں مل سکتی میں مردہ کی ایک گولی نہیں لے سکتا، ہاں، میں بخیر کاغذ دے کوئی چیز اٹھا کر کھا لیتا ہوں، تو میں چور ہوں، مزک پر کڑے مفلوک الحال لوگوں میں کاغذ بانٹنے لگتا ہوں تو خفی ہوں، ان داتا ہوں، نہیں کرتا تو کنبوس ہوں۔ میں مسجدوں، مندروں، گر جا گھروں اور گردواروں کے متولیوں کو کاغذ پیش کرتا ہوں تو خدا کا مقرب بندہ ہوں، نہیں کرتا تو بخیل ہوں، معاشرے اور مذہب کا مجرم ہوں۔

چند جلد شدہ کاغذ ہیں تو ارسطو، سقراط، بقراط، افلاطون، گنیشوش، بودھ، ہومر، چاسر، کالی داس، شکسپیر، گوئٹے، دانٹے، ابن عربی، سینا، فردوسی، سعدی، رومی، حافظہ، وارث شاہ، کانٹ، والٹیر، روسو، سارتر، نطشے، نیگل، مارکس، فرانز، نوائس، برنٹے، فکس، ڈکنز، کامیو، غالب، اقبال اور فیض ہیں۔ چند کتابیں ہیں تو ہندو میرا دشمن ہے، یہودی اور مسلمان الگ الگ ہیں، شیعہ سنی جانی دشمن ہیں، رومی اور امریکی ایک میز پر نہیں بیٹھ سکتے۔ کاغذ ہیں تو میری ایک پوری تاریخ ہے، میرے آباؤ اجداد ہیں، میری تہذیب، میرا تمدن ہے، نہیں ہیں تو یہ ملے نہیں ہو سکتا کہ میرا نسب بندہ سے شروع ہوا یا آدم سے، میں امیا سے انسان بنا تھا یا کسی دوسرے سیارے سے یہاں آپکا۔ کاغذ پر چند سلفظ نہیں چھپے تو میرا کوئی مستقبل نہیں، میری کوئی منزل، میرا کوئی کل نہیں۔ کاغذ کے اس کٹڑے (اخبار) کے اس کونے میں میرا نام (زیر پوائنٹ) چھپا ہے تو میں ہوں، نہیں چھپا تو میں کوئی نہیں۔

ہاں، اور وہ بھی تو ہزاروں لاکھوں لوگ تھے، اہل تمکین، اہل علم و دانش، اہل ہنر، جنہیں کاغذ کی شناخت نہ ملی تو وہ خاموشی سے چلے گئے اور وہ بھی تو ہیں جو زندگی میں بے یار و مددگار رہے، اپنے ہی کرتوتوں پر چونہ جوڑتے رہے اپنی ہی بھوک سے لڑتے رہے، لیکن جب مرے تو انہیں کاغذ کا کفن مل گیا۔ لہذا آج وہ لائبریریوں میں زندہ ہیں۔

یہ کنٹین کیا ہے؟ بیلٹ بکس سے نکلے چند کروڑ کاغذوں سے بنا شخص، اگر (دوٹ) نہ ملے تو کچھ نہ ہوتا اور وہ کیا کر سکتا ہے۔ ایک کاغذ جاری کر کے ایران، لیبیا اور عراق کو دنیا سے غائب کر سکتا ہے، ایک کاغذ جاری کر کے صومالیہ، روانڈا، افغانستان اور البانیا کو بھوک سے بچا سکتا ہے، ایک کاغذ جاری کر کے شرق بعید کو مغرب بعید کے قریب لا سکتا ہے، ایک کاغذ جاری کر کے تیسری دنیا کے کسی بھی ملک کا مقدر بدل سکتا ہے، ایک

کاغذ جاری کر کے دنیا کے سارے سلکتے مسائل کی آگ بجھا سکتا ہے۔

ہاں، کاغذ ہی تو مقدر ہے جس کے لالچ میں ہر روز اربوں لوگ اپنا پسینہ بہاتے ہیں، کروڑوں لوگ لائیاں خریدتے ہیں، لاکھوں افراد دوسروں کا گلا کاٹتے ہیں، ہزاروں لوگ ہزاروں لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں، لاکھوں لوگ کروڑوں لوگوں کو لونٹے ہیں، ہاں کاغذ ہی تو مقدر ہے جس کے بدلے لوگ زندگی خریدتے ہیں، لوگ زندگی بیچتے ہیں۔

ہاں، کاغذ ہی تو مقدر ہے جو امید بن کر طالب علم کی آنکھوں میں چمکتا ہے، سانس بن کر قیدی کے سینے میں چلتا ہے، آس بن کر مریض کی رگوں میں دوڑتا ہے، خواہش بن کر دکاندار کے حلق سے نکلتا ہے اور فرعون بن کر سیاستدان کی آواز میں بولتا ہے۔

ہاں، میں نے برف ہوتی گردن پر ہاتھ رگڑتے ہوئے سوچا، قیامت ہو چکی ہے، دنیا فنا ہو چکی ہے، کاغذ انسان کی جگہ لے چکے ہیں۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

این کاؤنٹر

”این کاؤنٹر“ (اسے پیرس ریویو بھی کہتے تھے) دوسری جنگ عظیم کے فوراً بعد دنیا میں کمیونزم کا سب سے بڑا نقیب بن کر طلوع ہوا، آفسٹ پیپر پر جدید ترین پرنٹنگ سسٹم کے تحت شائع ہونے والا یہ رسالہ پیرس کی بندرگاہوں، ایئرپورٹس اور ریلوے سٹیشنوں سے نکلتا اور پھر چند ہی روز میں دنیا بھر کے ٹی ہاؤسز، کافی شاپ اور شراب خانوں میں پہنچ جاتا، جہاں نہ صرف ایک ایک سطر کو الہام سمجھ کر پڑھا جاتا، بلکہ ایمان کا دھجہ دے کر اس پر عملدرآمد بھی شروع کر دیا جاتا۔ ہم اگر مارکسی نظریات، مارکسزم کے پیروکاروں کے حلیوں اور ان کے متشدد نظریات کی تاریخ کھود کر نکالیں تو ہمیں ”این کاؤنٹر“ ہی ملے گا، جس نے پوری دنیا میں بھوک کو مضبوط ترین فلسفہ بنادیا، یہ این کاؤنٹر ہی تھا جس سے متاثر ہو کر لوگوں نے بال بول چلا لیے، غفلت کرنے لگی عادت ترک کر دی، مارکسی لٹریچر کو مقدس سمجھ کر اس کا ایک ایک لفظ رٹ لیا، بیویوں کو طلاقیں دے دیں اور بچوں کو ”ان ایمرس کو لوٹ لو“ کا درس دینا شروع کر دیا۔

رسالے کے پیچھے کروڑوں روپے تھے، دنیا کے ذہین ترین مارکسی دماغ تھے، ماہر صحافی تھے، انتہائی ذہین نقاد اور دانشور تھے، لہذا اس دور میں اس سے بڑھ کر معیاری، جامع اور پراثر جریدہ دنیا میں کوئی نہیں تھا۔ معیار کا اندازہ اس بات سے لگائیں کہ سپنڈر، آڈن اور مارلو جیسے دانشور اس کے ایڈیٹریل بورڈ میں شامل تھے۔ اس کے علاوہ ایک بین الاقوامی مجلس ادارت تھی، جو دنیا بھر سے موصول ہونے والے مضامین، تجزیوں اور تبصروں کا کڑی نظر سے جائزہ لیتی، انہیں مارکسی کسوٹی پر پرکھتی، زبان و بیان کی غلطیوں کی نشاندہی کرتی، اعداد و شمار اور حقائق کی صحت کا اندازہ لگاتی، تسلی کے بعد یہ مضامین مختلف ڈیسکوں پر چلے جاتے، جہاں اپنے وقت کے ماہرین ان کا ترجمہ کرتے، ان کی نوک پلک سنوارتے، اس کے بعد ایک اور شعبہ اس ترجمے کا جائزہ لیتا، اس میں پائی جانے والی جھول، سقم اور غلطی کو تاہیاں درست کرتا، آخر میں جب اشاعت کا مرحلہ آتا تو انتظامیہ انگریزی ٹیکسٹ کے ساتھ ساتھ اصل متن (جو مختلف زبانوں میں ہوتا) بھی چھاپ دیتی، تاکہ اگر ترجمے میں کوئی غلطی رہ گئی ہو تو قارئین اصل مضمون دیکھ کر اسے درست کر لیں، اس کڑے معیار، انتخاب اور عرق ریزی کے باعث ناقدین ”این کاؤنٹر“ کو کمیونزم کی ترویج میں وہ مقام دیتے تھے جو شاید کارل مارکس اور

لینسن کو بھی نصیب نہیں ہوا۔

لیکن قارئین کرام! یہ دیکھیے "این کاؤنٹر" کی اشاعت کے دس پندرہ برس بعد انکشاف ہوا، جسے دنیا کیونزم کی بائبل سمجھ رہی تھی، وہ دراصل سی آئی اے کا منصوبہ تھا اور اس کے ذریعے امریکی خفیہ ادارے کے ہیڈ کوارٹر کے ایک چھوٹے سے کمرے سے ڈپٹی سیکرٹری ریف کا ایک امریکی، دو کلرک اور ایک چڑا سی چند فائلوں، نیٹکس کے چند پیغامات اور کچھ خفیہ ٹیلیفون کالز کے ذریعے برسوں تک پوری اشتراکی دنیا کو بیوقوف بناتے رہے، ان کے نظریات میں زہر گھولتے رہے، یہاں تک کہ کیونزم کے مارگٹ ممالک میں مقامی سطح پر کیونزم کے خلاف مزاحمت شروع ہو گئی۔

عرصے بعد جب این کاؤنٹر پراجیکٹ کا چیف ٹھاقہ فیغار کے ایک سیمینار میں شرکت کے لیے پیرس گیا تو شرکاء نے اُنھ کو اس کا استقبال کیا۔ بوڑھے ریٹائرڈ امریکی نے ہیٹ اتار کر سب کا شکریہ ادا کیا اور پھر جنگ کرسٹ پر بیٹھ گیا۔ پوچھنے والوں نے پوچھا "سراپ نے یہ سب کچھ کیسے کیا؟" بوڑھا امریکی مسکرایا اور پھر مائیک کو انگلی سے چھو کر بولا "جنگ مین ویری سہل، ہم نے کیونزم کو اتنا کڑا، سخت اور غیر چلک دار بنا دیا کہ وہ لوگوں کے لیے قابل قبول نہ رہا۔" ایک اور نوجوان اُنھ اور بوڑھے سے مخاطب ہو کر بولا "لیکن جریدے کے سارے منتظمین تو کیونسٹ تھے اور جہاں تک ہماری معلومات ہیں، سی آئی اے کا ان سے کوئی براہ راست رابطہ بھی نہیں تھا۔" بوڑھے نے قہقہہ لگایا اور پھر دوبارہ مائیک کو چھو کر بولا "نوجوان ہاں، ہمارا این کاؤنٹر کی انتظامیہ اس کے ایڈیٹوریل بورڈ اور اس کے کیونسٹ ورکرز سے کوئی تعلق نہیں تھا، لیکن دنیا کے مختلف کونوں سے این کاؤنٹر تک پہنچنے والے مضامین تو ہم لوگ ہی لکھواتے تھے۔" ایک اور نوجوان کھڑا ہوا اور بوڑھے کو ٹوک کر بولا "لیکن اس سے کیا ہوتا ہے؟" بوڑھا آہستہ سے مسکرایا اور پھر مائیک کو چپکلی میں پکڑ کر بولا: "بہت کچھ ہوتا ہے، جنگ مین، تم خود فیصلہ کرو جو بائبل ایسے احکامات دے جو انسانی فطرت سے متصادم ہوں، جو انسان کو آزادی سے سوچنے، بولنے اور عمل کرنے سے روکتے ہوں، جو لوگوں کو بد بودار کپڑے پہننے، شیونہ کرنے، دانت گندے رکھنے اور گالی دینے کا درس دیتی ہو، وہ لوگوں کے لیے قابل قبول ہوگی؟ ہم نے یہی کیا، این کاؤنٹر کے پلیٹ فارم سے اشتراکی نظریات کے حامل لوگوں کو بے چلک، متعقد اور سخت موقف کے حامل افراد ثابت کر دیا جس کے بعد تیسری دنیا میں ان لوگوں کے خلاف مزاحمتی تحریکیں شروع ہوئیں اور ہمارا کام آسان ہو گیا۔" یہاں پہنچ کر پورا ہال تالیوں سے گونج اُٹھا۔ بوڑھا نشست سے اُٹھا، دوبارہ ہیٹ اتار کر ہوا میں لہرایا، سینے پر ہاتھ رکھا اور سٹیج کے اداکاروں کی طرح حاضرین کا شکریہ ادا کر کے واپس چلا گیا۔

..... اور میں جب بھی محفلوں میں "پڑھے لکھے" خواتین و حضرات کے منہ سے علماء کرام کے خلاف "فتوے" سنتا ہوں، نوجوانوں کو اسلام کو (نہود باللہ) تہم فرسودہ اور ناقابل عمل قرار دیتے دیکھتا ہوں، شائستہ خاموش طبع اور ذکر اللہ سے بچکے لوگوں کو "مولوی" کے نام سے مخاطب ہوتے دیکھتا ہوں۔ جب بھی مساجد کے

سامنے کلاشکوف بردار گارڈ دیکھتا ہوں، مختلف مذہبی رہنماؤں کو کیل کانٹے سے لیس باڈی گارڈز کے ساتھ دیکھتا ہوں۔ اخبارات، رسائل اور جرائد کی پھیلائی دس انفارمیشن پر دہرسوں کے معصوم بچوں کو سڑکوں پر توڑ پھوڑ کرتے دیکھتا ہوں، تو میں سوچتا ہوں کہیں سی آئی اے ہیڈ کوارٹر کے کسی کمرے میں بیٹھا کوئی ڈپٹی سیکرٹری، دو کلرک اور ایک چپڑا اسی چند فائیکس، ٹیکس کے چند پیغامات اور ٹیلی فون کی کچھ کالز کی مدد سے اسلام کو اسلامی دنیا میں اجنبی نہ بنا رہے ہوں، اسے فرسودہ، ناقابل عمل اور انسانی فطرت کے خلاف نظام ثابت نہ کر رہے ہوں؟ قارئین کرام! اگر آپ ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچیں تو آپ مجھ سے پورا اتفاق کریں گے کہ اسلام کے خلاف جتنی نفرت اسلام کے ذریعے پھیلائی گئی، مولوی کو جتنا مولوی کے ذریعے ناقابل برداشت بنایا گیا، دوسرے کو دوسرے کے ذریعے جتنا قابل نفرت ثابت کیا گیا اور مسجد کو مسجد کے ذریعے جتنا بدنام (نعوذ باللہ) کیا گیا، اتنا پچھلے دو تین سو برسوں میں یہودیوں، عیسائیوں اور ہندوؤں کے بیانات، خطبات اور تحریروں نے نہیں کیا۔

یقین کیجیے، جب کوئی نوجوان بڑی نفرت سے کہتا ہے یہ "مولوی" تو فوراً میرے دماغ میں ایک بوڑھے اسی کی تصویر ابھر آتی ہے، جو مائیک کو چنگی میں پکڑ کر کہتا ہے: "ویری سیل، ہم نے اسلام کو اتنا کڑا، سخت اور غیر لچک دار بنا دیا کہ وہ لوگوں کے لیے قابل قبول ہی نہ رہا۔" اور بوڑھا کہتا ہے: "ہم نے دنیا پر ثابت کر دیا، جس مذہب میں ایک مولوی دوسرے مولوی کے پاس جیتنے کا روڈ اور نہیں، وہ مذہب جدید دنیا کے انسانوں کے لیے کیسے قابل قبول ہو سکتا ہے۔ ہاں ہم نے ثابت کر دیا جو لوگ معمولی سا اختلاف برداشت نہیں کر سکتے، اپنی مسجد میں کسی دوسرے مسلمان کو داخل ہونے کی اجازت نہیں دے سکتے، وہ جمہوری روایات کی پاسداری کیسے کر سکتے ہیں، ہاں ہم نے ثابت کر دیا، مسلمان پھر کے زمانے کے لوگ ہیں جو ہر سوال کا جواب پھر سے دیتے ہیں۔"

رات کے آخری پہر جب گلی کی ساری بتیاں کبھری چادر اوڑھے سوچتی ہیں، میں سوچ رہا ہوں عالم اسلام میں کوئی ایک بھی ایسا شخص نہیں جو "این کاؤنٹر پراجیکٹ نو" کی فائل پڑھ سکے۔



ایک روٹی کا سوال ہے بابا.....

1974ء کے آغاز میں امریکہ نے ایک خصوصی کمپنی بنائی جس کا کام 2000ء تک درپیش خطرات کی نشاندہی کرنا تھا۔ اس کمپنی نے پچھلے درپے اجلاسوں کے بعد اپریل 74ء میں اپنی سفارشات مرتب کیں۔ ان سفارشات کو کمپنی کے سربراہ اور بین الاقوامی شہرت یافتہ یہودی سفارتکار ہنری کسنجر نے "ایس 200 رپورٹ" کا نام دے کر مئی کے پہلے ہفتے صدر ریکسن کو پیش کر دیا۔ اس خفیہ رپورٹ میں پاکستان، مصر، بنگلہ دیش، ترکی، تاجیکستان اور اندونیشیا میں بڑھتی ہوئی آبادی کو اگلے 25 برسوں میں امریکہ کے لیے سب سے بڑا خطرہ قرار دیا گیا۔ ماہرین نے خیال ظاہر کیا مسلم دنیا میں آبادی بڑھنے سے ان ممالک کی سیاسی، معاشی اور عسکری قوت میں اضافہ ہوگا۔ ان ممالک سے نکلنے والا وہ خام مال جس سے یورپ اور امریکہ کے کارخانوں کی چیمیں گرم ہوتی ہیں، آتا بند ہو جائے گا۔ لوگوں میں قدرتی وسائل کو اپنے قبضے میں رکھنے کا شعور بیدار ہوگا اور اس مراعات یافتہ طبقے کے خلاف موجود عوامی نفرت باقاعدہ تحریکوں کی شکل اختیار کر لے گی جو تیسری دنیا میں امریکی مفادات کی نگہبانی کرتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ خوش قسمتی سے اس رپورٹ پر پالیسی بننے سے قبل ہی ریکسن "ڈائریکٹ سیکنڈل" میں پھنس گیا جس کے نتیجے میں اسے اگست 74ء میں مستعفی ہونا پڑا۔ یوں "ایس 200 رپورٹ" کی یہ فائل داخل دفتر ہو گئی۔

16 اکتوبر 1975ء کو ہنری کسنجر نے اس وقت کے صدر فورڈ کو ایک خط لکھا جس پر "ارجنٹ اینڈ ویری کافیڈنسیل" کی مہر ثبت تھی۔ اس خط میں یہودی سفارتکار نے "ایس 200 رپورٹ" کا حوالہ دے کر صدر سے درخواست کی کہ:

"کیونکہ معاملہ بہت حساس اور فوری نوعیت کا ہے لہذا جتنی جلدی ہو سکے، اس کی منظوری دے دی جائے۔"

اس خط کے ٹھیک چالیس روز بعد 26 نومبر 75ء کو سکو کرافٹ کے دستخطوں سے وائٹ ہاؤس سے ایک آرڈر جاری ہوا جس کا نمبر 314 تھا۔ اس آرڈر کی کاپیاں فوری طور پر وزارت دفاع، خزانہ، خارجہ، چیف آف سٹاف اور سی آئی کے ڈائریکٹر جارج بش کو بھیج دی گئیں۔

اور پھر اس آرڈر کے ذریعے ان چھ مسلم ممالک میں، جہاں سے امریکہ کو مستقبل بعید میں "بغاوت" کے خدشات سر اٹھاتے نظر آ رہے تھے، نس بندی کے فوری اقدامات کا حکم دے دیا گیا کیونکہ (آرڈر کی تحریر کے مطابق) ان چھ ممالک کے مزاج میں بڑی مماثلت ہے۔
تشدوات مذہبی فکر غالب ہے۔

عوام یورپی اقوام سے نفرت کرتے ہیں۔

نفاذ اسلام لوگوں کی پہلی اور آخری خواہش ہے لہذا اگر ابھی سے ان ممالک کی آبادی پر قابو نہ پایا گیا تو اس سیلاب کو واشنگٹن تک پہنچنے میں نہیں لگے گی۔ آرڈر میں بطور مثال مصر کو پیش کیا گیا جس کی آبادی 2000ء تک 85 ملین ہونے کا امکان ہے جبکہ اس کے قدرتی وسائل اور مادی ذرائع اس دباؤ کے تحمل نظر نہیں آتے، چنانچہ یہ آبادی سرحد میں تو ذکر اسرائیل میں داخل ہو جائے گی جس کی آبادی اس وقت تک کسی بھی طرح 33 ملین سے زیادہ نہیں ہوگی۔ اسرائیل کا مسئلہ اس لیے بھی زیادہ گھمبیر ہے کہ غزہ کی پٹی اور مغربی کنارے جیسے علاقوں میں یہودیوں کے مقابلے میں عربوں کی آبادی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ لہذا اگر مصری مسلمانوں کی "نس بندی" نہ کی گئی تو آئندہ اذہابی و ہائیوں میں یہودی اسرائیل میں اقلیت بن کر رہ جائیں گے۔

اس آرڈر میں ان ممالک کی آبادی کمزور کرنے کے لیے 9 طریقے تجویز کیے گئے ہیں۔
(۱) مسلم ممالک میں فیملی پلاننگ کے لیے بھرپور مہم چلائی جائے اور اگر مذہبی عناصر مختلف طبقات اور تنظیمیں اس کے خلاف تحریک چلانے کی کوشش کریں تو انہیں "کرش" کر دیا جائے۔

(۲) سائنسی ہتھکنڈوں کے ذریعے غیر محسوس طریقے سے فیملی پلاننگ کے خلاف کام کرنے والے مذہبی عناصر کو معاشرے سے کاٹ کر الگ کر دیا جائے۔ انہیں لوگوں میں مذاق، تجفیر اور نفرت کی علامت بنا دیا جائے تاکہ کوئی شخص ان کی بات تک سننے کا روادار نہ ہو۔

(۳) آئی ایم ایف کے ذریعے ان ممالک کو شدید ترین اقتصادی دباؤ میں لایا جائے۔

(۴) ترقی یافتہ ممالک کے رہنما ان ممالک کی لیڈر شپ سے ملاقاتوں کے دوران بار بار بڑھتی ہوئی آبادی کی نشاندہی کریں تاکہ وہ احساس کمتری کا شکار ہو جائیں اور یہ "دائع" دھونے کے لیے اپنے سارے وسائل وقف کر دیں۔

(۵) امریکی انتظامیہ تیسری دنیا کے ہم خیال لیڈروں کو دوست ممالک کے رہنماؤں کو قائل کرنے کا "تکلم" دے۔

(۶) وہ تمام جدید طریقے استعمال کیے جائیں جن کے ذریعے عوام میں بڑھتی ہوئی آبادی کے خلاف "شعور" پیدا کیا جاسکتا ہے۔ اس سلسلے میں مقامی دانشوروں، ادیبوں، شاعروں اور ماہرین کو استعمال کیا جائے جو کاہل و جاہل کے ذریعے ثابت کرتے رہیں کہ فلاں سال میں آبادی

اتنی ہوگئی تو اتنا بڑا قحط پڑے گا، اتنی بیماریاں پھیل جائیں گی، رہائش کا اتنا بڑا مسئلہ پیدا ہوگا، بیروزگاری اور جہالت میں اتنے فیصد اضافہ ہوگا، وغیرہ وغیرہ۔

- (۷) اگر ان ممالک میں فوجی آمروں کو حکومت دلا دی جائے تو زیادہ بہتر نتائج حاصل کیے جاسکتے ہیں۔
- (۸) جنگ سے بہتر کوئی طریقہ نہیں جس سے آبادی کنٹرول کی جاسکتی ہے لہذا اگر مسلم دنیا کے باہمی تنازعات بڑھا دیئے جائیں تو امریکہ اپنا قیمتی سرمایہ بچا سکتا ہے۔
- (۹) اگر اوپر دیئے گئے تمام طریقے ناکام ہو جائیں تو امریکی انتظامیہ خوراک کو بطور آخری ہتھیار استعمال کرے اور صرف ان ممالک کو گندم، اویات اور دیگر اشیائے ضروریہ مہیا کرے جو آبادی کم کرنے کا عہد کریں۔

جی ہاں محترم قارئین! یہ ہے وہ سازش جس کے ذریعے پچھلے بیس برسوں سے ان لاکھوں بچوں کو ماؤں کی کوکھ ہی میں دفن کیا جا رہا ہے، جو انقلاب بن کر زمین پر طلوع ہونے تھے۔ ہو سکتا ہے اس ملک کی ساری "امریکے نژاد" اشراف، دانشور اور اکادمیوں میں انکشاف کو بھی فروغ دے دیں لیکن کیا امریکہ مسلم دنیا میں پھیلے ہوئے اپنے ان لاکھوں ایجنٹوں کے باوجود تاریخ سے اپنا بیس سال "ٹریک ریکارڈ" کھرچ سکتا ہے؟ یہ ٹریک ریکارڈ چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے جب اسرائیلی طیاروں نے عراق کے انجینیئرنگ اسکول پر بم برسائے تو امریکی وزیر خارجہ نے کہا "ہم دنیا کا امن پامال کرنے والے عراق کی حمایت نہیں کر سکتے" لیکن جب اسی عراق کی توہیں ایرانی بارڈر پر گازی گئیں تو نہ صرف امریکہ نے اسے انتہائی مہلک اسلحہ دیا بلکہ وہ کیسائی ہتھیار تک مہیا کیے جنہوں نے کردوں کی ایک پوری نسل معدوم بنا دی۔

اور پھر جب صدام ایران سے منہ موڑ کر اچانک امریکی مفادات کے سامنے کھڑا ہو گیا تو یہی امریکہ پوری دنیا کی عسکری قوت کے ساتھ عراق پر چڑھ دوڑا اور آج یہ عالم ہے کہ عراقی ماں کو اذیت سے بللاتے بچے کے لیے پورے بغداد سے درو کی ایک گولی تک نہیں ملتی کہ شفا کے سارے "فراقوں" پر کفن کے پہرے ہیں۔ اور جب پورا یوگپورٹیم کے دور سے پلاٹونیم کے دور میں داخل ہوا تو پاکستان نے "اسلامی بم" بنانے کا اعلان کر دیا، لیکن "ایس 200 رپورٹ" والے ہنری سمیجر نے پاکستان آکر کہا:

"تمہارا خیال ہے تم تباہی کی اس ٹیکنالوجی کو پورے عرب میں پھیلا دو گے۔ نہیں منسٹر پرائم منسٹر! ہم تمہیں دنیا میں عبرت ناک مثال بنادیں گے۔"

اور جب بھارت مقبوضہ کشمیر میں ہزاروں معصوم مسلمان شہریوں کے سینے چاک کر رہا تھا تو پوری دنیا کی مہذب اقوام پانڈا کی کم ہوتی نسل بچانے کے لیے کوشاں تھیں لیکن جب حریت پسندوں نے بندوق اٹھائی تو پوری دنیا کی بیومن رائٹس آرگنائزیشنیں جاگ اٹھیں اور امریکی تو نصر نے وزیراعظم ہاؤس میں کھڑے ہو کر

کہا "اگر آپ لوگوں نے کشمیری دہشت گردوں کی مدد بند نہ کی تو ہم آپ کو دہشت گرد ملک قرار دے دیں گے۔" جی ہاں، امریکی اختیارات ہی نے تو دنیا کو بتایا تھا کہ عراقیوں کو جراثیمی گندم دی جا رہی ہے جو انہیں اندر سے کھوکھلا کر رہی ہے۔ اسرائیل نے مصر میں ایسے بیج سمگل کئے جس سے ساری مصری کھیتیاں صحرا بن گئیں۔ لیبیا میں ہر سال وائرس کا چھڑکاؤ کیا جاتا ہے جس سے ان کی لاکھوں بھیڑیں ہلاک ہو جاتی ہیں۔ سی آئی اے اور موساد پوری مسلم دنیا میں ایڈز سمگل کر رہی ہیں۔ ترکی کی مسجدوں کے تالے کھولنے کے لیے جو پارٹی آتی ہے، اسے تاکام بنادیا جاتا ہے اور تاجنیریا کی اکالوئی کو اس طرح تباہ کر دیا گیا کہ لوگ چند سکوں کے لیے دوست کا گلا کاٹنا جرم نہیں سمجھتے۔ بنگلہ دیش میں نس بندی کرانے والی ہر عورت کو "نشی ساز" دی جاتی ہے اور..... پاکستان، ہاں امریکہ اپنے اتحادیوں کو اشارہ کرتا ہے تو کراچی کے ساحل پر گندم کے جہاز لنگر انداز ہوتے ہیں، ورنہ پشاور کے بازاروں میں ایک آفریدی پنخان بولی دے کر 30 روپے میں ایک روٹی خریدتا ہے۔

ہاں میرے محترم قارئین! کہیں ایسا تو نہیں کہ اس صدی کے آخری سال جب "ایس 200 رپورٹ" کی فائل بند کی جا رہی ہوگی تو ہم چوراہوں میں کھڑے ہو کر ہر گوری چڑی والے کو روک کر کہیں "ہم اپنے ہاتھوں سے اپنے سارے بچے مار دیتے ہیں، بس تم ہمیں ایک روٹی دے دو۔ ایک روٹی کا سوال ہے یا؟"

Kashif Azad @ OneUrdu.com

جی ہاں، بس ایک روٹی کا سوال ہے یا۔



فکری لو لے لنگڑے

ذوالفقار علی بھٹو پوری طرح با اختیار تھے تو ایک بار امریکہ کے دورے پر گئے۔ وہاں بھٹو صاحب کے اعزاز میں پاکستان کے سفارتخانے نے ڈنر کا پروگرام بنایا، جس کی "صدارت" کے لیے ہنری کسنجر کو دعوت دی گئی، جسے انہوں نے سفارتی عملے کی کوششوں اور بھٹو صاحب کی "کرشماتی شخصیت" سے متاثر ہو کر قبول کر لیا، جو یقیناً پاکستانی حکام کے لیے بڑے "اعزاز" کی بات تھی لہذا ڈنر سے دو روز قبل سفارتخانے میں "مینو" تیار کرنے کے لیے اجلاس طلب کیا گیا، جس میں بھٹو صاحب اپنی تمام تر مصروفیات ترک کر کے شریک ہوئے۔ اس اجلاس میں دنیا بھر کے ان تمام کھانوں کا جائزہ لیا گیا، جو ہنری کسنجر کو مرغوب تھے یا جن کے مرغوب ہونے کا امکان تھا۔ کسی نے کہا کسنجر ایک بار حیدر آبادی وال کا براؤز کر رہے تھے۔ کسی نے بتایا بھارتی سفارتخانے کے ایک فنکشن میں انہوں نے برائی کے پورے دو چمچ لیے تھے۔ کوئی بولا "ارے صاحب میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کسنجر کیکڑے کے سوپ کے پورے دو پیالے چڑھا گئے۔" وغیرہ وغیرہ لیکن بھٹو صاحب کا اصرار تھا کیونکہ ایک عرصے بعد امریکی برف ٹوٹی ہے، لہذا یہی وقت ہے جب ہم کسنجر کو کھٹی میٹلے کر امریکیوں کے دل جیت سکتے ہیں، چنانچہ ہمیں مینو میں کوئی ایسی حیرت انگیز چیز رکھنی چاہیے، جو کسنجر کی ساری توجہ کھینچ لے۔ بھٹو صاحب کا حکم تھا، لہذا تمام سفارتی و ماغ اس اہم نکتے پر سر جوڑ کر بیٹھ گئے۔ اچانک ایک صاحب نے سر اٹھایا اور حاضرین کو مخاطب کر کے بولے۔ "کیوں نہ ہم ہنری کسنجر کو کالے بیٹر کھلائیں۔" بس ان لفظوں کا ادا ہونا تھا بھٹو صاحب نے چیخ کر کہا "بس دینے از تحشیں" اور سب کے چہروں پر روشنی پھیل گئی۔ اس کے بعد واقفان حال بتاتے ہیں، پاکستان کا پورا سفارتی عملہ اور بھٹو صاحب کے وفد کے تمام ارکان امریکہ میں کالے بیٹروں کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے، لیکن رات گئے تک کوشش کے باوجود بیٹر دستیاب نہ ہو سکے۔ پھر کسی "سیانے" نے مشورہ دیا۔ جہاز بھیجیں اور کراچی سے جتنے چاہے بیٹر منگوالیں۔" تبوڑ اچھی تھی لہذا وزیراعظم نے فوراً اس نیک کام کے لیے اپنا طیارہ وقف کر دیا۔ قند مختصر اگلے روز وزیراعظم کے طیارے پر دو ہزار بیٹر امریکہ آگئے تو پتہ چلا سفارتخانے کا خانا ماں تو "بیٹر" بنانے کا اہل ہی نہیں۔ اب کیا ہو سکتا تھا، تاچار وزیراعظم کا طیارہ دوبارہ کراچی آیا اور بیٹر بنانے کا "ماہر" لے کر واپس واپس گئے۔ اگلے روز

ڈنر کا دن تھا چنانچہ سارا دن سفارتی عملہ "بیئر" بنانے میں حاشاں کی مدد کرتا رہا۔ شام کو جب "ڈش" تیار ہو گئی تو میز کارڈ پر اس کا خصوصی طور پر اندراج کیا گیا، جس میں مرحوم بیٹروں کی تمام عادات، خصائل اور فوائد کا نہایت خوبصورت انگریزی میں ذکر تھا۔ بہر حال قصہ مزید مختصر، رات کو جب بنری کسنجر نے "پاکستان ہاؤس" میں قدم رنجہ فرمایا تو بھٹو صاحب کو مخاطب کر کے کہنے لگے "مسٹر پرائم منسٹر میں بہت مصروف ہوں، آپ لوگوں کو صرف پندرہ منٹ کہنی دے سکوں گا۔ آئیے کھانے کی میز پر ہی گپ لگاتے ہیں۔" سب نے فوراً گردن ہلا کر ان کی تائیدی جس کے بعد معزز مہمان ایک کرسی پر براجمان ہو گئے۔ سب سے پہلے کسنجر کے سامنے میو رکھا گیا، جو انہوں نے بغیر پڑھے گلاس کے پیچے رکھ دیا۔ پھر بیٹروں کی ٹرے ان کے سامنے لائی گئی، جسے دیکھ کر انہوں نے "ٹوٹھکنکس" کہا اور ملا دی پلٹ سے "کھیرے" کی چند کاشیں اٹھا کر بھٹو صاحب کا "حال چال" پوچھنا شروع کر دیا۔ ابھی یہ گفتگو جاری تھی کہ ان کی سیکرٹری آگے بڑھی اور نہایت احترام سے پوچھا۔ "سر ہمارے لیے کیا حکم ہے۔" کسنجر نے فوراً گھڑی کی طرف دیکھا اور مسکرا کر بھٹو صاحب سے بولا "ٹھیک ہو ویری جج پرائم منسٹر، وی دل میٹ سون" کرسی کھسکائی اور ہاتھ جلاتا ہوا دروازے سے باہر نکل گیا۔

یہ واقعہ ہمارے بزرگ، سابق بیورو کریٹ اور نامور ادیب مختار مسعود نے اپنی نجی مکملوں میں جب بھی سنایا ہم سب نے اسے ایک دلچسپ حکایت، ایک پر جزئیات قصہ سمجھ کر سنا اور بھول گئے لیکن جب کل لاہور کے ایک اعلیٰ عہدیدار نے گورنر ہاؤس میں برطانیہ کی ملکہ معظمہ الزبتھ کی نیفائت کے "مینو" کی تیاری کا احوال سنایا تو بے اختیار یہ بھولا ہوا واقعہ یاد آ گیا۔ بتانے والے نے بتایا ایک روز قبل "مینو" کے لیے باقاعدہ اجلاس بلایا گیا جس کی صدارت گورنر پنجاب نے بذات خود فرمائی جبکہ بیگم صاحبہ چیف کوآرڈینیٹر کی حیثیت سے شریک ہوئیں۔ اجلاس اللہ تعالیٰ کے بابرکت نام سے شروع ہوا جس کے بعد ایک "سیکرٹری صاحب" نے ان تمام کھانوں کی فہرست پڑھ کر سنائی جو ملکہ معظمہ کو زندگی کے مختلف ادوار میں مرغوب رہے۔ فہرست کے اختتام پر جب سیکرٹری نے فخر سے حاضرین کی طرف دیکھا تو جناب صدر نے حیرت سے پوچھا "لیکن یہ ساری معلومات آپ کو کیسے کہاں سے۔" سیکرٹری نے مسکرا کر گردن جھٹکی اور بولا "میں جب برطانیہ میں پڑھ رہا تھا تو ملکہ کا شیف میرا لینڈ لارڈ تھا، چھٹی کے روز ہم ایک دوسرے سے "ویو ایچ پیج" کیا کرتے تھے۔ یہ ساری معلومات ہماری انہی ملاقاتوں کے کوششیں ہیں، جو میں اپنی ڈائری میں نوٹ کرتا رہا۔" گز ویری گند، "جناب صدر نے سیکرٹری کی فراست کی داد دی۔ سیکرٹری تھوڑا سا جھکا اور "ٹھیک ہو" کہہ کر بیٹھا گیا۔ اس کے بعد کوئے سے ایک اور صاحب اٹھے اور جیب سے ایک فہرست نکال کر پڑھنے لگے۔ تقریر کے اختتام پر جب صاحب صدر نے ان کی وسیع معلومات کا مآخذ دریافت فرمایا تو صاحب نے انکشاف کیا "میں نے یہ ساری معلومات شاہی خاندان کے افراد کے انٹرویوز اور اخبارات میں شائع ہونے والی شاہی نیفائتوں کی رودادوں سے جمع کیں کیونکہ مجھے دنیا کے تمام بڑے لوگوں کی دلچسپیاں اور پسند و ناپسند جمع کرنے کا شوق ہے، لہذا میں ملکی اور

غیر ملکی اخبارات کے ایسے تمام حصے کاٹ لیتا ہوں، جن میں ایسی معلومات ہوتی ہیں۔“

گورنر نے اس پر بھی گڑ کہا تو تیسرے شخص نے ایک فہرست نکالی اور پڑھنا شروع کر دی۔ فہرست کے اختتام پر جب اس سے بھی معلومات کے ذرائع دریافت کیے گئے تو اس نے بھی اسی قسم کی ایک کہانی سنا دی، الغرض تمام شرکاء اجلاس کے پاس ایک ایک فہرست تھی، جس کے بارے میں ہر ایک کا دعویٰ تھا کہ اصل معلومات صرف اس کے پاس ہیں۔ گورنر صاحب بری طرح تجسس میں پھنس گئے، لہذا طویل بحث و تجویس کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ ان فہرستوں میں موجود تمام مشترکہ کھانے پکالے جائیں یوں جب اجلاس کے آخر میں ملکہ کے لیے ”مینو“ تیار ہوا تو اس میں صرف 19 کھانے تھے۔

لیکن قارئین کرام! بد قسمتی ملاحظہ فرمائیے ملکہ معظمہ اور ہنری کسینجر کی عادات میں بڑی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے۔ شاید اسی لیے جب ملکہ سیافٹ میں شرکت کے لیے ہال میں داخل ہوئیں تو ان کے سیکرٹری نے آگے بڑھ کر گورنر کے کان میں سرگوشی کی ”ملکہ کا پریز می کھانا لندن سے آتا ہے، پلیز ان سے کھانے کے لیے اصرار نہ کیجیے گا“ اور گورنر صاحب بہادر نگر ان تاج برطانیہ سمیت تمام منتظمین کے چہرے دھواں ہو گئے۔

اگر یہ روایت صحیح اور سچ ہے تو کاش اس وقت محترم مختار مسعود میرے سامنے ہوتے تو میں ان سے پوچھتا ”بابا کیا بھٹو سے تو از شریف تک وقت ایک ہی جگہ ٹھہرا رہا۔“ تو یقیناً وہ اپنے مخصوص فلسفیانہ انداز میں جواب دیتے غلامی جسمانی مجبوری نہیں فکری معذوری ہوتی ہے اور جو لوگ فکری سطح پر لوے نکلزے ہوتے ہیں ان پر وقت کبھی نہیں بدلا کرتا۔ راکھ سو برس بعد بھی راکھ ہی رہتی ہے۔



بھوسے میں دبی آگ

میں اسلام آباد میں "میڈیٹی جرنلشن" کے ساتھ رہتا ہوں، روز میرا ان کے ساتھ ناکرا ہوتا ہے، روز میں ان سے گفتگو کرتا ہوں، روز میں ان سے مایوس ہوتا ہوں، روز مجھے اپنی تنہائی کا احساس ہوتا ہے اور روز میں اس شہر کی گلیوں، بازاروں، ریسٹورانوں اور پارکوں سے دکھ کا احساس لے کر گھر واپس لوٹتا ہوں۔

میں جب بھی ان کے سامنے بھارت کا تذکرہ کرتا ہوں تو یہ لائقیت سے سگریٹ کا کش لیتے ہیں اور مکمل مجاز کر بڑے اطمینان سے کہتے ہیں "آخر بھارت سے دشمنی رکھنے کا کیا فائدہ؟ ہم اسے دوست بنا کر ہمیشہ کے لیے جنگ کے خطرات سے آزاد کیوں نہیں ہو جاتے؟ ہم دس روپے کے بجائے دو روپے نکلاؤ کیوں نہیں خریدتے؟ ہم 65 گے بجائے 18 ہزار میں ملے سائیکل کیوں نہیں لیتے، ہم اپنے سینماؤں میں سبائش مینی کی بنائی فلمیں کیوں نہیں چلاتے۔"

میں جب بھی ان کے سامنے رحمت اللہ علیہ کے ساتھ اکابرین کا نام لیتا ہوں تو یہ بال ماتھے سے پیچھے جھٹک کر پورے "اعتاد" سے کہتے ہیں "آخر ہم قائد اعظم، علامہ اقبال اور لیاقت علی خان کی ڈومینک لائف پر بات کیوں نہیں کر سکتے؟ ان کے ویسٹرن ویس آف لائف پر ڈسکشن کیوں نہیں ہو سکتی، ادھر بھارت میں تو نہرو کی رومانوی زندگی پر پی ایچ ڈی کا مقالہ تک لکھا گیا۔"

میں جب بھی ان کے سامنے یہودیوں کو عالم اسلام کا دشمن قرار دیتا ہوں تو یہ سب کو میلی جینز پر رگڑ کر چمکاتے ہیں اور پھر کچر کچر چباتے ہوئے کہتے ہیں "آخر ہم سن جیٹ القوم ان یہودیوں سے نفرت کیوں کرتے ہیں جو پوری انسانیت کے "محسن" ہیں جنہوں نے دنیا کی 70 فیصد ایجادات کیں، جنہوں نے دنیا کے بڑے بڑے فلاحی اداروں کی بنیاد رکھی، جنہوں نے ویلفیئر سٹیشن کا تصور دیا اور جو مازون سامنز میں ترقی کا باعث ہے۔ آخر ہم اپنے "محسنوں" کو تنہا رکھیں سمجھتے ہیں؟"

میں جب بھی ان کے سامنے پاک آرمی کا ذکر منونیت سے کرتا ہوں تو وہ چٹکی بجا کر طنزیہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہیں اور پھر لفظ چپا چپا کر کہتے ہیں "آخر دنیا کا 127 واں غریب ملک اپنے بجٹ کا 28.6 فیصد دفاع پر کیوں خرچ کرتا ہے؟ جس ملک کے بہتانوں میں دسپرین تک دستیاب نہیں، اسے ایٹم بنانے کی

کیا ضرورت ہے؟ جس ملک کے شہریوں کے لیے گندم تک خریدی جاتی ہے، اسے سات لاکھ فوج پالنے کی ضرورت ہے؟ جس ملک کے زیادہ تر پرائمری سکول برآمد کے نیچے قائم ہیں، اس کے لیے ایف 16 اور میراج کیوں ضروری ہیں؟

میں جب بھی ان کے سامنے ہتھوڑا خواہ پاکستان کے خلاف سازش قرار دیتا ہوں تو یہ برگر کی پیننگ ہاتھ میں ملتے ہیں، اس کا گولا بناتے ہیں اور پھر اسے ٹھنڈا مار کر کہتے ہیں۔ "اگر سرحد کو ہتھوڑا خواہ کہہ لیا جائے، بلوچستان کو گریٹر بلوچستان اور سندھ کو سندھو دیش تو کیا فرق پڑتا ہے؟ اگر ایک کے بجائے چھوٹے چھوٹے چار ملک بن جائیں تو کیا مضائقہ ہے، مقبوضہ کشمیر بھارت ہی کے پاس رہنے دیا جائے تو کیا حرج ہے، گلگت اور بلتستان ادھر جائے یا ادھر، کیا نقصان ہے؟ تقسیم کی ایک اور لکیر کھینچ کر جغرافیہ درست کر دیا جائے تو کیا جاتا ہے؟" میں جب بھی ان کے سامنے اسلام کو پاکستان کی آخری منزل کہتا ہوں تو یہ بیڑے کے خالی ٹن ہوا میں اچھال کر کہتے ہیں "ہم اسلام کے بجائے انسانیت کے لیے جنگ کیوں نہیں لڑتے، شخصی آزادیوں اور انسانی حقوق کے لیے کوشش کیوں نہیں کرتے، لیبرل ازم، قلبی وسعت اور باطنی کشادگی کے لیے جدوجہد کیوں نہیں کرتے؟"

ہاں محترم قارئین، میں جب بھی اس نئی نسل سے جا ملے خیالات کرتا ہوں تو مجھے ان میں سے اکثر اجنبی اجنبی سے محسوس ہوتے ہیں، جیسے ان کا اس زمین، اس کی آبیاری، اس کے پتھر اور اس کے بیک گراؤنڈ سے کوئی تعلق نہیں، جیسے بھارت ان کا نہیں پاکستان کا دشمن ہے، جیسے قائد اعظم ان کے نہیں پاکستانیوں کے لیڈر ہیں، جیسے اسرائیل ان کا نہیں پاکستان کا مسئلہ ہے، جیسے فوج ان کی نہیں پاکستان کی محافظ ہے، جیسے کشمیر ان کے لیے نہیں پاکستان کے لیے اہم ہے اور جیسے اسلام ان کی نہیں پاکستانیوں کی آخری منزل ہے۔ ہاں محترم قارئین، مجھے یہ لوگ پاکستان سے الگ نظر آتے ہیں، کسی دوسرے ملک کے باسی، کسی دوسرے سیارے کے شہری، جو چند دنوں کے لیے یہاں آئے ہیں اور جو گھوم پھر کر واپس چلے جائیں گے۔ یقین کریں ان لوگوں کو اس زمین سے اتنی بھی دلچسپی نہیں جتنی کسی سیاح کو کسی اجنبی مقام سے ہوتی ہے۔

ادھر میرا تعلق ایک پسماندہ دیہاتی علاقے سے ہے جہاں ان پڑھ، سادہ اور محروم لوگ بستے ہیں، جہاں جو ان کم اور بوز سے زیادہ ہیں۔ میں جب "ممی ڈیڈی" لوگوں سے نکل کر لالہ موتی جاتا ہوں، جب اپنے لوگوں سے ملتا ہوں، پرانی ہتھکڑیوں، کھلے چوپالوں اور سینکڑوں زوہ دیوڑھیوں میں کھانستے، لرزتے، کانپتے اور کانوں پر ہاتھ رکھ کر بدلتے وقت کی آواز سننے کی کوشش کرتے بوزھوں سے ملاقات کرتا ہوں تو میں انہیں پاکستان کے لیے مشکوک پاتا ہوں، ہندو کو ازلی دشمن کہتے سنتا ہوں، قائد اعظم کی تصویر کو چومتے اور علامہ اقبال کو رحمت اللہ علیہ کہتے دیکھتا ہوں، یہودیوں کو پورے عالم اسلام کا مخالف کہتے پاتا ہوں، پاک فوج کو ملکی بھاء کا آخری ہتھیار کہتے سنتا ہوں، پاکستان کی سلامتی کے لیے ہزار بار قربان ہونے کے لیے تیار پاتا ہوں، اسلام کو

انسانیت کا دوسرا نام قرار دیتے دیکھتا ہوں، تو فوراً میرے ذہن میں خیال آتا ہے کہیں پاکستان اور پاکستانیت صرف ان لوگوں تک محدود ہو کر تو نہیں رہ گئی، جنہوں نے آزادی کے لیے ہجرت کے دکھ سے، جنہوں نے ہندوؤں کے ظلم و ستم برداشت کیے، جنہوں نے گھریا چھوڑے، جنہوں نے اپنے آدھے آدھے خاندان کو کنوا کر آزادی دیکھی، جنہوں نے کانٹوں سے گزر کر پھولوں کی باس سونگھی اور جنہوں نے لمبی بھوک کے بعد دانہ گندم کا ذائقہ چکھایا ان لوگوں میں محصور ہو کر رہ گئی ہے جو بڑے شہروں سے دور ہیں، جو خوشحالی اور ترقی سے بے بہرہ ہیں، جو آج بھی صرف ریڈیو پاکستان ہی کو حرف آخر سمجھتے ہیں، جو پاکستان کے ساتھ لا الہ الا اللہ کا ورد کرتے ہیں۔

اگر کوئی شخص نہایت ایمان داری سے ان دو دنیاؤں کا جائزہ لے، ان دونوں کا مشاہدہ کرے تو شاید اسے دکھ کے ساتھ یہ اعلان کرنا پڑے کہ نظریہ پاکستان صرف یوڑھی نسل تک محدود ہو کر رہ چکا ہے۔ پاکستان کی محبت دیہاتوں اور قصبوں میں محصور ہو کر رہ گئی ہے، پاکستان کی ہمت کے لیے جان قربان کرنا اور اس کی ایک ایک انچ کی حفاظت صرف ساتھ ستر برس کے کھانسنے، لڑتے پختونخواہ کے مطالبے نے جتنا بزرگوں کو مجروح کیا، اتنے دکھ، اتنے درد کا اظہار فوجان نسل بالخصوص شہروں میں بسنے والی نوجوان نسل نے نہیں کیا، وہ فینٹک، وہ جذبات آج کی جینز، جیکٹ، برگر اور کوک جزیشن سے شرم نہیں ہوئے جو بزرگوں نے فراموش کیے، جو چھوٹے شہروں سے اٹھ رہے۔

یوں محسوس ہوتا ہے نظریاتی عدم توجہ، فکری تربیت کی کمی، بھارت کی ثقافتی یلغار اور معیشت کا مصنوعی خوف، پرانی اور نئی نسل کے درمیان اتنی بڑی علیحدگی بن کر حائل ہو چکا ہے کہ اب وہ اپنے اپنے کناروں پر کھڑے ہو کر ایک دوسرے کی آواز تک نہیں سن سکتے اور شاید یہ اسی نظریاتی بحران ہی کا نتیجہ ہے کہ آج پختونخواہ کے مسئلے پر اسے این پی سے جتا ب مجید نظامی، منیا شاہد اور انگل نسیم انور بیگ جیسے بزرگ لڑ رہے ہیں یا پھر اندرون ملک آباد نسیم خواندہ لوگ جبکہ آج کا نوجوان نہ صرف پختونخواہ کے مسئلے پر خاموش ہے، بلکہ وہ قائد اعظم کی توہین، بھارت کے ساتھ تجارت، انٹی پروگرام کیپ کرنے اور سی ڈبلیو سی پر دستخط کرنے کے ایٹوز پر بھی کسی قسم کا رد عمل ظاہر نہیں کر رہا۔

کتنے دکھ کی بات ہے، اس قوم کو پوری مہینہ گرج کے ساتھ اکیسویں صدی میں لے جانے کے خواہاں حکمران اس سنگین بحران کی آہٹ تک نہیں سن رہے، انہیں معنی سے سرکری ریت کا احساس تک نہیں ہو رہا، انہیں یہ تک خبر نہیں ہو رہی کہ انہیں کا ایک ایسا لشکر جہاد تیار ہو چکا ہے جسے پاکستان کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں، جو ماداموری کو اپنی ہیروئن اور تجھے دت کو اپنا ہیرو مان چکا ہے۔

میں کبھی کبھی سوچتا ہوں شاید ان انجمن ڈرامیوروں کی طرح، جو بوگیاں پلیٹ فارم پر چھوڑ کر سفر پر نکل جاتے ہیں، ہمارے پالیسی ساز بھی اسے اسی لیے سے بے خبر ہیں۔ وہ اس "ممی ڈیڈی جزیشن" سے ناواقف

ہیں، وہ بھارتی کچھ اور بھارت کی فکر سے متاثر ان ”بھارتیوں“ کے وجود سے لاتعلق ہیں مجھے خطرہ ہے اگر یہ بے خبری یہ تاواقفیت اور یہ لاتعلقی شتم نہ ہوئی، نظریہ پاکستان، ملک سے محبت اور مٹی کے لیے کٹ مرنے کے جذبات چھوٹے شہروں سے نکل کر بڑے شہروں تک نہ پہنچے، لاغر بوزھوں سے نوجوان نسل میں منتقل نہ ہوئے تو چند برس بعد صوبہ سرحد کا نام ”باجا سٹیٹ“ بھی رکھ دیا گیا تو شاید پورے ملک سے احتجاج کے لیے کوئی باہر نہ نکلے۔

سیانے کہتے ہیں اگر بھوسے میں مچھلی چنگاریاں بروقت نہ بجھائی جائیں تو پورا گاؤں جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

ویڈیو جزیعش

میرا دوست اپنے بچوں کی وجہ سے پریشان ہے۔

اس کا کہنا ہے اس کے بچے عجیب ہیں، ڈھیلی شرٹیں اور گھٹنوں تک بے ڈھنگے "کچھے" پہن کر پھرتے رہتے ہیں، رات ڈیڑھ دو بجے تک قلمیں دیکھتے ہیں، میوزک سنتے اور تاش کھیلے ہیں، دن گیارہ بجے تک بستر پر پڑے رہتے ہیں، لینے لینے چائے کی "کچی" کرتے ہیں، نوای کو "اپنی ماں" بولتے ہیں، انگریزی رسالے اور تنگی تصویروں والی کتابیں پڑھتے ہیں، برگر کھاتے ہیں اور چیری کی باتیں کرتے ہیں، فرینکفرٹ، لندن، جیرس اور واشنگٹن کا ذکر ایسے کرتے ہیں جیسے وہاں ان کی "بھیمبی" رہتی ہے، باقاعدہ ویک اینڈ مناتے ہیں، کرکس کا پروگرام بناتے ہیں اور "اپریل فون" کو عبادت سمجھتے ہیں۔

Kashif Azad

میرا دوست ابھی اپنے بچوں کی وجہ سے پریشان ہے۔

اس کا کہنا ہے اس کے بچوں نے بڑا ہو کر اسے ابا کے بجائے ڈیڈ کہنا شروع کر دیا ہے، دو روپے کو ڈالر اور سینٹ کے سامنے کھڑا کر کے دیکھتے ہیں، لنگن، چرچل، بٹلر، نیولین اور جارج ان کے لیڈر ہیں، نطفے، برنارڈ شا، رسل، کیٹس، کالرج اور فیکسٹر ان کے شاعر ہیں۔ جیکسن، میڈونا، آرٹلڈ، ویڈیم، سنون، راجر سور، نموتھی اور کوئین ان کے ہیرو ہیں۔ وہ پائن اپیل کھاتے ہیں، سلاکس کا ناشتہ کرتے ہیں۔ لچ اور ڈنر کرتے ہیں، شیمپین، جانی واکر اور جن کا تذکرہ کرتے ہیں، کافی پیتے اور سوپ لیتے ہیں، انہیں درونہیں "چین" ہوتا ہے، پریشانی نہیں "ڈپریشن" ہوتا ہے، وہ تنہائی نہیں "لوٹی ٹیسی" محسوس کرتے ہیں، وہ خوش نہیں ہوتے "انجوائے" کرتے ہیں، انہیں خدا نہیں "گاڈ" یاد آیا ہے، انہیں دکھ نہیں "او، نو" ہوتا ہے، وہ سلام نہیں "ہائے" کرتے ہیں۔

میرا تیسرا دوست ابھی اپنے بچوں کی وجہ سے پریشان ہے۔

اس کا کہنا ہے اس کے بچے فردوسی کو خاتون سمجھتے ہیں، سعدی کو کپڑا بیچنے والا شخص کہتے ہیں، غالب کو کوئی شاعر دائر، اقبال کو مولوی اور فیض کو سرخا کہتے ہیں، وہ قرآن مجید کو "بک" اور نماز کو "یوگا" سمجھتے ہیں، وہ مکہ مکرمہ کو مسلمانوں کا دینی گھر کہتے ہیں، وہ نبی اکرم ﷺ کو "دی مسلم لیڈر" پکارتے ہیں، انہیں دوسرا کلمہ نہیں آیا، وہ نماز نہیں پڑھ سکتے، جنازے میں شریک نہیں ہو سکتے، وضو اور طہارت کے اصولوں سے نااہل ہیں،

کھڑے ہو کر پیشاب کرتے ہیں، گھوم بھر کر کھاتے ہیں، وہ جوتے پہن کر سوتے ہیں، وہ اخلاقی پابندیوں کو "ہیومن رائٹس" کی خلاف ورزی کہتے ہیں، وہ رشتہ کی محسوس اور اسرائیل کو حق بجانب قرار دیتے ہیں۔

میرا ایک اور دوست بھی اپنے بچوں کی وجہ سے پریشان ہے۔

اس کا کہنا ہے اس کے بچے، بہنوئی کو جیاجی، مشکل کو کھٹائی، معافی کو شام، خط کو پتہ، مبارک کو بدھائی، وجہ کو کارن اور منظوری کو آشر باد لکھ جاتے ہیں، وہ سب کو کھ بولتے ہیں، پچھ کوف، کہہ جاتے ہیں، انہیں دیوانی اور ہولی کی ساری رسمیں یاد ہیں، وہ سندور کو پوتر اور گلے کی زنجیر کو منگل سوتر سمجھتے ہیں، وہ ہاتھ باندھ کر منستے کرتے ہیں، دعوتی اور سازشی کو قومی لباس سمجھتے ہیں، میرے چھوٹے بیٹے کو "سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا" پورا یاد ہے، میری بیٹی مانتے پر کبھی کبھار بندیا لگا لیتی ہے، میرا بڑا بیٹا کبھی کبھار غفلت "اشلوک" پڑھنا شروع کر دیتا ہے اور میرا سب سے چھوٹا بیٹا مجھ سے پوچھتا ہے "پتا جی! کیا سارے مسئلے راکھشس ہوتے ہیں؟"

میرا ایک اور بزرگ دوست بھی بڑا پریشان ہے۔

اس کے ایک بچے نے گیتا پڑھنا شروع کر دی ہے۔ دوسرا بائبل کا مطالعہ کر رہا ہے، تیسرا اپنی بن چکا ہے اور بنی "نن" بنا چاہتی ہے، سب کی گرل فرینڈز اور بوائے فرینڈز ہیں، سب ایک دوسرے کو دوش کارڈ بھیجتے ہیں "گفت" پیش کرتے ہیں، دوستوں کو کنٹری سائینڈ پر پلنگ پارٹیوں کی دعوت دیتے ہیں، ایک دوسرے سے ملنے ملاتے وقت ممالک طے کرتے ہیں، ڈرنسٹ، ایس سب کچھ برداشت کرتے ہیں، اکتے پالتے ہیں، "راک اینڈ رول" پر گھنٹوں ڈانس کرتے ہیں، "واک" پر جاتے ہیں، ڈاننگ کرتے ہیں، مساج کرتے ہیں، بال ڈانسی کرتے ہیں، وگ لگاتے ہیں، میک اپ کرتے ہیں، پونیاں بناتے ہیں، بچتی ہوئی بھدی اور غلیظ جینز پہنتے ہیں اور ایک پیسے پر سونڈ سائیکل چلاتے ہیں۔

جی نہیں، آپ غلط سمجھ رہے ہیں، میرے ان تمام دوستوں کا تعلق، یورپ امریکہ اور بھارت سے نہیں، یہ سب پاکستانی ہیں، یہ سب پاکستان میں رہتے ہیں، ان سب کے بچے پاکستان میں پیدا ہوئے، ان سب کے بچوں نے کبھی یورپ اور امریکہ کی شکل نہیں دیکھی اور یہ سب لوگ کبھی واپس کے پار نہیں گئے۔ بس ان سے اتنی بھول ہوئی کہ ان لوگوں نے سول سروس جوائن کر لی، فوج میں کمیشن لے لیا یا بزنس شروع کر دیا اور اپنے بچوں کو چھوڑ کا، کاہنہ کا چھما، خنڈو آدم، احمد پور شرقیہ اور لالہ موسیٰ سے کراچی، لاہور اور اسلام آباد لے آئے اور اس کے بعد جب جائز ناجائز میسے کی ریل تیل ہوئی تو انہوں نے اپنے بچپن کی محرومیوں کی "تلافی" شروع کر دی۔ بچوں کو ٹاٹ سکولوں سے اٹھوا کر ٹیکن ہاؤس، امریکن سکول اور سنی پبلک سکول میں داخل کر دیا۔ ان کے ہاتھوں سے قاعدے اور سپاہی لے کر انہیں آزاد انسان بنانا شروع کر دیا۔ ڈانٹ ڈپٹ کو ہیومن رائٹس کی خلاف ورزی سمجھ کر ترک کر دیا، ان کے ہاتھ میں آکسفورڈ پریس اور پیگمونی کی کتابیں پکڑا دیں، انہیں وی سی آر اور ڈش کے سامنے بٹھا دیا، یہ جانتے ہوئے بھی کہ جس کچھر میں زیادہ لذت، زیادہ شہوت اور زیادہ

تحمل ہوتی ہے وہ کمزور، بوسیدہ اور چنیدہ ثقافت کو نگل جاتا ہے لہذا آج ان کے بچے ان کے بچے نہیں رہے۔
 جارج، قلب اور ایلزبتھ کے بچے بن چکے ہیں، پاکستان کے نہیں بھارت ماما کے سہوت بن چکے ہیں۔
 جی ہاں ہم اپنی نسوں سے ایک ایسی نسل پیدا کر چکے ہیں جو ہماری نہیں، بلکہ یہ کہا جائے یہ نسل کسی کی
 بھی نہیں تو مبالغہ نہیں ہوگا کہ نس کی چال چلنے والے کوؤں کو نس قبول کرتے ہیں اور نہ ہی کوئے۔
 ہو سکتا ہے یہ مسئلہ صرف میرے چند دوستوں کا ہوتا تو میں اسے ایک حادثہ سمجھ کر بھول جاتا لیکن میں
 پاکستان کے تمام چھوٹے بڑے شہروں میں پروان چڑھتی نسل کو اسی آگ میں جلتے دیکھ رہا ہوں کیونکہ اب
 اسلام آباد اور ڈونگہ بونگہ کی ثقافت میں زیادہ فرق نہیں رہا۔ اب آپ مچھو کی ملیاں اور فورٹ عباس میں بھی
 میڈونا کے گانے سن سکتے ہیں، لمبی شرٹوں اور چھوٹے کھون میں ملیوں تو جوان دیکھ سکتے ہیں، لمبے بالوں اور
 پھٹی پتلونوں والی نسل کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

گارے کی دیوار

ایک دن کے لیے ہاں صرف ایک دن کے لیے انٹر کنڈیشنز کا سوچ آف کر دیں، اپنی بڑی گاڑی کیراج میں بند کر دیں، منرل وانر کی بوجھ کو منہ نہ لگائیں، سلائس پر ٹھکن کی تہہ نہ جمائیں، مینیا کی کافی میں ہالینڈ کا دودھ نہ ملائیں، جاپانی مشینوں پر باریک سوتی دھاگے سے بنی کائن پر فرانس کی خوشبو نہ لگائیں، اٹلی کا جوتا نہ پہنیں، امریکی فارمولے سے بال ڈائی نہ کریں، برازیلی بید کی چھری پکڑ کر مارگلہ روڈ پر سیر نہ کریں، لمبے کانوں اور چھوٹی دم والے جرمن کتے سے گفتگو نہ کریں، امریکی دوستوں کے اصولوں کی ڈانگیں نہ ماریں۔

ہاں! صرف ایک دن کے لیے اپنے گھروں سے نکل کر چکوال، بہاولنگر، مخدو آدم، جیکب آباد، چنچو کی ملیاں، مردان اور گواڈر میں پھیل جائیں اور کھال میں اتھرتی مگرمی، وجود سے اتھرتی جیس اور جسم سے جدا ہوتی زندگی کے درمیان کھڑے ہو جائیں، اپنے ہی کندھوں پر اپنے جنازے اٹھا کر پھرتے لوگوں کو مخاطب کریں، انہیں بتائیں وزیر اعظم اسلام تانڈا کرنے کا اعلان کر چکے ہیں، پھر وہ لوگ جو جواب دیں اسے باندھ کر واپس گھروں کو لوٹ آئیں اور پھر امریکی دوستوں کے اصولوں کی ڈانگیں مارتے ہوئے، اپنے جرمن کتوں سے گفتگو کرتے ہوئے، مارگلہ روڈ پر واک کے لیے نکلتے ہوئے، بال ڈائی کرتے ہوئے، نرم جوتا پہنتے ہوئے، خوشبو لگاتے ہوئے، گاڑی کے شیشے چڑھاتے ہوئے اور انٹر کنڈیشنز کے ٹھرموسیت کی تاب گھماتے ہوئے ایک لمحے کے لیے ہاں صرف ایک لمحے کے لیے سوچیں، کیا اربوں روپے سے تعمیر کردہ اس پارلیمنٹ کے رخ بست ہال میں پیش کیا جانے والا اسلام اس ملک کے ان 70 فیصد لوگوں کو پانی کا ایک صاف گلاس فراہم کر سکتا ہے جو صدیوں سے کچڑ چھان کر پیتے آ رہے ہیں۔ ان ۱۳ کروڑ لوگوں کی پٹاریوں، تحصیل داروں، تھانیداروں اور محروں سے جان چھڑا سکتا ہے جو پچاس برس سے گھروں میں دیکھے بیٹھے ہیں، ان گیارہ لاکھ نوجوانوں کو ملازمتیں دلا سکتا ہے جو پانچ برس سے ڈگریاں ہاتھ میں لیے مارے مارے پھر رہے ہیں، ان ایک کروڑ مظلوموں کو انصاف دلا سکتا ہے جو برسوں سے ایک عدالت سے دوسری اور دوسری سے تیسری سرکار کے سامنے پیش ہو رہے ہیں۔

جی ہاں اپنی بید کی چھری، خوشبودار سگار اور جراثیم سے پاک گلاس سے پوچھئے کیا یہ اسلام پیئے سے

شرابور بد بودار انسانوں کو پارلیمنٹ میں داخلے کی اجازت دلا دے گا، پہلے، دوسرے اور تیسرے طبقے کے درمیان کھڑی دیواریں گرا دے گا، اچکی من اور ٹاٹ من کا درمیانی فاصلہ مٹا دے گا، بیمار کو گولی، ضرورت مند کو رقم اور مظلوم کو زبان دے گا، صدر کو چھوٹے گھر، وزیر اعظم کو سڑک اور وزیر کو گلی محلے میں سمجھ لائے گا، سیکرٹریوں، ایڈیشنل سیکرٹریوں، ججوں، کشنروں اور ایس بیوں کو بسوں و ٹیکوں اور تاکوں میں لا بٹھائے گا، دفاتروں سے پتلیں، اردلی، ہیرے، جینگے، گیٹ، استقبالیے ختم کرادے گا، گردنوں سے سریے، آوازوں سے "ہم" اور آنکھوں سے قبر خارج کر دے گا۔

جی ہاں اپنی کافی، اپنے سلاکس اور اپنی انگریزی سے پوچھئے کیا یہ اسلام پر دو ٹوکلی پتھر کر دے گا، وی آئی پی لاؤنچ ختم کر دے گا، ہوٹروں کا گلا دبا دے گا، چنوں، ٹیلی فونوں اور بریف کیسوں کا زہر مار دے گا، نواز شریف اور نواز کے فرق مٹا دے گا، بے نظیر اور مائی جی راں کو ایک صف میں لا کھڑا کرے گا، شباشہ شریف اور شباشہ کی تفریق اڑا دے گا، آصف علی زرداری اور آسودہ منبری کو جیل کی ایک ہی گاڑی میں عدالت تک لے آئے گا، آجھو ۳۲۰ کو بھی زرداری کی طرح رجسٹرار کے دفتر میں بیگم سے ملاقات کی اجازت دلا دے گا، گاؤں کے جوہڑ پر ایک دوسرے کے منہ پر کیچڑ ملتے بلاول اور بختاورد کو دعویٰ کے سکولوں میں داخلہ دلا دے گا، حسین نواز اور حسنین کو ایک ہی رکشے میں بٹھائے گا، شیخ رشید اور شیدے موحی کو ایک ہی قطار میں کھڑا کر دے گا، سر ساجد عزیز اور تاجیہ خوالدار کی مراعات برابر کر دے گا اور مہتاب عباسی اور تاجیہ تانہانی کو ایک ہی تھڑے پر لا بٹھائے گا۔

جی ہاں اپنے انٹر کنڈیشنر، اپنی وارڈ روبا اور اپنے بریف کیس سے پوچھئے، یہ اسلام جاگیرداروں کے ڈمروں پر بیٹھے ۶۰ لاکھ غلاموں کو آزادی دلا دے گا، کارخانوں کی جینٹیوں کو جسم کا ایندھن دینے والے کارکنوں کو وقت پر تنخواہ دلا دے گا، پتھر ملی زمین پر اہل چلانے والے دریہ و دامن و ہتھکڑوں کو سال بھر کا آنا دلا دے گا، دوزخ و دپہروں اور برف صبحوں میں روزی کے لیے گھروں سے نکلنے والے مزدوروں کی جھولی میں چند مٹھیاں گندم ڈال دے گا، روتے بچوں کے آنسو پونچھ ڈالے گا، بیواؤں کا خوف چوس لے گا، یتیموں کے سروں پر سایہ بن جائے گا، بے آسروں کو آسرا دے گا۔

جی ہاں اپنی مجبیر وز، اپنے سیکرٹری اور اپنی چیک بکس سے پوچھیں، کیا یہ اسلام مولویوں، طالب علموں اور پرائمری جماعتوں کے استادوں کو ارکان اسمبلی منتخب ہونے کی اجازت دے گا، سارے بد معاش، رورے گیر، ڈاکو اور چور ارکان اسمبلی کو جیل بھجوا دے گا، سارے قبضے چھڑا دے گا، سارے کیٹشنوں کا حساب بے باق کر دے گا، میرٹ واپس لے آئے گا، قانون کی عمل برداری کرادے گا، اخلاقیات کو آئین بنا دے گا، تاجروں کو حضرت عثمان غنی کا ہیرہ دے گا، اور حکمرانوں کو حضرت عمرؓ کا "سنٹی" بنا دے گا، عالموں کو وزیر اور پریزیمڈوں کو مشیر بنا دے گا، عوام کو آئین اور پسے ہوئے اور محروم لوگوں کو عہدیدار بنا دے گا، کیا یہ اسلام ۱۳ سو سال پرانا معاشرہ

پلٹ دے گا، زر پرستی اور عیش کوشی مٹی میں ملا دے گا، لبادے پھاڑ دے گا، تنی گردنیں کاٹ دے گا، مغرور زبانیں کھینچ لے گا، کابل وجود نابود کر دے گا، گڈریوں اور اونٹ ہانوں کو منصب دار اور سرداروں کو اونٹ بان اور گڈریے بنا دے گا۔

جی ہاں پوچھئے اپنے آپ سے سوال کیجیے ایک لمحے کے لیے منزل وائر، سلاخوں، کانپوں، خوشبوؤں، جرمن کتوں اور امریکی فارمولوں سے باہر نکل کر سوچئے، کیا واقعی یہ وہی اسلام ہے۔ جس کی بنیاد آقا نادر علیہ السلام نے رکھی تھی اور جسے بعد ازاں عمر فاروقؓ نے پوری دنیا میں پھیلا دیا تھا، پوچھئے اپنے آپ سے سوال کیجیے کیا آپ کا اسلام طبقاتی تفریق مٹاتا ہے، گورے اور کالے کی تمیز ختم کرتا ہے، عربی اور نجی کی دیواریں گراتا ہے، انسان کو انسان سمجھتا ہے، مظلوم کی آہ سے ڈرتا اور خدا کے قہر سے کانپتا ہے، اگر نہیں تو پھر آپ کونسا اسلام نافذ کر رہے ہیں، آپ کا اسلام کیسا اسلام ہے۔ جس کے دامن میں تازہ ہوا کا کوئی جھونکا نہیں، کوئی اصلاح، کوئی تبدیلی نہیں۔

میاں صاحب! خدا کے لیے میاں صاحب گارے کی دیوار کو ہز رنگ دے کر کنکریٹ بنانے کی کوشش نہ کریں کہ مٹی کی دیوار خواہ کتنی ہی مضبوط نظر کیوں نہ آئے، ہوتی آخر مٹی ہی ہے جسے چند ہونہیں بھر بھرا کر دیتی ہیں، جسے چند مھینے فنا کر دیتے ہیں۔

Kashif Azad @ OneUrdu.com



بھیڑیں

کہتے ہیں جب بھیڑیں سڑ پر نکلتی ہیں تو سب سے کمزور، بیمار اور نحیف بھیڑ مٹنے کے آخر میں سر نہیں اٹھاتا، زبان باہر نکالے، لنگڑاتی ہوئی آہستہ آہستہ چلتی ہے، سڑ کے دوران اگر خدا نخواستہ سامنے سے کوئی آفت یا عذاب آجائے، راستہ بند ہو جائے، ناقابل عبور چیز خائی سامنے آکھڑی ہو یا کوئی درندہ ان پر حملہ آور ہو جائے تو سارا گھوڑا پلٹ جاتا ہے، جس کے بعد آخر میں چلنے والی وہی کمزور، نحیف اور لاغر بھیڑ ”میر کارواں“ بن جاتی ہے اور پھر ساری بھیڑیں اسے لیڈر مان کر سر جھکائے آہستہ آہستہ اس کے پیچھے چلنا شروع کر دیتی ہیں۔ تاہم کبھی کوئی دوسری آفت انہیں بھر پلٹنے پر مجبور نہ کر دے۔

مجھے نہیں خبر وہ کون سی آفت، کون سا عذاب یا کون سا بوجھ پڑتا تھا، جو اگر وہ لوگوں کے اس رویہ پر اترا، انہوں نے اپنا رخ پلٹا اور ذہنی طور پر لوٹے، لنگڑے، بہرے اور نابالغ لوگ میر کارواں بن گئے، ورنہ اس خطے میں کیا کمی تھی۔

یہاں قائد اعظم تھے، بات انگریزی میں کرتے اور سننے والے اردو تک سے نااہل ہوتے، لیکن ایک ایک شخص اٹھ کر گواہی دیتا، یہ شخص جو کچھ کہہ رہا ہے وہ دنیا کا سب سے بڑا جج ہے۔ لیاقت علی خان تھے، جب مرے تو جیب میں چند روپے اور ایجن کے نیچے چھٹی ہوئی بنیان تھی۔ غلام محمد تھے۔ جن پر تمام تر غیر جمہوری رویوں کے باوجود کوئی شخص بے ایمانی، کفر ذہنی اور تساہل کا الزام نہیں لگا سکتا۔ اخلاص، ایمانداری اور ذہانت کے مرقع چودھری محمد علی تھے۔ محمد علی بوگرا تھے، وزارت عظمیٰ کا تھ سے نکلی تو دوبارہ سفارت قبول کرتے ایک منٹ نہ لگا۔ عبدالرب نشتر تھے، جن کے بچے گورنر ہاؤس سے پیدل سکول جاتے تھے، سکندر مرزا تھے، جن کی آخری عمر لندن کے ایک ہوٹل میں معمولی سی ملازمت کرتے گزری، ایوب خان تھے، جو ایوان صدر کے ایک ایک روپے کا حساب رکھتے تھے۔ ذوالفقار علی بھٹو تھے، جو شرابی، منکر اور سیکر ہونے کے باوجود ذہانت، مطالعے اور خطابت میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ضیاء الحق تھے، جن کی بردباری، پرہیزی گاری اور مہمان نوازی کی گواہی کون نہیں دیتا۔

یہاں عبد الغفار خان جیسا سیاستدان تھا، لاکھ اعتراضات کے باوجود بے پورے برصغیر میں یکساں

محبت اور احترام سے دیکھا جاتا تھا، خان عبدالقیوم خان تھے، جنہوں نے کال دی تو عوام پاکستان کے طویل ترین جلوس کی شکل میں ان کے پیچھے چل پڑے۔ مولانا بھاشانی جیسے درویش تھے، قبیلہ چیل اور دھوتی میں سٹج پر چڑھتے تو جابر سے جابر سلطان ان کے کلر حق کی کاٹ سے نہ بچ سکتا۔ حسین شہید سہروردی تھے، جنہوں نے سیاست کو ایک نیا ہی رنگ روپ دیا۔ چودھری ظہور الہی جیسا دریا دل شخص تھا، جس کے احسانات کا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے بیٹکڑوں لوگ آج بھی آپ کو ملیں گے۔

یہاں مولانا مودودی جیسے عالم تھے جن کی فکر کی روشنی آج بھی لوگوں کو اندھیرے میں راستہ دکھاتی ہے۔ علامہ شبیر احمد عثمانی تھے، جن کی باتیں دلوں پر لگی مہرین توڑ دیتی تھیں، مولانا احمد علی لاہوری تھے جن کی محفل پتھر کو پارس بنا دیتی تھی۔ اشتیام الحق تھا لوی تھے، جو بیکلے ہوؤں کو شراب خانوں سے اُٹھا کر مصلے پر لا بٹھاتے تھے۔ مفتی محمود تھے، جنہوں نے مغربی یلغار کو ایک بازو کی قوت سے روک رکھا۔ مولانا قمر الدین سیالوی تھے، جو مردہ روحوں کو زندہ کرنے کا کام کرتے تھے اور سید مظفر حسین خٹک تھے، جنہوں نے زندگی بھر شیعہ سنی کی تفریق پیدا نہ ہونے دی۔

یہاں فیض صاحب جیسا قلندر تھا، جوش جیسا صنّاع تھا، راشد جیسا لفاظ تھا، مجید امجد جیسا نباش تھا، منٹو جیسا سفاک افسانہ نویس تھا، غلام حشر جیسا عالم مکالمہ نویس تھا، مصوفی جیسا دلوان میں اتر جانے والا شاعر تھا، حفیظ جالندھری جیسا تر دماغ تھا، پروفیسر سلیم جیسا نقاد تھا، عابد علی عابد جیسا عمیق نظر دانشور تھا، حسن عسکری جیسا روشن سورج تھا، شہاب جیسا ہیرا تھا، میراجی جیسا درویش تھا اور انشا جیسا حرارت بخش لکھم گو تھا۔

یہاں آرٹ میں صادقین تھا یہاں مصوری میں چغتائی تھا۔ موسیقی میں خورشید انور تھا، راگ میں غلام علی اور روشن آراغی، سکرین پر سنٹوش اور در پرین تھا، یہاں کیا تھا، کون نہیں تھا۔

ہاں قارئین کرام! آپ ایک نسل پیچھے پلٹ کر دیکھیں، آپ کو زندگی کے ہر شعبے کے ”ناپ“ پر ایسے لوگ نظر آئیں گے، ظرف، ذہانت، عظمت اور ایمانداری میں جن کا کوئی ثانی نہیں تھا چھوڑیں، انہیں بھی چھوڑیں، آپ اپنے ارد گرد دیکھیں ان بوزحوں کو دیکھیں جنہیں آپ روز دیکھتے ہیں اور ان پر توجہ دینے بغیر گزر جاتے ہیں۔ کیا یہ لوگ اس نسل سے زیادہ پڑھے لکھے، ایماندار اور اعلیٰ ظرف نہیں؟ کیا ان کی زندگی میں اطمینان، سکون اور دھیمپن نہیں، چھوڑیں، انہیں بھی چھوڑیں۔ آپ دیکھیں آپ نے جن اساتذہ سے پرائمری کی تعلیم پائی، وہ آج کے اساتذہ سے بہتر، ذہین، محنتی اور ایماندار نہیں تھے۔ ہائی سکول اور کالج کے استاد آج کے استاد سے کہیں زیادہ عظیم اور اعلیٰ ظرف نہیں تھے، آپ نے چھوٹی سی عمر میں جتنی کتابیں پڑھ لی تھیں، جتنا علم آپ کی گرفت میں تھا، وہ آج آپ کے بیٹے کے پاس ہے؟ آپ نے ذاتی ایمانداری سے جو جو موافق ”صانع“ کیے، آج کا نوجوان بھی انہی ”بے وقوفی“ کرے گا نہیں، ہرگز نہیں۔

پھر یہ کیا ہوا، کوئی ایسا ادارہ نہیں جس پر اعتماد کیا جاسکے، کوئی ایسا شخص نہیں، جس کی بات اندھیرے

میں کرن کی طرح چمکے، کوئی ایسا لیڈر نہیں جس سے ہاتھ ملایا جائے اور ایک عرصے تک بدن میں سرور کی لہریں دوڑتی رہیں۔۔۔ یہ کیا ہوا، زمین اتنی ہانجھ کیوں ہوگئی، اچھے، اعلیٰ ظرف اور ذہین لوگ اچانک ختم کیوں ہو گئے؟ ڈاکٹر اشفاق کہا کرتے تھے: "جاوید اس معاشرے میں بڑے لوگوں کی اتنی کمی ہے کہ اگر ایک آدھ سال میں ایک آدھ بندہ مل جائے تو اس کے پاس سے اُنھنے کو جی نہیں چاہتا کہ اٹھے تو یہ دوبارہ نہیں ملے گا۔" ہاں قارئین کرام! ہم لوگ کتنے بد قسمت ہیں، وقت کے اس تنہا، اداس اور ویران سفر میں ہمارے لیے کوئی بھی ایسا شخص نہیں جو ہماری ہمت بندھا سکے، جو ہمیں تھکی دے سکے، جو ہمیں اچھے اور برے کی تمیز سکھا سکے، جو ہماری راہبری کر سکے۔

جب میں اپنے بچے کی طرف دیکھتا ہوں اور سوچتا ہوں، اس کے لیے میں "ماڈل" ہوں تو ایک دکھ کی لہریں اٹھتی ہے اور جاتے جاتے یہ کہہ جاتی ہے، جب قدرت ناراض ہوتی ہے تو انسانوں اور ان بھیڑوں میں کوئی فرق نہیں رہتا جو اپنے آگے چلنے والی بر بھیڑ کو لیڈر مان لیتی ہیں خواہ وہ کتنی ہی کمزور اور نحیف کیوں نہ ہو۔

Kashif Azad © OneUrdu.com

آف دی ریکارڈ

میرے بیٹے کو ابھی لفظوں کی صحیح پہچان نہیں، وہ اب، اماں اور بابا آ اور بابا جا کو بچے کر کے پڑھتا ہے لیکن "ماڈرن اسج" کے دوسرے بچوں کی طرح یہ کہی اس کے ابلاغ میں رکاوٹ نہیں بنی اس کے دماغ میں بھی درجنوں سوال پکڑے رہتے ہیں۔ یہ کیا ہے، یہ کیوں ہے؟ اگر ایسا نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟ اس نے ایسے کیوں کیا؟ وہ ایسے کیوں بول رہا تھا؟ وغیرہ وغیرہ۔ وہ بولتا چلا جاتا ہے، یہاں تک کہ اس کی ماں اسے ڈانٹ کر چپ کرنا ہتی ہے، لیکن وہ خوب سمجھتا ہے کہ آج کے والدین بہت بے بس، لاچار اور معذور ہیں، اپنے بچے کو بولند، منہ پھٹ اور سٹریٹ فارورڈ دیکھنا چاہتے ہیں چنانچہ وہ چند لمحے کے توقف کے بعد ماما، کافرہ لگا کر ایک اور سوال داغ دیتا ہے۔

مجھ سے اس کی ملاقات پہلے میں صرف ایک بار ہوتی ہے اور وہ بھی چھٹی کے دن۔ باقی چھ دن معاملہ صرف منہ دکھائی تک محدود رہتا ہے۔ رات گئے جب میں گھر آتا ہوں تو وہ سوچکا ہوتا ہے، صبح سویرے میں اس کے اٹھنے سے پہلے ہی کام پر جت جاتا ہوں۔ لہذا وہ اٹھتا ہے، دور ہی سے ہاتھ ہلا کر سلام کرتا ہے، چپکے سے ہاتھ روم جاتا ہے اور پھر سکول جانے کی تیاری میں لگ جاتا ہے۔ ٹھیک آٹھ بج کر ۲۵ منٹ پر میں "کلب بورڈ" اور لکھے ہوئے کاغذ ایک طرف رکھ کر اسے سکول چھوڑنے چلا جاتا ہوں۔ سکول کیونکہ قریب ہی ہے چنانچہ اس سے پانچ منٹ کی گفت و شنید ہوتی ہے جس میں وہ درجنوں سوال کرتا ہے، جن کا میرے پاس "ہوں" کے سوا کوئی جواب نہیں ہوتا۔ اسے سکول چھوڑنے کے بعد میں دفتر جانے کی تیاری میں لگ جاتا ہوں، جہاں سے میں رات گئے واپس آتا ہوں تو وہ سو رہا ہوتا ہے۔ یہ روز کا معمول ہے۔

کل ۲۵ دسمبر کی چھٹی تھی۔ ایک عرصے بعد ہم نے کھل کر چھٹی منانے کا فیصلہ کیا۔ ہم چڑیا گھر چلے گئے، میرا بچہ اس "تبدیلی" پر بڑا خوش تھا۔ بات بات پر قہقہے لگاتا، ہمارے آگے آگے دوڑتا، خوشی سے رقص کرنے لگتا، دوڑ کر بازوؤں کے اوپر سے چھلانگ لگاتا، جانوروں سے بات چیت کی کوشش کرتا، خرگوش کو "پاپ کارن" کھلاتا میں اس کی ان حرکات سے لطف لیتا رہا۔ یہ سلسلہ جاری تھا کہ وہ اچانک شیروں کے نئے بنجرے کے قریب رکا اور میری طرف مڑ کر بڑی سنجیدگی سے بولا: "پاپا یہ آف دی ریکارڈ کیا ہوتا ہے۔"

میرے لیے اس کا یہ سوال بالکل غیر متوقع تھا، میں نے بھونچکا ہو کر پوچھا: "بیٹے آپ نے یہ کہاں سے سنا؟" اس نے شرارت سے بھرپور تہقہ لگایا، پاپ کارن کی منحنی بھری اور انہیں شیروں کی طرف اچھال کر بولا "میں نے اخبار میں پڑھا ہے۔" میں نے حیرت سے اپنی بیوی کی طرف دیکھا، وہ آہستہ سے مسکرائی اور بیٹے کے سر پر ہاتھ پھیر کر بولی: "اسے آج کل نیا شوق چرایا ہے، روز اخبار پھیلا کر بیٹھ جاتا ہے مجھے آواز دے کر بلاتا ہے اور پھر انگلی کسی خبر پر رکھ کر کہتا ہے: "ماما یہ کیا لکھا ہے، پڑھ دیں پلیز!" اور میں سارے کام چھوڑ کر اسے خبریں سناتے بیٹھ جاتی ہوں۔"

میں نے دھوپ میں لیٹے بر شیروں کے جوڑے پر نظریں جما کر پوچھا: "پر یہ آف دی ریکارڈ کا کیا قصہ ہے۔"

"میں نے کل اسے ایک خبر پڑھ کر سنائی جس میں بار بار آف دی ریکارڈ آتا تھا، اس وقت سے یہ مجھ سے آف دی ریکارڈ کا مطلب پوچھ رہا ہے۔ اب مجھے کیا پتا آف دی ریکارڈ کیا ہوتا ہے؟" میری بیوی بے چارگی سے بولی۔

اور ہاں، میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا، اس ساری گفتگو کے دوران میرا بیٹا انگلی پکڑ کر حیرت سے کبھی مجھے اور کبھی میری بیوی کو دیکھتا رہا، میں نے تفتیش مکمل ہوتے ہی پیار سے اس کے گل گل تھپتھپائے اور کہا: "بیٹا جب کوئی بڑا شخص کوئی بات چھوٹا نہیں چاہتا تو وہ گفتگو کے ساتھ کہہ دیتا ہے، یہ پریس کے لیے نہیں ہے، ہم اسے آف دی ریکارڈ کہتے ہیں۔"

"پر وہ یہ بات کیوں نہیں چھوٹا چاہتا؟" میرے بیٹے نے حیرت سے پوچھا۔
"شائد اس لیے کہ وہ بات چھپنے کے بعد اس کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔" میں نے آہستہ سے جواب دیا۔

"کیوں، کیا وہ بات جھوٹی ہوتی ہے۔" میرے بیٹے کی آواز میں تجسس کی کھنک تھی۔
"خیر، جھوٹی تو نہیں ہوتی، بلکہ اگر سچ پوچھو تو ساری گفتگو میں صرف یہی ایک بات سچ ہوتی ہے۔" میں نے مسکرا کر کہا۔

"اگر وہ بات جھوٹی نہیں ہوتی تو پھر آپ اسے اخبار میں کیوں نہیں چھاپتے؟" میرے بیٹے نے میری انگلی کو ہلکا سا جھٹکا دیا۔

"یار کہہ تو رہا ہوں بتانے والا اسے چھوٹا نہیں چاہتا۔" میں نے پھر آہستہ سے کہا۔
"پاپا عجیب بات ہے" اس نے مزکر دھوپ میں لیٹے شیروں کو دیکھا اور پھر ان پر نظریں گاڑ کر بولا
"عجیب بات ہے، سچ آپ چھاپتے نہیں اور جھوٹ چھاپ دیتے ہیں۔"

"بیٹے اخلاقیات بھی کوئی چیز ہے۔ کنٹنٹ، وعدہ اور اعتماد بھی آخر کسی چیز کا نام ہے۔ ہم وہ بات

کیسے شائع کر سکتے ہیں جسے بتانے والا چھپوانا نہیں چاہتا۔" میں نے جھلا کر کہا۔

"سچ سے بھی بڑی کوئی اخلاقیات، کنسنٹ، وعدہ اور اعتماد ہے؟" اس نے بدستور شیریں پر نظریں جما کر کہا۔ آپ یقین کریں اس دلیل پر مجھے بہت غصہ آیا لیکن میں پل گیا کیونکہ میرا شمار بھی ان بے بس والدین میں ہوتا ہے جن کا خیال ہے بے جا ڈانٹ ڈپٹ سے بچوں کی دماغی گردھ رک جاتی ہے آج کے بچے بھی والدین کی اس مجبوری سے واقف ہیں، لہذا وہ سوال کرتے ہوئے چوکتے ہیں، اور نہ ہی اصرار کرتے ہوئے، کچھ یہی صورتحال مجھے بھی درپیش تھی، کچھ دیر کے توقف کے بعد میرے بیٹے نے میری انگلی کو ایک اور جھٹکا دیا جب میں پوری طرح اس کی طرف متوجہ ہو گیا تو وہ بولا:

"لیکن پاپا! اگر اس شخص کو سچ سے ڈر لگتا ہے تو پھر وہ چپ کیوں نہیں رہتا، ہوتا کیوں ہے؟"

"شاید اس لیے کہ ہم اسے کسی دوسرے موقع پر کسی دوسرے انداز سے شائع کریں۔" میں نے بے ذماری سے جواب دیا۔ "کیا سچ بولنے کے بھی انداز اور مواقع ہوتے ہیں؟" میرے بیٹے نے دوسرا سوال داغ دیا۔

"ہاں، ہوتے ہیں۔" میں نے زچ ہو کر کہا۔

میرے بیٹے نے میری جھنجھلاہٹ پر قہقہہ لگایا اور پھر میری انگلی کو زوردار جھٹکا دے کر بولا: "پاپا، پاپا، میں بھی آپ کو ایک آف دی ریکارڈ بات بتاؤں۔"

"ہاں بتاؤ!" میرے چہرے پر قدم رک گئے، میں خزاں زدہ اناجین درخت کے حصے پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو گیا۔

"مجھے آپ لوگ، آپ کے سارے بڑے لوگ اور آپ کے آف دی ریکارڈ نظام سے نفرت ہے، میں جب بڑا ہو جاؤں گا تو آپ سب کو لکس مار کر باہر نکال دوں گا۔" ساتھ ہی اس نے ہوا میں کلک چلائی۔ یقین جانتے اس کی اس بات سے میرے کان تک سرخ ہو گئے اور میں بے بسی کے عالم میں پھنے ہوئے خشک تنے پر کئے برسانے لگا۔ اس نے مجھے یوں بے بس دیکھا تو ایک مہینہ کھٹکتا ہوا قہقہہ لگا کر بولا:

"پاپا آپ لوگ بہت گندے ہیں، سچ چھپا لیتے ہیں اور جھوٹ چھاپتے رہتے ہیں۔"

میں نے غصے، بے چارگی اور بے بسی کے ملے جلے احساسات کے ساتھ پیچھے مڑ کر دیکھا، سامنے جھیرے میں سرخ آنکھوں اور سرمئی پروں والے کیڑا آہنس میں جوج لڑا رہے تھے، میں نے اپنے آپ کو مخاطب کر کے کہا:

"بیٹے میں تمہیں کیسے بتاؤں مسجد سے لے کر پارلیمنٹ تک، در سے لے کر سپریم کورٹ تک اور صدر سے لے کر صحافی تک ہم سب جھوٹ کے بیوپاری ہیں، جو بڑا جھوٹا وہ بڑا فنکار جو جھوٹا جھوٹا وہ جھوٹا فنکار۔ اور تم اگر غور سے دیکھو تو تمہیں ہم سب کے چہروں پر بیٹوں کی مکاری اور ہمارے دانتوں سے مردار خوروں کی بدبو آئے گی۔"

ہاں، بیٹا جب ہم بوڑھے اور تم جوان ہو جاؤ گے تم ہر آف وی ریکارڈ کو آن وی ریکارڈ بنانے کے قابل ہو جاؤ گے اور پھر کبھی یونہی چلتے چلتے ہم سے پوچھو ”بابا تم نے ہم جیسے بیٹوں کو سوال کرنے کی جرأت کیوں دی تھی۔“ تو اس وقت ہم تمہیں بتائیں گے۔“ اس لیے بیٹا کہ تم وہ سوال بھی پوچھ سکو جو ہمارے دماغوں میں لاوے کی طرح اچلتے تھے لیکن جرأت اظہار کی کمی کے باعث نسوں کو جلا کر فنا ہو جاتے تھے۔“

ہاں بیٹا، ہم آخری سانس لیے معاشرے کے کرم خوردہ ستون ہیں اور بیٹا جب معاشرے آخری سانس لیے ہیں تو ہر آف وی ریکارڈ اور ہر جھوٹ آن وی ریکارڈ ہو جاتا ہے۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

خانہ بدوش

میں کولڈن جو ملی منانے لگا تو بہت سی یادوں نے میرے ہاتھ جکڑ لیے۔

سڈنی کی غلامت سے چند لمحے پہلے مظہر بخاری نے اپنی بیوی کی طرف اشارہ کر کے کہا تھا میں چند
مفتوں میں باپ بننے والا ہوں لیکن میری کوشش ہے میرا بچہ اس ملک میں آنکھ نہ کھولے، میں اسے اپنی طرح
بے بس محروم اور لاچار نہیں دیکھنا چاہتا۔ مجھے معلوم ہے میں یہاں اچھا صحافی ہوں، میری عزت ہے، میری
شناخت ہے اور وہاں میں سڈنی یا پرتگھ میں گستاخ زندگی گزاروں گا، پنڑول پمپ اور ہوٹلوں پر کام کروں گا، جیسی
چلاؤں گا۔ سامان لوؤ، ان لوڈ کروں گا سو بسم اللہ لیکن وہاں مجھے عدم تحفظ کا احساس تو نہیں ہوگا مجھے بخاری
ہونے کے باعث قابل گردن وئی قرار دیں گے یا جانے گا، ہمیں بھی ایسے ہی جنونی کی طرح کسی اندھی گولی کا شکار
تو نہیں بنوں گا۔ ہاں جہاں تحفظ نہ ہو، عزت نفس کی ضمانت نہ ہو۔۔۔۔۔ جہاں زیادتی سے بچنے کے لیے جیب
میں پریس کارڈ رکھ کر باہر نکلتا پڑے اور جہاں زندہ رہنے کے لیے کسی باختیار شخص کو دوست رکھنا پڑے وہ جگہ
حساس لوگوں کے رہنے کے قابل کہاں ہوتی ہے؟

پنجاب یونیورسٹی کے ایک نمبر ہاسٹل میں جب حافظہ عطاء الرحمن اپنا سامان چیک کر رہا تھا تو میں نے اسے ٹوک کر کہا، ایک دانشور پولیس جیسے ان پڑھ ٹھکے میں ایڈ جسٹ ہو جائے گا؟ ہاں اس نے گولہوں پر ہاتھ جمائے اور سیدھا کھڑا ہو کر بولا ہاں، تم نے شاید وہ کہانی نہیں سنی جب شہر میں قتل عام ہو رہا تھا تو بہت سے شہری اپنی اپنی جانیں بچانے کے لیے جلا دوں میں شامل ہو گئے! مجھے یوں محسوس ہوتا ہے اگر میں پولیس میں شامل نہ ہوا تو کسی دن کسی بھی قاتل کا پھندا میری گردن پر کس دیا جائے گا یا مجھے پولیس مقابلے میں مار دیا جائے گا۔

کھاریاں کا وہ اسٹنٹ کھنڈر جو رات بھر شراب پیتا رہا اور جب مہوشی میں اس نے مغلظات کہنی شروع کر دی اور ایک تازہ مجسمیت کے نوکنے پر اس نے پیٹ میں تے کر دی تو میں اٹھ کر باہر کھلی فضا میں آ گیا وہاں چاند تھا، ہوا تھی اور ایک اذیت ناک خاموشی تھی وہاں کھڑے کھڑے میں نے خود سے پوچھا یہ شخص صبح اٹھ کر جب شرایعوں، زانیوں اور اخلاق یافتہ مجرموں کو سزا سنائے گا تو کیا اس کا ضمیر ملامت نہیں کرے گا؟

”جیس“ کہیں میرے اندر سے آواز آئی اور جب ایک روز میں نے اس سے یہی سوال کیا تو اس نے جھانکی لے کر کہا شراب اور لڑکی میری پالی ہے اور مجرموں کو سزا سنانا میری ذمہ داری اچھا مسلمان ہانی اور ذمہ داری میں توازن رکھتا ہے اور ساتھ ہی اس نے ایک کمرہ قبضہ لگایا اور مجھے یوں لگا جیسے میرا معدہ میرے طلق کی طرف اٹھ رہا ہے۔ میں کھلی فضا کی تلاش میں اس کے دفتر سے باہر آ گیا۔

اور میرا وہ دوست جو نائب تحصیلدار بننے کے لیے پروفیسری کو ”ٹھنڈا“ مار کر آ گیا تھا۔ جب مجھے ملے آیا تو بہت خوش تھا آخر وہ خوش کیوں نہ ہوتا اس کے گیراج میں ”زیرو میٹر“ گاڑی کھڑی تھی، شہر کے سب سے اونچے گھرانے میں اس کی شادی ہوئی تھی، مگر اپنا تھا، خرچ کرنے کے لیے نوٹ ہی نوٹ تھے بس اللہ تعالیٰ کا فضل ہی فضل تھا اور وہ جب اُنھ کو جانے لگا تو گرم جوشی سے میرا ہاتھ دیا کہ بولا تم یقین کرو اگر میں ”شاہ جی“ کے پاؤں نہ پکڑتا تو آج کسی دور افتادہ شہر کے دیہاتی کالج میں تالائق اور بدتمیز بچوں کو انگریزی سکھانے کی کوشش کر رہا ہوتا، ویٹن پر کالج جاتا اور پیدل واپس آتا، سال میں ایک بار کپڑے سلواتا اور بندروں کی طرح بھنے پٹنے کھا کر زندگی بسر کرتا لیکن اب اللہ تعالیٰ کا بازو اکرم ہے۔

اور وہ سیاستدان جو مجھے تنہائی میں تحیث کر لے گیا اور بولا ”مجھے بتاؤ اگر میں پارٹی بدل لوں تو کیا مجھے وزارت مل جائے گی؟“ اور میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا ”چوہدری صاحب اللہ تعالیٰ نے آپ کو اربوں روپے دے رکھے ہیں، تین لاکھ لوگ آپ کے دوڑیں آپ کی عزت ہے نیک نامی اور شہرت ہے پھر اس حماقت کی کیا ضرورت ہے۔“ تو وہ مسکرا کر بولا ”چوہدری صاحب جو نشہ اقتدار میں ہے وہ کسی دوسری چیز میں نہیں آپ کبھی وزیر بنے ہوتے تو آپ کو پتہ ہوتا؟“

اور لیکن ہاؤس کا وہ تنہا سا بچہ جس نے کتابوں کی دکان پر اپنی ماں کا پلو کھینچ کر انگریزی میں پوچھا یہ بوزھا کون ہے؟ تو ماں نے تصویر پر ایک لکھ لفظ ڈال کر سرگوشی میں کہا کا تھا ”عظیم“ اتونے بچے نے حیرت سے کہا، یہ کیا ہوتا ہے؟ ماں نے ہاتھ میں پکڑے فیشن میگزین پر نظریں جمائے جمائے کہا، یہ پاکستان کا امیر ایم ٹیکن ہے، ”او، ایس“ بچے کے منہ سے سسکی سی نکلی۔ اور میرے دوست کا وہ بچہ جس کے سامنے جب تک فتنی تائن نہ کہا جائے اسے اُسٹھ کی سمجھ نہیں آتی۔ اور سی ایس ایس کے لیے انٹرویو دینے والا وہ نوجوان جس کا دعویٰ تھا پاکستان محمد علی کھلے نے بنایا تھا۔

اور میرے دوست کی ٹریول ایجنسی پر آنے والے وہ سینکڑوں لوگ جن کی آخری خواہش اس ملک سے فرار ہونا ہے اور جو نوٹوں سے جیب بھر کر آتے ہیں اور خواب لے کر خالی ہاتھ واپس چلے جاتے ہیں اور جب میرے دوست نے مجھے آنکھ مار کر کہا تھا پاکستان میں دنیا کا سب سے آسان اور منافع بخش کاروبار لوگوں کو باہر بھجوانا ہے تم صرف اعلان کرو اور کروڑوں روپے کما لو۔

اور جب میں اپنے منشی بھائی کی جان بچانے کے لیے اسے یورپ جانے والے جہاز میں بٹھا رہا تھا

تو مجھے یقین آ گیا واقعی لکھنؤ کے نواب اپنے بچوں کو تہذیب سکھانے کے لیے طوائفوں کے کونوں پر بھیجا کرتے تھے۔۔۔۔۔ اور میرے والد جو اپنے پوتے کو اس لیے کسی اعلیٰ انگریزی سکول میں داخل کراتا چاہتے ہیں کہ ملک پر حکومت کرنے والے زیادہ تر لوگ انگریزی سکولوں کے پڑھے ہوتے ہیں۔

ہاں میں گولڈن جوبلی منانے لگا تو مجھے محسوس ہوا جیسے میں صدیوں کے جاہد اور بدبودار پانی کی کائی پر کھڑا ہوں اور میرے آگے پیچھے تعفن کے ذہیر لگے ہیں۔۔۔۔۔ اور سرانڈ میرے دماغ کے سارے مثبت خیالات چاٹ چکی ہے۔

ہاں میں نے سوچا جس زمین کے ساتھ باسیوں کا کوئی رشتہ نہ ہو وہاں اجنبی بستے ہیں اور اجنبی جشن نہیں منایا کرتے۔

آپ نے کبھی خانہ بدوشوں کو گولڈن جوبلی مناتے دیکھا ہے؟



Kashif Azad @ OneUrdu.com

بے گناہ

میں ان دنوں بے روزگار تھا، پنجاب کی ایک بڑی جیل کی آفیسر کالونی میں اپنے ایک دوست کے پاس رہتا تھا، میرا دوست اس جیل کا ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ تھا، انہی دنوں جیلوں پر کام کرنے والی ایک این جی او کو قیدیوں کی اخلاقی، ذہنی اور جذباتی زندگی پر تفصیلی رپورٹ کی ضرورت پڑی تو میرے دوست نے یہ پراجیکٹ مجھے لے دیا یوں مجھے جیل کی دنیا میں داخل ہونے اور وہاں بسنے والی "مخلوق" کے قریبی مشاہدے کا موقع ملا۔

میں وہاں ایک ماہ تک کام کرتا رہا، اس دوران جہاں مجھے مسجد سے جوتے چھاننے والے "پیشہ ور" بھرموں سے ملاقات کا موقع ملا وہاں میں نے پندرہ پندرہ افراد کے قاتلوں سے بھی گفتگو کی، میں ان ۳۰ دنوں کو اپنی زندگی کے قیمتی ترین دن سمجھتا ہوں کیونکہ مجھے پہلی بار معلوم ہوا، پاکستان یا کم از کم پنجاب میں ہر قسم کے جرائم جو لاپرواہی، سوچی، ناکی، مصلیٰ اور تیلی کرتے ہیں، کوئی فیوڈل لارڈ، مل اوٹر، سیاستدان، تاجر، بڑا مذہبی رہنما اور اعلیٰ سرکاری افسر کبھی کسی عدالت سے سزا پا کر جیل نہیں آیا، یقین فرمائیے مجھے ان تین ہزار قیدیوں میں اپر کلاس کا ایک بھی "غماندہ" نہیں ملا، بی کلاس کے اسی لیے میں چند ایک لوگ تھے لیکن وہ ابھی ملزم تھے ان میں سے کسی کا جرم ثابت نہیں ہوا تھا۔

ایک رات میں نے اپنا یہ تجربہ اپنے دوست کے سامنے رکھا تو اس نے مسکرا کر کہا "صرف یہ نہیں بلکہ تمہیں پاکستان کی کسی جیل میں بالائی طبقے کا کوئی شخص نہیں ملے گا" میں نے وجہ دریافت کی تو اس نے تاثر کے پتے پھینکتے پھینکتے جواب دیا۔ "وجہ صاف ظاہر ہے ہمارے طبقہ اشرافیہ کے لوگ جرم کے بعد تھکے میں کچھ دے دلا کر فارغ ہو جاتے ہیں، اپنی جگہ کوئی کمی، کوئی کارندہ پولیس کو پیش کر دیتے ہیں، بجوں سے رابطے کر لیتے ہیں اگر وہاں تک کوئی ترکیب کار مگر نہ ہو تو دس تیس لاکھ روپے میں چوٹی کا وکیل کر لیتے ہیں، اگر یہ کمال بھی کام نہ آئے تو گواہوں کو خریدنا، شہادتیں ضائع کرنا اور متاثرہ پارٹی کو دھمکیوں اور بدلیف کیسوں سے متاثر کرنا کہاں مشکل ہے لیکن اگر کبھی ان تمام جھگڑندوں کے باوجود کسی بڑے شخص کو سزا ہو جائے تو پھر سیاسی اثر و رسوخ کی مدد سے چھانسی کو عمر قید اور عمر قید کو قتل از وقت رہائی میں بدلنا تو ہرگز مشکل نہیں لہذا تمہیں پاکستانی جیلوں کی تاریخ میں ذوالفقار علی بھٹو (اب شیخ رشید کو بھی اس میں شامل کر لیں) کے سوا اپر کلاس کا کوئی غماندہ

سزا کا نفاظ نہیں آئے گا۔“

میرے دوست کی بات بڑی ہی لاجیکل تھی لہذا میں نے فوراً فائل کھولی اور اس کے پہلے صفحے پر یہ لکھ کر کہ ”پاکستان دنیا کا واحد ملک ہے جہاں کوئی بڑا شخص کوئی جرم نہیں کرتا۔“ رپورٹ اس کے حوالے کر دی، آنے والے دنوں میں مجھے این جی او کی طرف سے چیک بھی مل گیا لیکن یقین جانئے اس روز سے آج تک کوئی دن، کوئی رات ایسی نہیں گزری، جب مجھے ایک آدھ منٹ کے لیے ہی سہی اس جیل کے وہ قیدی یاد نہ آئے ہوں جو ان قلعہ نما دیواروں، ان ٹھنڈی بیرکوں اور ان مہیب کال کونٹریوں میں اپنے گناہوں، اپنے جرموں کی بجائے اپنی غربت، اپنی کمزور سماجی پوزیشن اور اپنے ناقابل ذکر شجرہ نسب کی سزا بھگت رہے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا یہ لوگ بے گناہ ہیں، یہ لوگ واقعی مجرم ہیں، انہیں اپنے کیے کی سزا ملنی چاہیے، قیدیوں کو قید کا سنی چاہیے، گوزوں والوں کو کھٹکی کا ذائقہ چکھنا چاہیے اور پھانسی والوں کو پھانسی گھاٹ پر پہنچنا چاہیے لیکن آپ ان لوگوں کو تو کھلا چھوڑ دیں جو انسانوں کو اپنے ڈیروں پر کتوں کی طرح باندھتے ہیں، زمین میں گاڑ دیتے ہیں، پہاڑوں سے دھکے دے دیتے ہیں، بھٹوں کی چینیوں میں پھینک دیتے ہیں، بجٹیوں میں گھٹلا دیتے ہیں، جو انسانوں کو کٹھنے چائے اور بول و براز پینے پر مجبور کر دیتے ہیں جو ۱۹۴۳ء کے قلیل اعداد میں ہونے کے باوجود ملک کے ۱۳۹ ارب روپے کھا جاتے ہیں، جو ہر سال ۹ ارب روپے کی غیر ملکی شراپ پیتے ہیں، جو ۲۵ ارب روپے جوئے میں ہلا جاتے ہیں، جو خشیات کے ۴۰ ہزار افراد کے مالک ہیں، جو ہر ماہ چالیس، پچاس کروڑ چنگا ٹیکس وصول کرتے ہیں، جو آبرو میں لوٹتے ہیں، جو قبضے کرتے ہیں، جو کنگی خواتین کا مارچ کراتے ہیں، جو تھانے خریدتے اور چوکیاں بیچتے ہیں، جو ہم رکھواتے اور طیارے تیار کر دیتے ہیں لیکن مسجدوں سے جوتے چرانے، ڈگر کھولنے، بیر وٹن کی ایک پڑیا خریدنے، چند ہزار کا فراڈ کرنے، کسی گھر سے ریڈیو بی وی چوری کرنے یا اشتعال میں آکر کسی کو قتل کر دینے والوں کو جیل میں مجبوس کر دیں، ان سے چکیاں پسوا لیں، انہیں کوڑے لگائیں، انہیں پھانسیاں چڑھائیں، یہ ظلم نہیں، کیا یہ زیادتی نہیں؟

مجھے کوئی اعتراض نہیں کراچی کی فٹری کورٹس، بمبلی کو پھانسی چڑھا دیں یا بابر لودھی کو سزائے موت سنا دیں تو صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہوں کم از کم آج کے منصف تو یہ دیکھیں کہ کہیں ان کی ساری مہارتیں بھی انہی لوگوں پر تو صرف نہیں ہو رہی جو غربت کے باعث قانون کے بیٹھنے میں آگئے تھے، جن کے پیچھے بھی اگر حسب نسب کی مضبوط فیصل ہوتی، جن کا بھی اگر کوئی حلقہ، کوئی جاگیر، کوئی مل، کوئی بزنس یا کوئی پارٹی ہوتی تو وہ بھی عینک لگا کر لندن میں بیٹھے ہوتے، آسٹریلی میں ڈبیک بجا رہے ہوتے یا گھومنے والے کرسیوں پر بھول رہے ہوتے، میری تو بس اتنی درخواست ہے اس ملک میں کم از کم ایک تو ایسی عدالت ہو جو کسی ایک اصلی ظالم کو پکڑ کر پھانسی پر لٹا کر دے، اس کلاس کے چند ایک لوگوں کا حساب بے باق کر دے جو پچھلے پچاس برس سے ہاتھوں پر دستانے چڑھا کر پھر رہی ہے جس کی وجہ سے محمد رفیع، بمبلی بن رہے ہیں اور جس کے اشارے پر اشرف،

چاکر بن کر پھانسیوں پر جھول جاتے ہیں، اگر یہ ممکن نہیں، اگر پاکستان کے سارے ادارے ساری قوتیں ہی
مجبور ہیں تو پھر کوئی ایک شخص ہی ایسا ہو جو انصاف کی کتاب پر کم از کم یہ فقرہ ہی لکھ دے۔
”پاکستان دنیا کا واحد ملک ہے جہاں کوئی بڑا شخص کوئی جرم نہیں کرتا۔“



Kashif Azad @ OneUrdu.com

مولوی دُلا

میں جب بھی سنتا ہوں اسلام اور معاشرے کے درمیان جاہل ملا کھڑا ہے، مولوی کی موجودگی میں دینی وسعت ممکن نہیں، ہم مولوی کو بدلے بغیر ترقی نہیں کر سکتے، تو مجھے بے اختیار مولوی دلا یاد آ جاتا ہے۔

مولوی دلا جب پیدا ہوا تو دائی کی غفلت سے اس کے سر پر پٹنگ کا پایہ لگ گیا، چوت شدید تھی، لہذا اس کے ناک منہ سے خون جاری ہو گیا، اس کے والد چودھری شریف نے فوراً گاڑی منگوائی اور ”وَلے“ کو سرکاری ہسپتال لے گئے، جہاں اس کا علاج شروع ہو گیا۔ ٹیکے لگائے گئے، بوتلیں (گلوکوز) لگائی گئیں، منتیں مرادیں مانگی گئیں، ولے کی وادی بھاگ کر ”شاہ دول“ کی درگاہ پر ”بت“ بھی چڑھا آئی، خالہ نے بھی گاؤں کے بڑے مولوی صاحبہ لے آجھوئے منوا کر لگی کے ذریعے ہسپتال پہنچا دیا۔ یہ ساری کوششیں کارگر ثابت ہوئیں، ولے کی جان بچ گئی، تاہم ڈاکٹروں نے خدشہ ظاہر کیا کہ شاید دلا بڑا ہو کر نارمل بچوں جیسی زندگی نہ گزار سکے۔ یہ سن کر چودھری شریف اور اس کی بیوی کو دکھ تو بہت ہوا، لیکن ولے کی جان بچنے کی خوشی اس پر حاوی رہی۔

اگلے چند برسوں میں ڈاکٹروں کے خدشات درست نکلے۔ دلا واقعی ایک ایسا نارمل بچہ ثابت ہوا۔ اس نے آٹھ برس کی عمر میں یونٹا شروع کیا۔ دس برس کا ہو کر اسے راستوں کی تمیز ہوئی اور بارہ تیرہ سال کی عمر تک پہنچ کر اسے سیدھا چلنے کا ڈھنگ آیا، لیکن زندگی گزارنے کے لیے اتنی ”مہارت“ کافی نہیں تھی، لہذا چودھری شریف اور ان کی دیہی بیوی اپنے بڑے بیٹے کے مستقبل کے بارے میں پریشان رہنے لگے۔ اسی پریشانی میں انہوں نے ایک روز اپنے بچے ”شاہ جیون“ سے بات کی۔ شاہ جی نے سارا قصہ سن کر ”مراقبہ“ کیا، اللہ ہو کہ نعرہ لگایا اور پھر چودھری شریف کے کندھے پر ہتھکی دے کر بولے: ”چودھری مبارک ہو، تمہارا یہ پتر تمہاری سات بیٹیوں (پشتوں) کی بخشش کا بندہ دست کرے گا۔“ چودھری شریف کے چہرے سے خوشی کی لہری گزر گئی۔ شاہ جیون نے چند لمحوں تک توقف کیا اور پھر اپنی آواز میں جلال بھر کر بولے: ”شریف اس بچے کو میری درگاہ پر چھوڑ جاؤ، ہم اسے دینی علم سکھائیں گے، اس نے بڑے کام کرنے ہیں۔“

قصہ مختصر آدھ گھنٹے کی جیل و محبت کے بعد جب چودھری شریف اور ان کی بیوی آنکھیں پونچھتے ہوئے شاہ جی کے عجیبے سے نکلے تو دلا ان کے ساتھ نہیں تھا۔

شاہ جی نے نیکی کے ساتھ ایک "درس" بنا رکھا تھا، جس میں دو اڑھائی سو طالب علم پڑھتے تھے، دلا بھی ان میں سے ایک تھا، درس گاہ میں قرآن مجید کی ناظرہ تعلیم کے علاوہ قرب و جوار کے دیہات سے لنگر کے لیے راشن جمع کرنا، مگر گھر جا کر طالب علموں کے لیے پرانے کپڑے اکٹھے کرنا، شام کو گاؤں سے روٹیاں مانگ کر لانا اور استاد کے غسل کے لیے کنویں سے پانی کھینچنے والے کی ذمہ داری تھی، جو اس نے نہایت خشوع و خضوع سے گیارہ برس تک نبھائی۔ اس طویل عرصے میں اس نے قرآن مجید حفظ کیا، عام روزمرہ کے مسئلے مسائل سمجھے، جنت اور دوزخ کے احوال پر ساڑھے چار گھنٹے کی تقریر پکاکی (زبانی یاد کی)، لوگوں کو چندہ دینے پر ابھارنے کے لیے وعظ تیار کیا اور قرآنی واقعات پر ایک طویل "خطبہ" ذہن نشین کیا۔

ٹھیک ۲۵ برس کی عمر میں اس کو "سند" مل گئی۔ اب وہ مولانا عبد اللہ تھا، لیکن کیونکہ عوام الناس میں وہ "دے" کے نام سے زیادہ مشہور تھا، لہذا لوگوں نے اس کے نام کے ساتھ "مولوی" جوڑ کر حسب توفیق اس کی عزت افزائی شروع کر دی۔ ایک آدھ برس کی "بیروں گاری" کے بعد اسے تھوڑی بہت کدو کاوش سے ایک گاؤں کی مسجد "مل" گئی۔ یوں اسے تیرہ چودہ برس کا سیکھا ہوا علم پھیلانے کا موقع مل گیا۔ ویسے تو اسے "پرفارمنس" کے دوران کسی قسم کی رکاوٹ کا سامنا کرنا نہیں پڑتا تھا، لیکن صبیحے کا ایک آدھ دن (جب اسے سرگی کا دورہ پڑتا) اس پر بڑا کڑا گزرتا لیکن بہر حال وہ اپنی اس خدائی پر بھی آہستہ آہستہ قابو پا گیا۔

مولوی دے کا فوج بڑا برانت تھا، کیونکہ اس نے اپنے پیدائشی خفاکس کے باوجود اگلے ایک سال میں نہ صرف اپنی تقریر چھ گھنٹے تک پھیلائی، بلکہ دن رات کی محنت سے اب وہ اختلافی مسائل پر بھی چھوٹے موٹے مولوی کو منہ توڑ جواب دینے کے قابل ہو چکا تھا، لیکن بد قسمتی ملا حظہ کیجیے حاسدین کو اس کی یہ دن دہنی اور رات چوگنی ترقی ایک آنکھ نہ بھائی، لہذا انہوں نے ایک سازش کے ذریعے مولوی دے کو ایک "اخلاقی جرم" میں اندر کرادیا (کم از کم مولوی دے کا یہی موقف ہے) مقدمہ چلا، مولوی دے کا وکیل ہار گیا، حاسدین کا ٹکڑا وکیل جیت گیا اور یوں دے کو تین سال قید ہوگئی یہ مولوی دلا اب پنجاب کی ایک جیل میں نصف قید کاٹ چکا ہے۔

میں نے ایک روز دے سے پوچھا: "یار مولوی تم لوگ عام آدمی کو خدا سے اتنا کیوں ڈراتے ہو۔" مولوی نے قہقہہ لگا کر کہا: "اگر ہم ان لوگوں کو خدا سے نہ ڈرائیں تو یہ ہمارے قابو کہاں آئیں۔" میں نے مسکرا کر کہا: "لیکن یار یہ زیادتی نہیں؟" مولوی بیچیدہ ہو گیا، چند لمحوں تک اوپر چھت کی طرف دیکھتا رہا پھر میری طرف متوجہ ہو کر بولا: "جس بچے نے نگر جمع کر کے قرآن مجید پڑھا ہو، جسے تم اوسے مولوی کہہ کر پکارتے ہو، جسے تم کرکٹ بیچ کر نہ دیکھنے دیتے ہو، جو تم لوگوں میں بیٹھ کر ڈائجسٹ نہ پڑھ سکتا ہو، ٹی وی نہ دیکھ سکتا ہو، ریڈیو نہ سن سکتا ہو، جو بازار میں گھوم نہ سکتا ہو، جو پتلون نہ پہن سکتا ہو، جو دھوپ کا چمٹہ نہ لگا سکتا ہو، تم اس سے توقع کرتے ہو وہ تم سے بدلہ نہیں لے گا، تمہارے ساتھ میانہ روی برتے گا، تم لوگ بے وقوف نہیں ہو؟" مجھے مولوی دے کی بات میں وزن محسوس ہوا: میں نے اسے مزید کریدنے کے لیے پوچھا "پیارے

تو مفتی رحمان ہے۔" مولوی نے ہاں میں گردن ہلائی: "ہاں ہے، پر ہم کیا کریں؟ ہماری محرومیاں ہمیں زندگی کے کسی دوسرے رخ پر سوچنے ہی نہیں دیتیں، میرے سامنے ایک واقعہ پیش آیا، چند لوگوں نے ریلوے پھاٹک کے چوکیدار سے گالی گلوچ کی، چوکیدار چڑ گیا، اس نے پھاٹک بند کیا اور چابی ہل سے نیچے گرا دی، ساری ٹریفک ہلاک ہو گئی، لوگوں نے لعن طعن کی تو وہ بڑے اطمینان سے بولا، صاحب چابی ہاتھ سے کھسک کر نیچے گر گئی، معافی چاہتا ہوں، اب بتاؤ لوگ اس کا کیا بکاڑ سکتے تھے، بالکل یہی صورتحال مولوی کی ہے۔ تم لوگ اسے نفسیاتی، سماجی اور معاشرتی طور پر محروم رکھو گے، تو وہ بھی اپنا پھاٹک بند کر کے چابی گم کر دے گا، یا پھر اپنی مرضی کے لوگوں کو آنے جانے کا موقع دے گا۔"

"پر یار یہ تو بڑی خوفناک صورتحال ہے۔" میں نے ماتھے سے پسینہ پونچھتے ہوئے کہا: "بالکل ہے۔" وہ فوراً چلایا۔ "بالکل ہے جب تم معاشرے کے سب سے مضبوط فریق کو، جس کے بغیر تم مردے تک دفن نہیں کر سکتے، جدید تعلیم سے محروم رکھو گے تو تم پر اس سے کہیں زیادہ بربادی آئے گی، تم مجھے دیکھو میرے دوسرے بہن بھائی انجینئرز ہیں، ڈاکٹر اور وکیل ہیں، لیکن کیونکہ میں ذہنی طور پر ایٹارمل تھا، لہذا میرے والدین نے مجھے "درس" میں جمع کر دیا، جہاں سے میں معاشرے کے لیے بدھب لے کر آیا۔ اب مجھے ایمانداری سے بتاؤ کیا تم ایک ایٹارمل شخص سے آپریشن کرا لو گے، ایک کند ذہن کو انجینئرنگ کی ڈگری دے دو گے، ایک معذور انسان کو جہاز کا کپتان بنا دو گے؟ نہیں لیکن تم ایک ایسے شخص کو بطور مذہبی رہنما سردار قبول کر لو گے جو سکول میں چل نہ سکا، جو تیسری یا کسی دوسری معاشی، معاشرتی اور جسمانی مجبوری کے باعث "درس" میں داخل ہو گیا جو سر پر ٹوپی رکھ کر مسجدوں میں آ بیٹھا تم خود فیصلہ کرو ایسا شخص مسجد میں بیٹھ کر رٹی رٹائی تقریروں کے ذریعے تم میں خوف نہیں پھیلانے کا تو کیا کرے گا۔"

میں نے پوچھا: "یار مولوی اس کا کوئی حل ہے؟"

ہاں ہے۔ وہ بڑے رसान سے بولا: "تم لوگ میڈیکل کالجوں اور انجینئرنگ یونیورسٹیوں کے طالب علموں کی طرح اپنا بہترین دماغ درسوں میں بھیجو، درسوں میں مولویوں کی جگہ پروفیسر تعینات کرو، معاشرے میں عالم کا مقام بحال کرو، اوئے مولوی کچھ ختم کرو۔"

میں جب بھی سنتا ہوں اسلام اور معاشرے کے درمیان جاہل ملا کھڑا ہے، مولوی کی موجودگی میں وحشی و مسعت ممکن نہیں، ہم مولوی کو بدلے بغیر ترقی نہیں کر سکتے تو مجھے بے اختیار "مولوی دلا" یاد آ جاتا ہے اور میں سوچتا ہوں۔ ۱۳ کروڑ لوگوں کی جس اسلامی نظریاتی ریاست میں صرف ۱۳ پاپی ایچ ڈی عالم دین ہوں، جس کے ۹۰ فیصد مولانا جدید تعلیم سے بے بہرہ ہوں، جس میں معذور بچے دین کے رکھوالے ہوں، اس ملک میں اسلام اور معاشرے کے درمیان مولوی دے لے نہ کھڑے ہوں تو کون کھڑا ہو۔

سوال یہ نہیں کہ مولوی نے ہمیں کیا دیا، سوال یہ ہے ہم نے مولوی کیا دیا۔

موجو داڑو کے کلرک

شہر سے باہر پتھر کی اونچی چوکیوں پر درجنوں چکیاں تھیں اور ان چکیوں کے سامنے غلاموں کی طویل ہیر کیں تھیں۔

گائینڈ نے پراسرار انداز سے شکست دیواروں اور گری چھتوں کی طرف اشارہ کر کے کہا "یہاں ان ہیرکوں میں آنا پیسنے والے غلام رہتے تھے، ہر صبح سورج کی پہلی کرن کے ساتھ کوڑا بردار سپاہی ان ہیرکوں میں داخل ہوتے اور انہیں اٹھا کر چکیوں کے سامنے بیچ دیتے جہاں یہ لوگ رات گئے تک چکی کا سنگی پنڈل تھماتے رہتے اور ایک روٹی صبح اور ایک روٹی شام اس طویل مشقت کا معاوضہ پاتے، جسے وہ دو پیالے پانی کے ساتھ نگل جاتے۔ اور جب رات گہری ہو جاتی اور مالدے کیوں لے اندھیروں میں گھس جاتے اور جھگ سے چور غلام چکیوں پر گر جاتے تو سپاہی ان کی پشتوں پر کوڑے برساتے جو چیخ اٹھتا، اسے دوبارہ مشقت پر لگا دیا جاتا اور جس کے منہ سے کوئی سسکی نہ نکلتی اسے گھسیٹ کر ہیرک میں ڈال دیا جاتا جہاں اس لمبے سیاہ مکھور اندھیرے، بول و براز کی سڑاند اور زخموں سے رستی سسکیوں کے سوا کچھ نہ ہوتا۔ یہ صدیوں کی مشقت تھی جس نے ان کے بازوؤں کو حرکت کا اس قدر عادی بنا دیا تھا کہ ان کے ہاتھ ٹینڈ میں بھی دائرے میں گھومتے رہتے تھے جبکہ طویل عرصے تک بیٹھنے رہنے سے ان کے گھٹنوں کے جوز پتھر ہو چکے تھے، پنڈلیاں سوکھ چکی تھیں اور پاؤں بے حس ہو چکے تھے چنانچہ انہیں ہیرکوں سے اٹھا کر لایا جاتا اور کام ختم ہونے پر اسی حالت میں واپس رکھ دیا جاتا، یہ عمل مدتوں سے جاری تھا، وہ کون تھے؟ وہ کہاں سے آئے؟ وہ کب سے یہ سب کچھ کر رہے ہیں؟ اور انہیں کس جرم کی سزا مل رہی تھی؟ وہ کچھ نہیں جانتے تھے، وہ جانتے بھی کیسے کیونکہ وہ انہی ہیرکوں میں پیدا ہوئے تھے، انہوں نے ہوش سنبھالتے ہی خود کو چکی کے سامنے پایا تھا، وہ چکی کی کھوں کھوں اور کوڑے کی شراب کے سوا کوئی آواز شناخت نہیں کر سکتے تھے اور وہ روٹی کے سوا کوئی لفظ ادا نہیں کر سکتے تھے۔

یہ لوگ موجو داڑو کے غلام تھے۔

گائینڈ کی آواز شکست گلیوں اور بھر بھری دیواروں میں جذب ہو گئی تو ہم نے دیکھا ہمارے سامنے ایک شہر پانچ ہزار برس کی خاموشی اور مے لینا تھا جس کے شکست درو بست سے حسرت چھٹی تھی اور جس کی گری

چھتوں، نسیم ایستادہ دیواروں اور چھوٹی اینٹوں کے فرش سے عبرت رستی تھی اور جس کی گلیوں میں قضا کی آہٹ سنائی دیتی تھی، "نہ جانے ادھر سے کس عذاب کا گزر ہوا کہ شہرہ بران ہو گیا، عمارتیں اڑھے گئیں، تہذیب دفن ہو گئی۔" ہم سب نے اپنے آپ سے پوچھا لیکن کسی کو کوئی جواب موصول نہ ہوا۔

ہم سب مختلف ٹکریوں پر بیٹھ کر دیر تک اپنی بے بس عقل سے لاتے رہے۔

جب شام اجڑی گلیوں سے اپنی نکھری کر نہیں سیت رہی تھی تو ہم ایک بار پھر غلاموں کی ہیرکوں میں داخل ہوئے وہاں ملگیا اندھیرا اور ہڈیوں میں اتر جانے والی خشکی تھی، قریب کھڑے پولش سیاح نے مجھ سے پوچھا "یہ شہر کیوں برباد ہوا؟" میں نے ناخن سے ہیرک کی دیوار کھرچتے ہوئے جواب دیا "اس لیے کہ یہاں کے لوگوں کی زندگی کا کوئی مقصد نہیں تھا اور بے مقصد لوگوں کو زمین زیادہ دیر تک برداشت نہیں کرتی۔"

ہم تہذیب کے اس عظیم قبرستان سے باہر نکلے تو زندہ دور کے سینکڑوں زندہ موبجوداؤں ہمارے سامنے کھڑے تھے، ایسے موبجوداؤں جن کا ہر گھر غلاموں کی ہیرک تھا اور جس سے سورج کی دستک کے ساتھ ہی لاکھوں غلام باہر آ جاتے ہیں، کوئی بیدل، کوئی سائیکل، کوئی موٹر سائیکل، کوئی بس اور کوئی کار پر چکی کی طرف چل پڑتا ہے اکثریت کی کینیوں پر برف جمی تھی، اکثریت کی کھوپڑی تنگی ہو چکی تھی، اکثریت کی گردن پینڈہلم کی طرح لٹی تھی، اکثریت کے کندھے جھکے تھے، اکثریت کی آنکھوں پر "کھوپڑے" چڑھے تھے، اکثریت کی سانس اکثریتی، اکثریت کے حلق میں غلغلا سا ساز بجاتا اور اکثریت کی پیشانی پر شکنوں کا جال تھا۔۔۔ ان میں سے کچھ ایک سے سولہ گریڈ تک آتا پیتے ہیں اور کچھ سترہ سے بائیس گریڈ تک، کچھ چکیاں لے کر دوکانوں پر بیٹھے ہیں اور کچھ کارخانوں میں، یہ سب ایک دوسرے کے بھائی ہیں، یہ سب ایک جیسے ہیں یہ سب بے مقصد، بے حس اور لاتعلقی ہیں، یہ سب آٹا پیسنے والے ہیں۔ یہ سب ۲۲ لاکھ نہیں ۱۵ کروڑ ہیں، ان میں خواجہ فروش، مزدور، کسان، دوکاندار، تاجر، کمیشن ایجنٹ، استاد، مستری، ڈرائیور، کارخانے دار، رکن پارلیمنٹ اور حاکم شامل ہیں۔ یہ سب کلرک ہیں، سب غلاموں کی ہیرکوں کے قیدی ہیں، ان میں سے کسی کو خبر نہیں وہ کہاں سے آیا، کب سے یہاں ہے اور یہ سب کچھ کیوں کر رہا ہے؟ کس کے لیے کر رہا ہے؟ یہ لوگ ہیرکوں میں پیدا ہوئے اور انہوں نے ہوش سنبھالتے ہی خود کو چکی کے سامنے پایا اور اب یہ روزِ مبع آٹھ کر چکی پر آ جاتے ہیں اور شام کو چند روٹیاں باندھ کر واپس چلے جاتے ہیں۔

آپ نے ایسا شخص دیکھا جو کلرک بھرتی ہوا اور صدر بن کر ریٹائر ہوا، نہیں لیکن میں نے دیکھا ہے، جب وہ "چکی" سے فارغ ہو کر جا رہا تھا تو نہ صرف اس کے ہاتھ خالی تھے بلکہ روزِ ناکام کی تھکن بھی اس کے چہرے پر لکھی تھی، جو چند روٹیاں کمائیں آدمی عزیز کھا گئے، آدمی اولاد کو دے دیں اور خود پینشن کو بڑھا پے کی لاٹھی بنا کر راستہ ٹٹولنے لگا۔۔۔ آپ نے پشاور کا محنت اور مشقت سے بنا یہ شخص تو نہیں دیکھا لیکن آپ نے اس کے وہ ہزاروں لاکھوں بھائی بند ضرور دیکھے ہوں گے جنہیں سوسائٹی ایک خاص عمر پر فارغ کر دیتی ہے، آپ

ان کے پاس بیٹھیں، ان کی محنت، مشقت اور سخت کوشی کی داستانیں سنیں یہ لوگ چراغ کی روشنی میں کیسے پڑھے؟ انہوں نے کیسے چند روپوں سے ترقی کا سفر شروع کیا؟ یہ کیسے ۲۰، ۲۰ کھنے کام کرتے رہے؟ آپ سنتے جائیں سنتے جائیں اور آخر میں خود سے سوال کریں اس شاندار ماضی کے باوجود آج یہ لوگ معذوری کی زندگی گزار کیوں رہے ہیں، تاریخ ان کے نام تک سے کیوں واقف نہیں، ان کی اولاد انہیں شہادت کرنے سے کیوں انکاری ہے۔ مجھے یقین ہے آپ کو اپنے سوال کا جواب نہیں ملے گا۔

مجھے سوہنجو داڑو سے اٹھتی ٹھنڈی ہوائ نے بتایا "جو لوگ زندگی پر احسان نہیں کرتے وہ چکیاں چلانے والے لوگ ہوتے ہیں، آٹا پیسنے والے لوگ ہوتے ہیں، وہ روٹیاں بونے اور روٹیاں کاٹنے والے لوگ ہوتے ہیں، کلرک ہوتے ہیں، غلام ہوتے ہیں اور بے مقصد لوگوں کو، خود کو زندہ رکھنے کی دوز میں لگے لوگوں کو زمین زیادہ دیر تک برداشت نہیں کیا کرتی۔"

مجھے خاموش گلیوں نے بتایا "جن بستیوں میں اپنی ذات کے لیے محنت کرنے والے لوگوں کی تعداد بڑھ جاتی ہے انہیں قضا چاٹ جایا کرتی ہے۔" مجھ سے گری چھتوں اور جھکی دیواروں نے کہا "جہاں اپنی ہی ذات کے گرد گھومنے والے لوگ رہتے ہوں وہاں بھر بھری دیواریں، نوٹی پھتیں اور کچی پکی اینٹیں انسانوں سے زیادہ قیمتی ہو جاتی ہیں، وہاں وقت اس قدر گھارے کی دیواروں کو اگلے دوپہر کے لوگوں کے لیے محفوظ کر لیتا ہے۔"

مجھ سے پولش سیاح نے پوچھا "تم لوگ اتنے جھکے ہوئے، چڑچڑے، بیزار اور مردہ دل کیوں ہو۔" میں نے ناخن سے ہیرک کی دیوار کھرچتے ہوئے کہا۔ "اس لیے کہ ہمارے سامنے کوئی مقصد نہیں، ہم روٹیاں بونے اور روٹیاں کاٹنے والے لوگ ہیں، ہم ایک کھانے سے دوسرے کھانے کی طرف سفر کرتے ہیں، ہم سب کلرک ہیں، ہم سب سوہنجو داڑو کے کلرک۔"



کیریمٹ فارمولہ

آنزن ہاور کو کسی مشیر نے بتایا "ایران کا ڈاکٹر مصدق اسلامی دنیا کا ہیرو بن کر ابھر رہا ہے۔" مصدق نے گالف کی سٹک کندھے پر رکھی اور پوچھا "کیسے؟"

"اس میں کردار ہے، علم ہے، فراست ہے، وہ دلوں کو مسح کر دینے والی شخصیت کا مالک ہے اور سب سے بڑھ کر وہ اپنے مذہب سے غافل ہے۔" مشیر نے جواب دیا۔

"ہوں" آنزن ہاور نے چند قدم اٹھائے، گیند کے قریب پہنچا، سٹک ہوا میں لہرائی اور زوردار ہٹ لگا کر بولا "تو ڈاکٹر کو بتا دو آنزن ہاور گالف کا کتنا اچھا کھلاڑی ہے۔"

"سر" مشیر نے ہاتھ دلوں پر رکھا، تھوڑا سا جھٹک کر سلام کیا اور دو ٹوک سب سے کورڈنگ تھا ہوا پر چلا گیا۔

اگلے روز تھوڑا دور اور روز ویسٹ کے شاطر دماغ پوتے کیریمٹ روز ویسٹ کو سی آئی اے ہینڈ کو آرڈر میں طلب کر کے "چینج دی ورلڈ" نامی منصوبہ دے دیا گیا، اس نے ایک ملین ڈالر میں ڈاکٹر مصدق کو ہٹا کر تمام اختیارات شاہ ایران کے حوالے کرنے سے، کیریمٹ نے فائل دیکھی، سچا کا ایک طویل "سونا" لگایا اور ٹھہر ٹھہر کر بولا: "ہو جائے گا۔"

اور پھر تاریخ نے دنیا کو ادھر سے ادھر ہوتے تھے۔ وہ مصدق جو اسلامی دنیا میں امام کعبہ جتنی عزت و توقیر کا مالک بنتا جا رہا تھا گلیوں میں رسوا ہوا، چوراہوں میں اس کی تصویروں کو جوتوں کے ہار پہنائے گئے، اس کی گاڑی کے پیچھے "اے اے اے" کے نعرے لگائے گئے، دیواروں پر "مرگ بر مصدق" کے کلمات لکھے گئے جب کیریمٹ واپس واشنگٹن پہنچا تو "چینج دی ورلڈ" کی فائل پر "دی ورلڈ بیز چینجڈ" لکھا جا چکا تھا۔ ایئر پورٹ پر خوش آمدید کہنے والے جزل نے اسے سلیوٹ کر کے پوچھا "سر اب آپ کیا چاہتے ہیں" اس نے بڑھی ہوئی شہسوکھا تے ہوئے جواب دیا "نیند، جسے میں نے پانچ ماہ تک اپنے قریب نہیں چھلکنے دیا۔"

وہ روز بعد کیریمٹ روز ویسٹ وائٹ ہاؤس کے ڈائننگ ہال میں آنزن ہاور کو اپنی کامیابی کی داستان سنارہا تھا، سی آئی اے کا چیف ایمن ڈیلس اور اس کا امور خارجہ کا وزیر بھائی فاسٹر ڈیلس بھی وہیں موجود تھے۔ جب کیریمٹ شاہ ایران سے اپنی آخری ملاقات پر پہنچا تو اس نے ایک لمبا سانس لیا اور آنزن ہاور کو

مخاطب کر کے بولا:

”جناب صدر میں نے یہ عظیم کارنامہ تو سراہا جام دے دیا لیکن میں ایک بات غموں گزرا کرنا چاہتا ہوں۔“
”وہ کیا؟“ آئزن ہاور جھرمی اور کانائیک طرف دیکھ کر بولا:

”دنیا کے کسی بھی بڑے آپریشن سے پہلے ہمیں اپنی حدود و قیود کا اندازہ کر لینا چاہیے کیونکہ ہم چاہے کتنے ہی رییسر فل کیوں نہ ہوں ہم کسی صورتحال سے فائدہ تو اٹھا سکتے ہیں لیکن کوئی صورتحال پیدا نہیں کر سکتے۔ ایرانیوں کے اس بیرو کو کیریٹ روز ویٹ نے نہیں خود ایرانیوں نے مارا خدا کی قسم اگر ایرانی نہ چاہتے تو تہران میں دنیا کا کوئی کیریٹ کامیاب نہیں ہو سکتا تھا، خواہ آئزن ہاور دنیا کی تمام فوجوں کے ساتھ خود ہی وہاں کیوں نہ چلا جاتا۔“ اس نے کانائیک اٹھایا اور پورے اطمینان سے پلیٹ پر جھک گیا۔

اور اس کے بعد کیریٹ کے یہ الفاظ امریکن ڈپلومیسی میں ”کیریٹ فارمولہ“ کے نام سے لکھ دیے گئے۔

جی ہاں، یہ ۱۹۵۳ء کا واقعہ ہے، جب دوسری جنگ عظیم کے سارے زخم ابھی ہرے تھے، برما کے محاذوں پر توپوں کا نشانہ بننے والے گورے فوجیوں کی بیوائیں لندن، پیرس اور برن میں عصمت فروشی کا دھندا کرتی تھیں۔ چربی کی فیکٹریوں کی چمنیوں میں پرندوں نے گھونسلے بنائے تھے۔ جاپان، تائیوان، ساکی اور ہیرو شیماکے کھنڈرات سے عبرت کی راکھ چن رہا تھا۔ چین الیونچوں کو ٹھکانے لگانے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ عرب صحرا میں کھوئے اونٹ تلاش کر رہے تھے اور روس اپنے غوام کو قطار بنانے کا آرٹ سکھا رہا تھا۔ جی ہاں، میرے محترم قارئین! اس وقت امریکہ دنیا کے ساتھ فیصد جی ڈی پی کا مالک تھا۔ اس کی سرکیس شیشے کی طرح چمکتی تھیں، اس کی عمارتیں آسمان کو بوسہ دیتی تھیں اور اس وقت امریکی صدر مینج معنوں میں دنیا کا مالک تھا لیکن اس طاقت کے باوجود اس کا شاطر ترین شیر مسلم ورلڈ کو ایک سو سال پیچھے دھکیلنے کے بعد بڑے دعویٰ سے کہتا ہے،

”We cannot creat a situation we only exploit a situation“

اور پھر دنیا کی سفارتی تاریخ نے گواہی دی، مشرق سے مغرب تک حکمرانی کرنے والا امریکہ سمندری چٹانوں پر کھڑے چھوٹے سے ”کیوبا“ کو فتح نہ کر سکا، صحرا کی ریت میں ہواؤں کے رحم و کرم پر قائم لیبیا کو اپنی پوری طاقت کے باوجود مسخر نہ کر سکا۔ انقلاب کے بعد اپنے تمام تر جبر کے باوجود ایران کو سرنگوں نہ کر سکا اور اپنی ساری عسکری طاقت کے باوجود ریت نام کے نیسے جھیلوں کو قابو نہ کر سکا اور جب ان تمام فائگوں پر سرخ ربن چڑھانے کا وقت آیا تو ان کے اوپر لکھ دیا گیا۔ ”کیریٹ فارمولہ کے مطابق ہم کوئی صورتحال پیدا نہیں کر سکتے۔“

اور ہاں میرے دوستو! مجھے جب کوئی سیاستدان بتاتا ہے ”بہت جلد تبدیلی آنے والی ہے، امریکہ نے گر کر، سگنل، دے دے دے۔“ جب کسی سمجھ میں، ہم دھماکے کے بعد حکمران کہتے ہیں ”سے“ ”را“ کا کما دھرا

ہے۔ "ٹرین حادثے کے بعد انکشاف ہوتا ہے "ملک میں موساد کے ایجنٹ داخل ہو چکے ہیں۔" اور اندھے قتلوں کے بعد اعلان کیا جاتا ہے "خاد کے درندے ملک میں آ چکے ہیں۔" تو مجھے فوراً کیریٹ روز ویسٹ یاد آ جاتا ہے اور میں اپنے آپ سے پوچھتا ہوں کیا دنیا کی کوئی طاقت کسی ملک کو اندر سے کنزور کر سکتی ہے، تو مجھے جواب ملتا ہے "نہیں" میں پوچھتا ہوں "کیوں؟" تو جواب آتا ہے: "جس بدن میں صحت مند خون دوڑ رہا ہو، اس پر کبھی وائرس کا حملہ کامیاب نہیں ہوتا لیکن جس چوکھٹ کو دیمک چاٹ چکی ہو، اس کے کواڑ دستک تک برداشت نہیں کرتے۔"

ہاں ملک اندر سے کھوکھلا ہو تو وہ اپنی ہی ذات میں کیریٹ ہوتا ہے، اسے تباہی کے لیے کسی بیرونی کیریٹ کی ضرورت نہیں ہوتی۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

گواور

ذوالفقار علی بھٹو جب سربراہ مملکت کی حیثیت سے پہلی بار امریکہ گئے تو صدر ریکسن نے اوول آفس کے دروازے پر ان کا استقبال کیا، دونوں نے گرمجوشی سے مصافحہ کیا، مسکراہٹوں کا تبادلہ ہوا، ایک دوسرے کی سمارٹنس کی تعریف ہوئی اور پھر دونوں دنوں ملاقات کے لیے میٹنگ روم میں چلے گئے۔ دس منٹ بعد دروازہ کھلا اور ریکسن نے گردن باہر نکال کر چڑھتی لہجہ میں کہا ”مسٹر کسنگر اینڈ مسٹر ہلسنگر (ہٹری کسنگر ان دنوں میں وزیر خارجہ اور جیمز آر ہلسنگر وزیر دفاع تھے) کیا آپ میری مدد کریں گے۔“ دونوں وزراء اٹھے، اپنی اپنی ٹائیاں درست کیں اور میٹنگ روم میں چلے گئے۔ دروازہ بند ہوا تو باون منٹ بعد کھلا، بھٹو صاحب باہر آئے تو بہت ڈپر لہجے میں ”لاؤ تھکے تھکے تھے۔“

Kashif Azad @ OneUrdu

اس رات آخری پہر جب پاکستانی سفارتخانے کی سرگرمیاں ختم ہو چکی تھیں، زیادہ تر ملازمین آرام کے لیے جا چکے تھے تو ڈائمنگ نیبل پر صرف بھٹو صاحب، فادرن سروس کے چار سینئر اور ایک جونیئر آفیسر رہ گئے۔ بھٹو صاحب نے پاؤں نیبل کے نیچے پھیلانے اور ذرا سی ترش روئی سے بولے ”یہ احمق امریکی نیل کی عقل لے کر پیدا ہوئے ہیں۔“ آفیسرز نے چونک کر اوپر دیکھا، بھٹو صاحب کی آنکھوں میں خلاف معمول حسم، بیزاری اور کوفت تھی۔ حاضرین سے نسبتاً سینئر نے آہستہ سے پوچھا ”ابنی پرابلم سر“ بھٹو صاحب نے ٹانگیں تہہ کیس، سیدھے ہو کر بیٹھے اور نیبل پر مکالمہ کر بولے ”میں نے ریکسن کو آفر دی تم گواور میں اپنا نیول بیس بنا لو، یہ کبھی مشرق کی کنبھی بنے گا، لیکن بزدل روسیوں سے ڈر گیا۔“ بھٹو کے یہ فقرے سفارتکاروں پر ہم کی طرح پھنے اور ان کے منہ حیرت سے کھل گئے، بھٹو صاحب تھوڑے سے توقف کے بعد پھر بولے ”کسنگر بھی بالکل گدھا ہے، جب ہلسنگر نرم ہوا تو اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا، امریکہ پچھلے برس سے (۷۲ء سے) روس کو ایک ایسی حد بندی پر قائل کر رہا ہے جس سے وہ آگے بڑھے اور نہ ہم اسے پار کریں، ان حالات میں اگر ہمارا بحری بیڑا پرشین گلف (خلیج فارس) کے قریب پہنچا تو ایک بڑی جنگ شروع ہو جائے گی۔“ بھٹو صاحب ذرا سا رکے اور سامنے پڑے کپ سے کافی کا تھخ گھونٹ بھر کر بولے ”لیکن تم لوگ لکھ لو، امریکیوں نے آج میری جو آفر ملکر لی، انہیں یہ بالآخر قبول کرنا پڑے گی۔“ وہ ذرا سے رکے دایاں ہاتھ کھول کر ہوا میں لہرایا اور بولے

"پانچ برس بعد" پھر کھول کر ہوا میں لہرایا اور بولے "حد میں برس بعد امریکی گواہ ضرور آئیں گے۔"

اس گہری ہوتی رات سے ٹھیک چار برس بعد جب ملک میں پنی این اے کی تحریک زوروں پر تھی، سڑکوں، گلیوں اور چوراہوں سے "بھٹو کتا ہائے ہائے" کی صدائیں اٹھ رہی تھیں تو امریکہ میں پاکستانی سفارتخانے کی ٹیم کا وہ جونیئر آفیسر جو بھٹو، بکسن ڈیل کا گواہ تھا، فادرن آفس کے سب سے سینئر آفیسر کے گھر داخل ہوا شی کر کے ہونٹوں پر انگلی رکھی اور اسے باہر لان میں لا کر بولا "مجھے یقین ہے اب کوئی شخص ہماری گفتگو نہیں سن سکتا۔" سینئر آفیسر نے دونوں ہاتھوں سے اپنی ہماری ٹینک درست کی اور آہستہ سے بولا "شیور، شیور" جونیئر آفیسر نے سر اٹھکی سے آگے پیچھے دیکھا اور پھر سرگوشی میں بولا "آغا جی بھٹو روس سے گواہ کا سودا کر چکا ہے، اگر آپ ملک بچا سکتے ہیں تو بچالیں۔" سینئر آفیسر پر یہ الفاظ قبر کی طرح ٹوٹے اور پکڑا کر بولا "لیکن اس انفارمیشن کا سودا کیا ہے؟" جونیئر آفیسر ذرا سا مسکرایا اور پھر عادتاً چٹلون کی جیب میں ہاتھ دے کر بولا "سراسر کا سودا میں خود ہوں، بھٹو نے میرے سامنے روسی سفیر کو بلا کر کہا۔" آپ اپنے صدر کو مطلع کر دیں، اگر روس مجھے امریکیوں سے بچانے کے لیے فرینڈ گارڈز فراہم کر دے تو میں انہیں گرم پانیوں کا خزانہ دے دوں گا۔" سینئر آفیسر نے ہاتھ باندھ کر بے چینی سے لان کا چکر لگایا اور پھر گلاب کی کیاریوں کے قریب رک کر بولا "لیکن روسی گارڈز ہی کیوں؟" جونیئر آفیسر دوبارہ مسکرایا اور بولا "یہ سوال وہی سفیر نے بھی بھٹو سے کیا تھا۔" سینئر آفیسر نے چونک کر اوپر دیکھا جونیئر آفیسر نے ایک لمبا سانس لیا اور گویا ہوا "بھٹو صاحب نے جواب دیا،" جس طرح سوئٹزر لینڈ کے فوجی روم آکر پوپ کی حفاظت کرتے ہیں، اسی طرح میں بھی چاہتا ہوں، روس میری حفاظت کی ذمہ داری قبول کر لے، کیونکہ مجھے محسوس ہوتا ہے میں چاروں اطراف سے امریکی ایجنٹوں میں گھس چکا ہوں، یہاں تک کہ اگر کارڈر اشارہ کرے تو شاید میرا باورچی ہی مجھ پر ہزری کاٹنے والی چھری سے حملہ کر دے۔"

اور پھر اس رات جب سارے پیرے دارمشی نیند سو رہے تھے وہ سینئر آفیسر غلام اسحاق خان کے گھر گیا، انہیں کھینچ کر لان میں لایا اور ساری واردات ان کے گوش گزار کر دی۔ غلام اسحاق خان وقت ضائع کیے بغیر آری چیف ہاؤس گئے اور دیر گئے تک وہاں مصروف رہے۔ اس ملاقات سے ٹھیک ایک ہفتے بعد جنرل ضیاء الحق نے امریکی سفیر کو اپنی رہائش گاہ پر عشائیہ دیا اور لان کے ایک ویران کونج میں اسے ہاتھوں کے اشاروں سے گھنٹہ بھر بریفنگ دیتے رہے۔

۳ جولائی ۱۹۷۷ء کی رات جب وزیر اعظم ہاؤس کے ڈائمنگ نیبل پر جنرل ضیاء الحق کو رکنا غرز کی موجودگی میں ذوالفقار علی بھٹو سے گفتگو کر رہے تھے اور بار بار ان کے منہ سے "دی سر، دی سر" نکل رہا تھا اور بھٹو "معاملات جلد حل ہو جائیں گے۔" کی یقین دہانی کر رہے تھے تو اچانک جنرل ضیاء الحق نے پوری عاجزی سے سینے پر ہاتھ رکھا، تھوڑے سے آگے بھٹکے اور بولے "سر دفا دار گارڈز کی موجودگی میں نئے گارڈز

کی ضرورت نہیں ہوتی ہم آپ کے خادم ہیں، آپ ہم پر کھلا اعتماد کر سکتے ہیں۔" ذوالفقار علی بھٹو کا رنگ بیلا پڑ گیا۔ اگلی صبح جب پاکستان کے عوام کی آنکھ کھلی تو "وفادار" گارڈز حفاظت کی ذمہ داری سنبھال چکے تھے، اسی روز نئے حکمران نے ایک آرڈر جاری کیا اور فاران آفس کے اس سینئر ترین آفیسر اور غلام اسحاق کی پرموشن ہو گئی، کچھ عرصے بعد ان میں سے ایک وزیر بن گیا اور دوسرا ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا صدر۔ ادھر ٹھیک جس برس بعد ۱۹۹۳ء میں امریکی قونصل خانہ (کراچی) کا ایک آفیسر گوادریچا اور شہلہا ہوا ان چٹانوں پر جا رکھا، جہاں سے بندر عباس کی روشنیاں زیادہ دور نہیں تھیں۔ سامنے تانے جیسا سورج سیاہ فام پتھیروں کی بوسیدہ کشتیوں کی اوٹ میں ڈوب رہا تھا جبکہ پیچھے اسلام آباد میں فاران آفس کا ایک سینئر آفسر امریکی فیم کے دورے کا شیڈول تیار کر رہا تھا۔ کیم سے تین تاریخ تک کراچی، تین سے سات تاریخ گوادریچا سات سے نو تاریخ تک چٹانوں کا جائزہ، ہوا کے دباؤ کی پیمائش، پانی کے نمونے اور پتھیروں کی معاشی، معاشرتی اور تہذیبی زندگی پر مفصل رپورٹ، وغیرہ وغیرہ۔

اور اس کے بعد ۹۳ء سے ۹۶ء تک کیا ہوا؟ کون کون گوادریچا؟ کس کس نے زمین کے ایک ایک انچ کا معائنہ کیا؟ بھٹو کی بیٹی نے سلطان قابوس کی آڑ میں امریکیوں کو کیا کیا سہولیات دیں؟ سلطان قابوس واپس کیوں بھاگ گیا، یہ سب تاریخ کا حصہ ہے، جس پر بحث وقت کا ضیاع ہے کیونکہ اب تو صرف وقت کی دیوار پر لکھی تحریر پڑھنے کا وقت ہے اور دیوار پر لکھا ہے "اگر کوئی گوادریچا چاہتا ہے تو سول لگائے اور لے لے۔" ہاں تاریخ کے ان بدترین لمحات میں جب ایران امریکہ کے سامنے پورے قد سے کھڑا ہے، چینی بحیرہ ہند میں اتر چکے ہیں، بھارت پاکستان کی سرحدوں پر مہلک ترین میزائل نصب کر چکا ہے اور دنیا کے تمام بڑے جنگی ماہرین پاکستان کو ایک بدترین جنگ میں جلتا دیکھنے کے متمنی ہیں، مجھے محسوس ہوتا ہے، جیسے بھٹو صاحب پاکستانی سفارتخانے کی ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے ہاتھ لہرا لہرا کر کہہ رہے ہیں "امریکہ ضرور گوادریچا آئے گا، پانچ برس بعد، شاید دس برس بعد، حد میں برس بعد۔" لیکن ٹھہریے! شاید بھٹو صاحب آخری بار ہاتھ لہرا کر "پچیس برس بعد" کہنا بھول گئے تھے۔

(نوٹ: میرا یہ کالم ۹ جنوری ۹۸ء کو شائع ہوا جب سٹر قابوس نے پاکستان سے تازہ تازہ رابطے شروع کیے تھے آج جولائی کے وسط تک صورتحال یہ ہے کہ گوادریچا پر امریکی جہنڈا لہرا رہا ہے، وہ کام جو بھٹو صاحب نہ کر سکے، ان کی بیٹی سرانجام نہ دے سکی، سید ان امریکہ محسن قریشی سے نہ ہو سکا، وہ نواز شریف نے چار ماہ میں بڑی آسانی سے پایہ تکمیل تک پہنچا دیا۔)



خربوزے کی چھریوں سے دوستی

جی ہاں، جب آپ ان لوگوں کو گلے سے لگائیں گے، جن کا چچا مٹی میں بیٹھ کر آج تک اس وقت کا انتہار کر رہا ہے، جب وہ پاسپورٹ اور ویزے کے بغیر پشاور آ سکے، جن کی بیویاں ہندو تھیں، جنہوں نے بھارت سے ۱۲ لاکھ کی تحلیلیاں لیں، جنہوں نے پاکستان کی مٹی میں دفن ہونا تک پسند نہیں کیا اور جنہوں نے "پاکستان از اسٹیل شیٹ" کا نعروں لگایا..... تو ایسا تو ہوگا۔

جی ہاں، جب آپ ان لوگوں کو گلے سے لگائیں گے جنہوں نے مسلم لیگ کو انگریز کی پارٹی کہا، جنہوں نے مسلم لیگ کو کانگریس کی مزاحمت روکنے والی ریت کی بوری کہا، جنہوں نے پاکستان کو انگریزوں کی سازش قرار دیا، جنہوں نے پاکستان کو روس کا دباؤ رکھنے کے لئے ترکی سے چین تک انگریزوں کا بنایا قلعہ قرار دیا، جنہوں نے مسلم لیگی رہنماؤں کو ہندوؤں کے بچے کہا..... تو ایسا تو ہوگا۔

جی ہاں، جب آپ ان لوگوں کو گلے سے لگائیں گے جنہوں نے بجا تک دہلی کہا تھا: "سرحد میں مسلم لیگ کی بنیاد انگریز گورنر جارج کنگسٹن نے ملاؤں کے ذریعے رکھی تھی۔" جنہوں نے کہا تھا: "قائد اعظم نے سکندر مرزا کے ذریعے سرحد میں فرقہ وارانہ فسادات کرائے تھے۔" جنہوں نے کہا تھا: "پاکستان مسلم لیگ نے انگریزوں نے بنوایا تھا۔" جنہوں نے کہا تھا: "قائد اعظم کی بظلوں کے نیچے انگریزوں کی بیساکھیاں نہ ہوتیں تو وہ کچھ نہ ہوتے۔" جنہوں نے کہا تھا: "انگریزوں نے اپنی ہندو قائد اعظم کے کندھے پر رکھ کر چلائی تھی۔"..... تو ایسا تو ہوگا۔

جی ہاں، جب آپ ان لوگوں کو گلے سے لگائیں گے جنہوں نے کہا تھا: "مسلم لیگ نے ہندوستان نہیں مسلمانوں کو تقسیم کیا۔" جنہوں نے کہا تھا: "مسلم لیگ کو ۱۹۴۶ء کا انکیشن انگریزوں نے جتوایا تھا۔" جنہوں نے کہا تھا: "اگر انتخابات میں دھاندلی نہ ہوتی تو پاکستان کبھی نہ بنتا۔" جنہوں نے کہا تھا: "مسلم لیگ کے اکابرین کا کوئی دین تھا اور نہ ہی ایمان۔" جنہوں نے کہا تھا: "پاکستان..... انگریز اور مسلم لیگ دونوں کا مشترکہ مفاد تھا۔"..... تو ایسا تو ہوگا۔

جی ہاں، جب آپ ان لوگوں کو گلے سے لگائیں گے جنہوں نے کہا تھا: "مسلم لیگ سرحد کے لیڈر

انسانیت کے دائرے ہی سے خارج ہیں۔“ جنہوں نے کہا تھا: ”آج پاکستان پر ایسی جماعت (مسلم لیگ) حکمران ہے جس نے آزادی کے لیے کوئی قدم نہیں اٹھایا۔“ جنہوں نے کہا تھا: ”لیاقت علی خان تو پاکستان کی شکل میں ریگستان تک قبول کرنے کے لیے تیار تھے۔“ جنہوں نے کہا تھا: ”مسلم لیگ پاکستان کے مطالبے سے دستبردار ہو چکی تھی، یہ تو انگریزوں نے انہیں چھکی دے کر کھڑا کیا۔“..... تو ایسا تو ہوگا۔

جی ہاں، جب آپ ان لوگوں کو گلے سے لگائیں گے جنہوں نے کہا تھا: ”انڈین نیشنل کانگریس تمام فرقوں اور مذہبی گروہوں کی نمائندہ جماعت تھی۔“ جنہوں نے کہا تھا: ”مسلمانوں نے صرف اپنے نہیں بلکہ پورے ہندوستان کے گلے میں غلامی کا طوق ڈال دیا۔“ جنہوں نے کہا تھا: ”مسلم لیگ ایک بے بنیاد جماعت ہے۔“ جنہوں نے کہا تھا: ”مسلمانوں میں کارلیسوں کی کوئی کمی نہیں۔“ جنہوں نے کہا تھا: ”اگر کانگریس انگریزوں کو لٹکارتی تو مسلم لیگ کھل کر انگریزوں کا ساتھ دیتی۔“ جنہوں نے کہا تھا: ”مسلمان رہنماؤں کے ذہن میں پاکستان کا کوئی واضح نقشہ نہیں تھا۔“ جنہوں نے کہا تھا: ”انگریز ہندوستان میں اسلام کو سیاسی فائدے کے لیے استعمال کرتا رہا۔“ جنہوں نے کہا تھا: ”انگریز کے اشارے پر دین فروش ملا خدائی خدمت گاروں کے مقابلے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔“ جنہوں نے کہا تھا: ”انگریزوں نے ہی مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت بنایا۔“..... تو ایسا تو ہوگا۔

جی ہاں، جب آپ ان لوگوں کو گلے سے لگائیں گے جنہوں نے کہا تھا: ”عبدالرب نشتہ نے مسجد مہابت خان (پشاور) میں جناح کو گالیاں دیں۔“ جنہوں نے کہا تھا: ”مسلم لیگ نے ارکان اسمبلی کی حمایت کے لیے ناجائز کاروبار شروع کر دیا۔“ جنہوں نے کہا تھا: ”قائد اعظم ضدی اور بے اصول تھے۔“ جنہوں نے کہا تھا: ”مسلمانوں کے اکثریتی صوبوں میں مسلم لیگ کی کوئی حیثیت ہی نہیں تھی۔“ جنہوں نے کہا تھا: ”ہم مسلم لیگ کی ظاہری شرافت، اسلامی جذبے اور اپنی سادگی سے دھوکہ کھا گئے۔“ جنہوں نے کہا تھا: ”مملکتوں کے ٹکڑے کرنا اور ان کے حصے بخرے کرنا مسلم لیگیوں ہی کا کام ہے۔“ جنہوں نے کہا تھا: ”مسلم لیگ نہ اپنے وطن کی آزادی کے لیے لڑے، کوئی تحریک چلائی اور نہ ہی انگریزوں کا مقابلہ کیا، چنانچہ اگر انگریز نہ ہوتے تو پاکستان نہ ہوتا۔“ جنہوں نے کہا تھا: ”مسلم لیگ فرقہ وارانہ سیاست کرتی رہی۔“ جنہوں نے کہا تھا: ”قائد اعظم طبعاً اقتدار پرست تھے، اسی لیے انہوں نے ماؤنٹ بیٹن سے چھوٹی کرسی پر بیٹھنے سے انکار کر دیا۔“..... تو ایسا تو ہوگا۔

جی ہاں، جب آپ ان لوگوں کو گلے سے لگائیں گے جو پاکستان کو اپنا نہیں مسلمانوں کا وطن کہتے ہیں، جو خود کو مسلمان نہیں سیکولر کہتے ہیں، جو اسمبلی کا حلف اٹھاتے ہوئے لفظ پاکستان چھوڑ جاتے ہیں، جو پوری زندگی خود کو گاندھی کہتے رہے، جو رومی نینکوں کو پنجاب کے میدانوں میں اترنے کی دعوت دیتے رہے، جو پاکستان کے خلاف کام کرنے والی ہر طاقت کے ساتھی رہے، جو کرکٹ میچ میں بھارت کی شکست پر ساری

بتیاں بجا دیتے ہیں، جو اپنی نجی محفلوں میں پاکستان کو گالیاں دیتے ہیں۔ تو ایسا تو ہوگا۔

جی ہاں، جب آپ ان لوگوں کو گلے سے لگائیں گے جو کارلفر تھے، فوج کے بھگوزے تھے، جو روسی جپ میں بیٹھ کر جلال آباد چلے گئے، جو روسی کیمپوں میں دہشت گردی کی ٹریننگ لیتے رہے، جو افغانستان سے بموں کے تحفے بھیجتے رہے اور جنہوں نے پاکستان میں سینکڑوں افراد کی ہلاکت پر کہا تھا: "جب افغانستان میں مجاہدین بھیجیں گے تو آپ کو بھی بموں ہی کے تحفے ملیں گے، نگل دیتے نہیں۔" تو ایسا تو ہوگا۔

جی ہاں، جب آپ ان لوگوں کو گلے سے لگائیں گے جو افغانستان سے بھاگ کر آنے والے پشتونوں کے حسب نسب پر رشک کرتے تھے، جو روسیوں کے خلاف لڑنے والے افغانوں کو غدار کہتے تھے، جو افغان، بختونوں کو رانکھلوں کے بنوں سے مارتے تھے، جو پوری افغان وار کے دوران "کارمل ولی بھائی بھائی" کے نعرے لگاتے رہے، جو روسی فوج کو پاکستان پر حملے کے لیے اکساتے رہے اور جو آج بھی کہتے ہیں، ہم پنجاب کے ذریعے پاکستان تڑوائیں گے، تو ایسا تو ہوگا!

جی ہاں، جب آپ کلزی کی حفاظت کی ذمہ داری آگ کو سوئپ دیں گے، جب آپ سانپوں کو استھیں کی گرماش دیں گے، جب آپ کاغذ کے دستانوں سے سٹگتے کو سٹکے اٹھانے کی کوشش کریں گے، جب آپ کانچ بکے فرش پر ہاتھی کا رقص دیکھنے کی خواہش کریں گے، تو ایسا تو ہوگا! Kashii
جی ہاں، چھریوں سے دوستی کرنے والے غریبوں سے اسی طرح کہتے ہیں، موسم کے موڑے پہن کر گھروں سے نکلنے والے لوگ اسی طرح تلوے جلا بیٹھتے ہیں اور پانی پر چلنے کے خواہش مند اسی طرح ڈوبتے ہیں۔
ہاں، ہاں یہ لوگ بھی کہتے بے وقوف ہیں، جنہوں نے بین توڑ دی اور سانپوں کو گلے میں ڈال لیا۔

(نوٹ: اس کالم کے تمام حقائق ولی خان کی کتاب "حقائق حقائق ہیں۔" باچا خان کی پرانی تقریروں اور اسے این پی کے رہنماؤں کے بیانات سے اخذ کیے گئے اور یہ کالم ۹۸ء میں اسے این پی کی مسلم لیگ سے علیحدگی پر لکھا گیا۔)



مونٹی

گلی میں کوئی کتا بھونکتا ہے، اندھیرے میں کسی بلی کی آنکھیں چمکتی ہیں یا کوئی پرندہ رزق کی تلاش میں مندر پر آجینستا ہے تو مجھے کیتھی یاد آ جاتی ہے، نیلی آنکھوں، بھورے بالوں اور سرخ رنگت والی "چھٹی" کیتھی جس کا بچپن نیو یارک کی افراتفری اور جوانی آسٹریلیا کے شیم گرم ساحلوں پر گزاری لیکن جب جذبات کا "کاروان یوسف" جسم کے کنعان سے نکل گیا تو وہ اپنے سدا کے ست، کامل اور بیزار خاوند کے ساتھ اسلام آباد آ گئی جہاں شام کو اپنے رچھڑا نما جرمی کتے، برازیلی بلی اور آسٹریلین طوطے کو شبلانا اس کی ذمہ داری ہو گئی جس سے وہ مسلسل پانچ برس تک عہدہ برآ ہوتی رہی۔ شاید اب بھی اس کا یہی معمول ہو لیکن میں اس کے بارے میں پورے وثوق سے پیشین گوئی نہیں کر سکتا کیونکہ کیتھی کو اسلام آباد چھوڑے چھ دن ہو چکے ہیں۔

کیتھی سے میری ملاقات ایک "ڈنگر ڈاکٹر" دوست کے کلیک پر ہوئی، میرا یہ دوست بھی کم دلچسپ انسان نہیں، اس نے ویٹری ڈاکٹر کا کورس کیا، سرکاری نوکری کی، سکلر شپ لیا، امریکہ گیا وہاں سے پالتو جانوروں کے مزمن امراض میں سپیشلائزیشن کی، امریکیوں سے تھوڑی بہت عقل مت لی، پاکستان آیا اور سرکاری نوکری سے استعفیٰ دے کر یہاں اسلام آباد میں پالتو جانوروں کی ایک علاج گاہ بنالی، جہاں صبح سے شام تک غیر ملکی خواتین و حضرات اور ان کے کتوں، بلیوں کا تانتا بندھتا رہتا ہے اور میرا دوست پاکستان میں رہتے ہوئے دونوں ہاتھوں سے خوب ڈالر سمیٹتا ہے۔ اسے یہ کلیک کھولے بمشکل دو برس ہی ہوئے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل اور گوروں کے کتوں کی مہربانی سے وہ آج حاملہ بلیوں کے لیے میٹرنی، پلوں کے لیے ایمرجنسی، زکام، کھانسی اور بال جھڑ جیسے مہلک امراض کے شکار کتوں کے لیے ان ڈور اور ڈور احتمول فیملیکیوں کے نازک اندام جانوروں کے لیے وی وی وی آئی دم بنانے کے قابل ہو چکا ہے۔ انشاء اللہ وہ آنے والی مردیوں میں اس منصوبے پر عملدرآمد شروع کر دے گا۔ ہاں تو میں عرض کر رہا تھا کیتھی سے میری پہلی ملاقات اس "ڈنگر ڈاکٹر" دوست کے کلیک پر ہوئی، کیتھی اپنا جرمن کتا دکھانے آئی تھی اس کا خیال تھا کتا بال جھڑ جیسے مہلک مرض کا شکار ہے کیونکہ وہ جب بھی اسے برش کرتی ہے کتے کے بیسیوں بال برش میں پھنس جاتے ہیں، ڈاکٹر نے مشورہ دیا "آپ شیمپو استعمال کر کے دیکھیں۔" کیتھی نے آنکھوں میں آنسو بھر کر جواب دیا "سارے

شیپو استعمال کر چکی ہوں لیکن کوئی افادہ نہیں ہوا۔ ڈاکٹر نے پوچھا "آپ نے انڈوں کی زردی کا تیل لگایا۔" کیتھی ہتھیلی کی پشت سے آنکھیں رگڑ کر بولی "ہاں یہ جتن بھی کر دیکھا لیکن مونئی (کتے کا نام) ٹھیک نہیں ہوا۔"

"آپ نے بالوں کا لیبارٹری ٹیسٹ کرایا؟" ڈاکٹر نے کتے کو گدگدا کر پوچھا جو گڑبھری زبان لکائے ہم "ان کلچر ڈبلیک پیپل" کو حقارت سے دیکھ رہا تھا۔ "ہاں، ہاں میں نے بالوں کے نمونے امریکہ بھجوائے تھے، ان حرامیوں نے ٹیکو رپورٹ دے دی۔" کیتھی نے سگلتے لہجے میں جواب دیا۔ "پھر تو کتنا ٹھیک ہی ہوگا، آپ خواہ مخواہ پریشان ہیں۔" میرے دوست نے چہرے پر کاروباری مسکراہٹ سجا کر کہا، کیتھی کو فوراً غصہ آ گیا اس نے کتے کی زنجیر کو جھٹکا دیا، نفرت سے ڈاکٹر کو گھورا اور چلا کر بولی "بے وقوف شخص مونئی تندرست کیسے ہو سکتا ہے میں نے صبح ہی بال گنے تھے برش سے پورے حیرہ بال نکلے، خدا کی پناہ مونئی کے بال اس طرح گرتے رہے تو یہ تو ایک ہی مہینے میں کو جگہ بن جائے گا۔" ڈاکٹر نے فوراً معذرت کی اور لیپ جلا کر مونئی پر جھک گیا۔

اس کے بعد میں جب بھی "ڈنگر ڈاکٹر" کے کلینک گیا کیتھی کو مونئی سمیت وہیں پایا، کبھی وہ مونئی کو پیٹنے پر بٹھائے، اس کے بالوں میں زیتون کا تیل لگا رہی ہوتی، کبھی اسے آٹلوں کے عرق سے نہلا رہی ہوتی اور کبھی صندل کی کنگھی سے اس کے بال سنوار رہی ہوتی، کبھی بارہ کے آسنے سانسے سے ہم ایک دوسرے سے شناسا ہو گئے چنانچہ ڈیڑھ دو ماہ بعد جب بات بیلو ہائے سے مونئی کی عبادت تک پہنچی تو وہ مجھے ہر ملاقات پر کتے کی بہتر ہوتی صحت کا سرحدہ سناٹی، صندل کی خوبصورت خوشبودار ڈبیا سے بال نکالتی اور خعر سے دکھا کر کہتی "دیکھیے آج صرف پانچ بال گرے ہیں، مونئی اب صحت مند ہو رہا ہے، ایک آدھ ماہ کی مزید مالش سے بال گرنے بند ہو جائیں گے۔" میں ایک سمجھدار اور بااخلاق شخص کی طرح کتے کی صحت اور کیتھی کی محنت کی داد دیتا جس پر وہ مکمل اطمینان، چھوٹے بچوں کی طرح اچھل اچھل کر تالیاں جیتی اور میرے حسن ذوق اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کو خوب سراہتی، اس بے تکلفی میں ایک روز انکشاف ہوا صرف مونئی ہی کیتھی کا ڈارلنگ نہیں، اس کے گھر میں ایک بلی اور ایک آسٹریلین طوطا بھی ہے، میں نے پوچھا "آپ انہیں ساتھ کیوں نہیں لاتیں؟" کبھی لہجے میں بولی "بلی حاملہ ہے اس حالت میں اسے اتنا لمبا سفر کرانا زیادتی ہے، رہا طوطا تو اسے پولن الرمی ہو جاتی ہے یہاں اس شہر میں شہرت بھی تو بہت ہیں آپ لوگ ان کا صفایا کیوں نہیں کرتے، کیا آپ لوگوں کے طوطے چار نہیں ہوتے؟" میں نے فوراً جواب دیا۔ "نہیں ہمارے طوطے اس کے عادی ہو چکے ہیں۔" اس نے حیرت سے میری طرف دیکھا لیکن اس سے قبل کہ وہ مزید کچھ کہتی مونئی کو اس کا یوں غیر محرم سے بے تکلف ہونا اچھا نہ لگا لہذا اس نے فرا کر اسے اپنی طرف متوجہ کر لیا۔

واشنگٹن روانگی سے ایک روز قبل مارگلہ روڈ پر اچانک کیتھی سے ملاقات ہو گئی، وہ مونئی کو نہلا رہی تھی، میں نے احوال پوچھا تو وہ اسامہ بن لادن کو گالیاں دینے لگی، میں نے حیرت سے وجہ پوچھی تو غصے سے بولی "اس کی وجہ سے ہمیں یہاں سے جانا پڑ رہا ہے مونئی کا علاج بھی مکمل نہیں ہوا، راستے میں اسے کچھ ہو گیا تو یہی

از اے....." کیا موتی بھی آپ کے ساتھ جائے گا؟" میں نے موضوع بدلنے کے لیے پوچھا لیکن میرے یہ الفاظ ماچس کی ڈبیہ پر تیلی کی رگڑ ثابت ہوئے "تو، تو تمہارا خیال ہے میں موتی، مالی (بلی کا نام) اور جی (طوطے کا نام) کو اس وحشی کے رحم و کرم پر چھوڑ جاؤں گی کہ وہ آئے اور آکر انہیں سلاٹر کر دے۔ شوٹ کر دے، وحشی تو م کا وحشی انسان، ہی از اے....." اس روز کیتھی کے اندر بارود بھرا تھا وہ بات پر آتش فشاں کی طرح پھٹتی اور لاوے کی طرح بہتی تھی لہذا میں نے سلام کر کے کھسکنے ہی میں عافیت جانی۔

اگلے روز کیتھی اپنے دوسرے ہم وطنوں کے ساتھ ڈی سی ۱۰ جہاز میں سوار ہو کر امریکہ چلی گئی، مجھے یقین ہے اس کا موتی مالی اور جی بھی ان پچاس پالتو جانوروں میں شامل ہوں گے جنہیں حفاظت کے نکتہ نظر سے امریکی سفارتکار ساتھ لے گئے۔ مجھے یہ بھی یقین ہے وہ بھی دوسرے لاکھوں امریکی جانوروں کی طرح افغانستان اور اسامہ سے ہزاروں میل دور محفوظ ہاتھوں میں ہوں گے لیکن کل، نہیں، کل نہیں تین دن پہلے جب خوست سے چند جلی کئی اور صرخ نشیں پاکستان پہنچیں اور میں نے ایک ایسا سانس لیتا مردہ دیکھا جس کے جسم پر ایلے اگے تھے تو کیتھی کا موتی میرے سامنے کھڑا ہو گیا میں نے اس سے ان لوگوں کا جرم پوچھا تو اس نے قہقہہ لگا کر کہا "کیا یہ جرم کافی نہیں یہ انسان ہیں کتے نہیں، یہ مسلمان ہیں موتی نہیں۔"

Kashif Azad @ OneUrdu.com

وہاں کوئی غم نہیں تھا

پچھلے برس اسی موسم میں سان فرانسسکو میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے پورے امریکی معاشرے کو ہلا کر رکھ دیا، لوگ گھروں کے باہر آ گئے، انتظامیہ چیخ اٹھی اور قانون و انصاف کے ادارے تلافی کے لیے دوڑ پڑے، واقعہ بہت ہی دلچسپ تھا، ایک گھر میں تین "افراد" رہتے تھے، ۳۲ سالہ بل، اس کا آٹھ برس کا بیٹا جم اور ان دونوں کا مشترکہ کتا تم، ایک اتوار کو بل اور جم (کتا) کرکٹ کھیل رہے تھے، بل شارٹ لگاتا، تم بھاگتا ہوا جاتا اور بال منہ میں اٹھا کر لے آتا، بل اسے پھر ٹھوکر مارتا اور تم گیند کے پیچھے بھاگ کھڑا ہوتا، کھیل ہی کھیل میں کسی بات پر تم ناراض ہو گیا، اس کی حیوانی خصلت بیدار ہو گئی، اس نے بال کے پیچھے بھاگنے سے انکار کر دیا اور لان میں ایک طرف بیٹھ کر غرا نے لگا، اسی اثنا میں خاصا تم گھر میں داخل ہوا اور حسب معمول کہتے کو "کس" کرنے کے لیے اس کی طرف بھاگا، تم بری طرح جڑا بیٹھا تھا، جوں ہی جم تم کے قریب پہنچا، کتے نے چھلانگ لگا کر اپنے تیز ٹکیلے دانت جم کے گال پر گاڑ دیئے، بچے نے دلدوز چیخ ماری، بل بلا لے کر فوراً اس کی طرف دوڑا لیکن اس کے پہنچنے تک تم جم کا ایک گال چبا چکا تھا، بل آخر باپ تھا، بیٹے کا زخم برداشت نہ کر سکا، ایک ہی لمحے میں اس کی پدرانہ محبت کتے کی انسیت پر غالب آ گئی، اس نے اشتعال میں بلا ہوا میں لہرایا اور تم کے سر پر دے مارا، کتے کے منہ سے عف کی آواز نکلی، وہ فرش پر گرنا، اس نے ٹانگیں پھیلائیں، چند تیز، تیز سانس لیں اور جان دے دی۔

بل کا ہمسایہ باز کے پیچھے سے یہ منظر دیکھ رہا تھا، اس نے فوراً مجاز اتھارٹیز کو فون کیا، ابھی بل بیٹے کے زخم ہی دھور رہا تھا، پولیس موقع واردات پر پہنچ گئی، جانے تو وہ کی تصاویر لیں، آلہ قتل برآمد کیا، مجرم کے منکر پرشس لیے، دفنی بچے کو ہسپتال داخل کرایا اور بل کو گرفتار کر کے جیل بھجوا دیا، اگلے روز جب یہ واقعہ اخبارات میں شائع ہوا تو پورا امریکی معاشرہ سراپا احتجاج بن گیا، جانوروں کے حقوق کی تحفیسوں نے جلوس نکالے، عوام نے قافل کو پھانسی جڑھانے کا مطالبہ کیا جبکہ اخبارات نے اس ظلم پر ادارے لکھے، آنے والے دنوں میں یہ احتجاج اتنی بڑی تحریک بن گیا کہ امریکی انتظامیہ سارے کام چھوڑ کر "بل تم کیس" خنٹانے میں مصروف ہو گئی، عدالت میں بل اور تم کے دکھانے دلائل کے انبار لگا دیئے، بل کا ذہنی معائنہ کرایا گیا، انسانی جذبات اور

اشتعال کے ماہرین سے رائے لی گئی، گواہوں کے طویل بیانات ریکارڈ ہوئے جس کے بعد جیوری نے مل کو نفسیاتی مریش قرار دے کر معاف کر دیا تاہم اسے باقی زندگی کتوں کے حقوق کے لیے وقف کرنے کی ہدایت کر دی گئی۔

اس سارے کیس کا سب سے خوبصورت پہلو کیلیفورنیا کے ایک اخبار کا وہ سروے تھا جس میں نیٹ کے چار لاکھ شہریوں نے حصہ لیا، اخبار کے مطابق سروے میں شریک ۳ لاکھ ۱۶ ہزار ۱۳ افراد کا کہنا تھا، وہ اس سانحے کے بعد بے خوابی کا شکار ہو چکے ہیں کیونکہ وہ جو نئی آنکھیں بند کرتے ہیں، ان کے تخیل میں ٹم آجاتا ہے اور اس کی یاسیت سے بھری آنکھیں ان سے سوال کرتی ہیں، میرا جرم تو اتنا خوفناک نہیں تھا، مجھے کیوں مارا گیا، کیا اس ملک میں جانوروں کے لیے لڑنے والا کوئی شخص نہیں بچا؟

جب امریکہ میں مل ٹم کیس چل رہا تھا تو میں نے سان فرانسسکو میں مقیم اپنے ایک دوست سے اس کی تفصیلات منگوائیں، اس نے مہربانی کرتے ہوئے مجھے نہ صرف متحول ٹم کی تصاویر بھجوا دیں بلکہ ان دلائل کی کاپیاں بھی ارسال کر دیں جو ٹم کے وکیل نے مل کو قاتل ثابت کرنے کے لیے عدالت میں دیے تھے، میں یہ سارا مواد اپنی کتابوں کی الماری میں رکھ کر بھول گیا، آج صبح میں نے سال بعد عراق پر امریکی حملوں کے بارے میں کسی رپورٹ کی تلاش میں الماری کھولی تو آنجمانی ٹم کی تصویر پھسل کر میرے قدموں میں آگری، میں نے اٹھا کر دیکھا وہ اسی ایک سال بعد بھی ٹم کی ٹیم وا آنکھوں میں سینکڑوں سوال تھے، اس کی وحشی ہوئی گردن آج بھی انسانیت کے اجتماعی ضمیر پر ضرب لگا رہی تھی، اس کے حلق سے نپکتا لہو آج بھی درد دل رکھنے والوں کے لیے تازیانے کا کام کر رہا تھا، میرے ہونٹوں سے آنجمانی ٹم کے لیے ایک آہ سی نکلی لیکن اس سے قبل کہ یہ آہ ہوا میں تحلیل ہو جاتی ایک خیال برقی رو کی طرح آیا اور میرے ذہن کا سرکٹ ہلا کر چلا گیا، مجھے یاد آیا اسی الماری میں متحول عراقیوں کی ایسی سینکڑوں تصاویر پڑی ہیں جن کی رگوں سے امریکی بارود نے زندگی اس طرح اڑا دی تھی جس طرح گرم الاؤ پانی کو بھاپ بنا دیتا ہے، ان کتابوں، بوسیدہ رسالوں اور پھٹی پرانی ادھوری رپورٹوں سے عراقی بچوں کی ایسی درجنوں تصویریں دلی ہیں جنہیں گزشتہ آٹھ برسوں میں کھانے کے لیے مناسب خوراک اور چھینیں ضبط کرنے والی درویش ادویات نہیں ملیں، اسی الماری میں کانڈوں کے نیچے عراق کی ایسی خواتین کی بیسیوں تصویریں دفن ہیں جن کے کٹے پٹے اعضاء جن کے جملے بچے جسم اور جن کے چہرے چلاتے زخموں میں سینکڑوں سوال ہیں، جن کی وحشی گردنیں اجتماعی ضمیر پر ضرب لگاتی ہیں، جن کا نپکتا ہوا لہو تازیانے ہے لیکن ۵۲ امریکی ریاستوں میں ایک بھی ایسی تنظیم نہیں، ایک بھی ایسا اخبار نہیں، انسانوں کا ایک بھی ایسا گروہ نہیں جو ان کے لیے پلے کارڈ اٹھا سکے، جو ان کے لیے نعرے لگا سکے، جو ان کے لیے انصاف طلب کر سکے جو ان کے بل کا مواخذہ کر سکے۔

میں نے ٹم کی ٹیم وا آنکھوں سے پوچھا۔ "یار ٹم ۲۸ گھنٹوں میں عراق پر ۲۰۰ حملے ہوئے لی دن

طیاروں سے بغداد کے گھروں اور ہسپتالوں پر دو ہزار بم گرائے گئے، برطانوی جہازوں نے مظلوم، کمزور اور
 تہتہ شہریوں پر ۵ سو کروڑ میزائل پھینکے، سینکڑوں لوگ مر گئے، سینکڑوں ہی زخمی ہوئے لیکن سان فرانسسکو سے
 نیویارک تک اور واشنگٹن سے لاس اینجلس تک کسی بھی شخص نے احتجاج نہیں کیا، کسی نے شیم شیم کے نعرے
 نہیں لگائے، کیوں، آخر کیوں؟ "ٹم نے پبلیکس اٹھائیں، اس کی مردہ پتلیوں میں روشنی کوندی، اس کی ڈھلکی
 گردن میں حرکت پیدا ہوئی، اس نے اپنے بچے سیدھے کیے اور ایک قہقہہ لگا کر بولا "اس لیے میرے
 دوست کہ عراق میں اب تک صرف انسان مرے ہیں کوئی ٹم نہیں مرآ وہاں اب تک مسلمان مارے گئے ہیں
 کوئی کتا ہلاک نہیں ہوا۔"



Kashif Azad @ OneUrdu.com

کینگر و پھر جنگلے سے باہر تھا

آسٹریلیا کے کسی چڑیا گھر میں کینگر و کا ایک جوڑا رہتا تھا، ایک رات ان میں سے ایک کینگر و کسی خفیہ راستے سے ہوتا ہوا جنگلے سے باہر آ گیا، انتظامیہ کو خبر ہوئی تو وہ معائنے کے لیے موقع واردات پر پہنچ گئی، جنگلے کے دروازے، کنڈی اور تالے کا جائزہ لیا گیا، تینوں صحیح سلامت تھے، جنگلے کی جالی میں بھی کوئی سوراخ نہیں تھا، سب سر جوڑ کر بیٹھ گئے طویل غور و خوض اور لمبی بحث و محصل کے بعد جیوری اس نتیجے پر پہنچی کہ کینگر و جنگلے کی دیوار پر پھاند کر باہر نکلا ہے لہذا فوری طور پر جالی کی اونچائی بڑھا دی جائے، اسی وقت مسٹری بلائے گئے جنہوں نے چند ہی گھنٹوں میں جالی دو فٹ اونچی کر دی، اگلے روز منتظمین چڑیا گھر پہنچے تو انہوں نے دیکھا کینگر و نہ صرف جنگلے سے باہر نکل چکا ہے بلکہ بیچ پر بیٹھ کر دھوپ سینک رہا ہے، انتظامیہ نے جالی مزید دو فٹ اونچی کر دی لیکن اس اقدام کے بعد کینگر و گیت کپیر کے کمرے میں کرسی پر بیٹھ کر پائپ پیتا پایا گیا، اس روز بھی جالی میں دو فٹ اضافہ کر دیا گیا، اگلے روز انتظامیہ آئی تو کینگر و فیجر کے دفتر کے سامنے اخبار کھول کر بیٹھا تھا اب کینگر و اور انتظامیہ میں ٹھن گئی، وہ روز جالی کی اونچائی میں اضافہ کرتے لیکن وہ اگلے روز کوڈر باہر آ جاتا یہ سلسلہ اتنا بڑھا کہ ایک روز انتظامیہ تھک گئی اور دیوار نے بھی مزید اونچا ہونے سے انکار کر دیا، اس وقت کسی نے مشورہ دیا "آپ لوگ کینگر و ہی سے کیوں نہیں پوچھ لیتے" جناب آپ کو کیا تکلیف ہے آپ روز باہر کیوں تشریف لے آتے ہیں۔" آئیڈیا شاندار تھا، منتظمین فوراً کینگر و کے حضور حاضر ہو گئے۔ کینگر و نے غور سے ان کی بات سنی اور پھر قہقہہ لگا کر بولا "حضرات معاف کیجیے گا آپ بھی بڑے ہی چفد ہیں آپ دیوار تو اونچی کر دیتے تھے لیکن جنگلے کا دروازہ کھلا چھوڑ جاتے تھے اور اگر دروازہ کھلا ہو تو بے وقوف سے بے وقوف کینگر و کو بھی دنیا کی کوئی طاقت باہر آنے سے نہیں روک سکتی۔"

پچھلے بائیس ماہ کے نزدیک ریکارڈ سے مجھے تو یہی محسوس ہوتا ہے ہماری حکومت سے بھی منصوبہ بندی کے دوران کوئی نہ کوئی دروازہ کھلا رہ جاتا ہے جس کے نتیجے میں جنگلہ خواہ گولڈن جینڈھیک کا ہو یا ملٹری کورس کا ہر بار کینگر و بیچ پر دھوپ سینکتا دکھائی دیتا ہے، ٹائم پر ٹائم چڑھا کر پائپ پیتا ہوا ملتا ہے یا پھر اخبار کھول کر جناب جمیل الدین عالی کے کالم کے مطالعے میں مستغرق پایا جاتا ہے۔ آپ میرے دعویٰ پر نہ جائیں حالات کا

خود جائزہ لیں، حکومت نے گولڈ پنڈ ٹیک سکیم کا اعلان کیا جب لاکھوں سرکاری ملازمین نے درخواستیں داغ دیں تو پتہ چلا ملازمین کو یک مشت ادائیگی کے لیے ۳۵ ارب روپے چاہئیں جبکہ حکومت کے پاس اس میں صرف ایک ارب روپے ہیں لہذا اگلے ہی روز کینٹرو جنگل سے باہر تھا، حکومت نے احتسابی عمل کا ڈول ڈالا جناب سیف الرحمن نے دن رات لگا کر، کروڑوں روپے خرچ کر کے سوشل ریلینڈ سے بے نظیر کے خفیہ اکاؤنٹس کی منتقلی حاصل کیں جب وہ یہ چونی سر کر چکے تو پتہ چلا پاکستانی عدالتیں تو فوٹو سٹیٹ کا پیوں کو ثبوت ہی تسلیم نہیں کرتیں لہذا اگلے ہی روز کینٹرو جنگل سے باہر تھا۔ وزیراعظم نے ٹی وی پر پوری دنیا کو مخاطب کر کے کالا باغ ڈیم بنانے کا اعلان کر دیا جب فائل حرکت میں آئی اور کام عملی سطح پر شروع ہوا تو پتہ چلا جہاں ڈیم بننا ہے وہاں کے لوگ راضی ہیں اور نہ ہی اس پراجیکٹ کے لیے خزانے میں رقم ہے لہذا اگلے ہی روز کینٹرو جنگل سے باہر تھا، وزیراعظم نے خلفائے راشدین کی یاد تازہ کرنے کے لیے پرائم منسٹر سیکرٹریٹ خالی کر دیا جب سارا سازو سامان منتقل ہو چکا تو پتہ چلا ایک ارب ۷۰ کروڑ سے بننے والی اس عمارت کا تو کوئی خریدار ہی نہیں لہذا اگلے ہی روز یہ کینٹرو بھی جنگل سے باہر تھا، حکومت نے ملک کو دیوالیہ ہونے سے بچانے کے لیے بیرون ملک آباد پاکستانیوں سے امداد کی اپیل کی جب تشہیر پر کروڑوں روپے صرف ہو چکے تو پتہ چلا اس کے لیے تو بیرون ملک اکاؤنٹس ہی نہیں کھولے گئے لہذا اگلے ہی روز یہ کینٹرو بھی جنگل سے باہر تھا، نادہندگان کے خلاف کارروائی کا اعلان ہوا، بینکوں نے ایک کروڑ روپے خرچ کر کے فہرستیں تیار کیں جب ۶۳۳۷ ڈیٹا لٹریچر کی لسٹیں بن گئیں تو پتہ چلا قانون میں تو نادہندگان کی گرفتاری کے لیے کوئی قطعی شق ہی نہیں لہذا اگلے ہی روز یہ کینٹرو بھی جنگل سے باہر تھا، حکومت نے نفاذ شریعت کا اعلان کر کے پوری دنیا میں تحریکیں مچادی جب مل تیار ہو گیا، قومی اسمبلی نے اس کی منظوری دے دی تو پتہ چلا حکومت کے پاس تو سینٹ میں مطلوبہ ووٹ ہی نہیں لہذا اگلے ہی روز یہ کینٹرو بھی جنگل سے باہر تھا اور اب آخر میں حکومت کے ”کمانڈنٹ“ کرنل مشتاق طاہر خیل کے شاندار آئیڈیاز اور جناب خالد انور (وزیر قانون) کی شاندار انگریزی کے اتصال سے کراچی میں ملٹری کورس تشکیل پائیں اور ان عدالتوں نے دو بھروسوں کو پھانسی پر بھی چڑھا دیا تو پتہ چلا حکومت تو آئین کی دفعہ ۲۳۵ کے تحت ملٹری کورس بنا ہی نہیں سکتی لہذا یہ کینٹرو بھی اب دوسرے کینٹروؤں کی طرح جنگل سے باہر بیٹھ کر دھوپ سینک رہا ہے۔

میرا خیال ہے اگر کبھی چلتے چلتے سربراہ میری ملاقات حکومت کے ان کینٹروؤں سے ہو جائے اور میں ہمت کر کے ان سے جنگل میں نہ نکلنے کی وجوہات پوچھ جنھوں تو میرا اندازہ ہے ان کا جواب آسٹریلیا کے اس شریر کینٹرو سے مختلف نہیں ہوگا، یہ بھی یقیناً فرمائیں گے ”یہ لوگ دیوار تو اونچی کر دیتے ہیں لیکن جنگل کا دروازہ کھلا چھوڑ جاتے ہیں۔“ تو میرے پاس کیا جواب ہوگا، کیا میرے اندر اتنی ہمت ہوگی کہ میں اسے مخاطب کر کے کہہ سکوں ”یار کینٹرو، جن لوگوں کے فیصلے ان کی عقل نہیں ان کی جلد بازی کیا کرتی ہے، ان کے جنگلوں کے دروازے اسی طرح کھلے رہتے ہیں اور ان کی بد قسمتی کے کینٹرو اسی طرح محن میں مزمزمشت کرتے رہتے ہیں۔“

علاج

جب سر کا درد ناقابلِ برداشت ہو گیا، بیٹائی کمزور ہو گئی، کانوں میں زین کی آواز سنائی دینے لگی اور سانس دھکنی کی طرح چلنے لگا تو بچے باباجی کو ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ ڈاکٹر نے سر بیض کا معائنہ کیا، انکسریے کرائے، سی ٹی سکین کرائی، ای سی جی اور سونو گرافی کرائی اور پھر ساری رپورٹیں ملاحظہ کر کے نہایت دھکی انداز میں کہا: ”باباجی کے سر میں ٹیور ہے، اگر فوراً آپریشن ہو جائے تو ان کے بچنے کا دس فیصد امکان ہو سکتا ہے، بصورت دیگر ہر گزرنے والا دن انہیں موت کی طرف لے جائے گا۔“ بچوں نے فوراً باباجی کو اٹھایا اور ہومیوپیتھی ڈاکٹر کے پاس لے گئے۔ اس نے بھی انکسریے کرائے، سی ٹی سکین کرائی، ای سی جی اور سونو گرافی کرائی، ساری علائقیں ٹیکس اور پھر پراحتا دھجے میں بولا: ”میرا خیال ہے ہم اس ٹیور کو دواؤں سے غائب کر سکتے ہیں، آپ جرمی سے یہ دوائیں متکوالیں۔“ بچوں نے باباجی کو پھر اٹھایا اور ”تیبلے حکیم“ کے پاس لے گئے۔ حکیم نے سر بیض کی ہنٹ پکڑی، پتلیاں اٹھا کر آنکھیں دیکھیں، علائقیں سنیں اور پھر اپنی کمزور ”تیبلے“ جیسی گردن ہلا کر بولا: ”میرا خیال ہے باباجی کو قبض ہے، اگر یہ دفع ہو جائے تو سارے مرض دور ہو جائیں گے۔ اگر اجازت دیں تو جمال گھونڈے دوں۔“

بچوں نے باباجی کو پھر اٹھایا اور سنیاسی کے پاس لے گئے۔ سنیاسی نے سر بیض کی جلد کا رنگ دیکھا، منہ کھلوا کر ملاحظہ کیا، انگلی سے ریزہ کی ہڈی پر دستک دی اور پھر بقراطی لہجے میں بولا: ”جناب عالی اگر یہ جو تک لگوا لیں تو سارا مسئلہ ختم ہو جائے گا۔“ بچوں نے باباجی کو پھر اٹھایا اور گھر چل پڑے، جہاں انہیں دعاؤں کے سہارے چھوڑ دیا، رات کو اچانک باباجی نے چیخ ماری اور اچھل کر ناچنا شروع کر دیا۔ سارے گھر میں ہنگامہ مچ گئی، سب اپنے اپنے لفافے چھوڑ کر باباجی کے گرد جمع ہو گئے۔ باباجی نے تالی بجاتی اور خوشی سے اعلان کیا ”میرے سر کا درد ختم ہو چکا ہے، اب نظر بھی صاف آتا ہے اور سنائی ٹھیک دے رہا ہے، سانس بھی ہموار اور رواں ہے، میں بالکل صحت مند ہوں۔“ بچوں نے حیرت سے باباجی سے پوچھا: ”لیکن کیسے؟“ باباجی ہنس کر کہنے لگے ”میں نے لیٹے لیٹے اپنے کالر پر اپنا ہاتھ پھیرا تو وہ مجھے ذرا تنگ سا محسوس ہوا۔ بس میں نے کالر کا جن کھول دیا اور سکھی ہو گیا۔ میرا خیال ہے آئندہ مجھے پندرہ کے بجائے سولہ سائز کا کالر پہننا چاہیے۔“

ہماری یوزمی اقتصادیات کا سر بھی بچھلے کئی برسوں سے دکھ رہا ہے، بینائی اتنی کمزور ہو چکی ہے کہ اب سامنے پڑی چیزیں تک نظر نہیں آتیں، آنے والے خطرات کا شور اتنا بڑھ چکا ہے کہ اب بانسری کی آواز بھی ٹرین کی چٹک چٹک محسوس ہوتی ہے، رہا سانس تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے اب گیا تو کبھی واپس لوٹ کر نہیں آئے گا، لہذا ”باباجی“ کی اس خراب صورتحال کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے بعض جلد باز بچے گورن کو قبر کھودنے کا آرڈر دے چکے ہیں، کفن خرید لیا گیا ہے اور ویکسین منگوا کر محسن میں رکھ لی گئی ہیں، جبکہ آخری وقت تک ناامید نہ ہونے والے بعض بچے باباجی کو اٹھائے پھر رہے ہیں، کبھی اس سرجن کے پاس، کبھی اس سپیشلسٹ کے کلینک پر، کبھی اس مہنگے ہومیوپیتھی ڈاکٹر کی دکان پر، کبھی اس ”تیلے حکیم“ کے مطب پر، کبھی اس سنیا سی کے اوے پر اور کبھی اس سیانے کے پاس، لیکن سب ڈاکٹر، حکیم اپنی اپنی تشفی کر رہے ہیں، کوئی آپریشن کا مشورہ دے رہا ہے، کوئی مہنگی دوائیں کھلانے، کوئی جمال کھونڈ دینے اور کوئی جو تک لگوانے کا مشورہ دے دیا ہے۔

جی ہاں، اس یوزمی اقتصادیات کے ہاتھوں ساری مستعین زمینیں ہوس ہو چکی ہیں، خزانہ خالی ہو چکا ہے، ملازمین کی تنخواہوں کے لیے پیسہ نہیں رہا، ملک کے ۹۰ فیصد ترقیاتی کام بند ہو چکے ہیں۔ واپڈا سے ٹائم بم کی تک تک نشر ہو رہی ہے، ٹی وی کا خسارہ بڑھتا جا رہا ہے، ریلوے سفید ہاتھی کی طرح پوری معیشت کو روندنا ہوا کمزور رہا ہے، منجمد تاید ہو چکی ہے، کپاس کی فصل تباہ ہو چکی ہے، شاک ابھی بچھ بچھ چکی ہے، روپیہ آخری سانس لے رہا ہے، ریونیو کا گراف تیزی سے گر رہا ہے، لوگ اپنی سکت سے زیادہ ٹیکس دینے سے انکار کر چکے ہیں اور پیسہ حکومتی گرفت سے نکل کر چند ہاتھوں میں جمع ہو رہا ہے حکومت مریض کو بچانے کے لیے کبھی ۱۸ لاکھ روپے ماہانہ پر معین الدین پکڑ لاتی ہے، کبھی ۱۶ لاکھ والے زیر سومر، شوکت ترین اور کبھی عالمی مارکیٹ سے ۱۲ لاکھ روپے ماہانہ تنخواہ پر ۸ سفید ہاتھی خرید لاتی ہے۔ یہ سب لوگ آتے ہیں، انیسرے کراتے ہیں، سی ٹی ٹی ٹی، ای سی جی اور سو ڈو گرافی کراتے ہیں، رپورٹیں پڑھتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں، اپنی فیس لیتے ہیں اور ”اب مریض کو دوا کی نہیں دعا کی ضرورت ہے۔“ کا مشورہ دے کر چلتے بٹتے ہیں۔

جی ہاں، محترم قارئین، ان آخری لمحوں میں جب قبر تیار ہے، سفید دو دھیا لٹھے کا کفن کمرے میں دھرا ہے، مشک بو، لوہان اور گلاب کی چٹیاں آیا ہی چاہتی ہیں، ”مولوی“ شام کی تیاری کر رہا ہے اور محسن میں ناکی دیکھیں ”کھڑکا“ رہا ہے، باباجی کو ہمت سے کام لے کر اپنے کار کا بنٹن خود ہی کھولنا ہو گا کہ معین الدین، شوکت ترین اور زیر سومر وادان جیسے ڈیڑھ درجن دوسرے مہنگے ڈاکٹر، حکیم اور سنیا سی ان کے سر درو، بینائی، سماعت اور سانس کا علاج نہیں کر سکتے۔

ہاں محترم قارئین، باغیرت قوموں کو زندہ رہنے کے لیے اپنے اپنے کار خود ہی کھولنے پڑتے ہیں کیونکہ غیر تو صرف آپریشن کیا کرتے ہیں، کمزوری کیسی گولیاں کھلایا کرتے ہیں، جمال کھونڈ دیا کرتے ہیں اور جو کھیں لگایا کرتے ہیں۔

”چی چی ٹھک“

فردوس عالم ہمارے بزرگ دوست ہیں، سی ایس پی آفیسر ہیں، سات برس تک ایوان صدر میں اقتدار کی مونچھ کا بال رہے، تین چار برس زکوٰۃ و عشر کے ذمہ دار افسر رہے۔ اس سے پہلے متعدد حساس پوزیشنوں پر عمر عزیز کا طویل حصہ بے دریغ خرچ کیا، دماغ میں ادب کا کیرا بھی ہے، جس نے چند برسوں میں ریشم کے جتنے نوٹے بنے وہ ”ہوائیاں“ کے نام سے منصفہ شہود پر ظہور پذیر ہو چکے ہیں، لیکن ان کی اصل وجہ شہرت ان کی ”بزرگی“ ہے افسر شاہی اور نہ ہی ”ہوائیاں“ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کی ذاتی گاڑی کے حوالے سے جس نیک نامی، شہرت اور عزت سے نواز رکھا ہے وہ شاید انہیں ان کی افسری، ذاتی ایمانداری اور انشائیے سرچرکی جیپا کے بعد بھی ”خراہم“ نہ کر سکتے۔

اس میں قطعاً مبالغہ نہیں، آپ اسلام آباد کی کسی شاہراہ پر کھڑے ہو جائیے، آگے پیچھے دیکھئے آپ کے دائیں یا بائیں جو انجینی کھڑا ہے اسے ہاتھ کے اشارے سے اپنی طرف متوجہ کیجیے (واضح رہے یہ انجینی خاتون نہیں ہونی چاہیے)۔ جب وہ پوری طرح آپ کی طرف متوجہ ہو جائے تو آپ اس سے پوچھئے ”بھائی آپ نے فردوس عالم کو تو نہیں دیکھا۔“ انجینی کی بھی زرد آنکھوں میں روشنی آجائے گی، باجیس کھل جائیں گی، چہرے پر جوانی کا تازہ خون فٹھیں مارنے لگے گا اور وہ ایک تہہ لگا کر بلند آواز میں کہے گا: ”اب تو پتا نہیں، لیکن صبح آٹھ بجے اپنے نینک پر شاہراہ دستور سے آپارہ کی طرف مارچ کر رہے تھے۔“

اس میں انجینی کی کوئی بات نہیں اسلام آباد کے باسی فردوس صاحب اور ان کی گاڑی کے اس قدر عادی ہو چکے ہیں کہ اگر کسی روز یہ دونوں گھر سے نہ نکلیں تو میلو ڈی کے آگے پیچھے رہنے والے زیادہ تر بچوں کا سکول ”خطا“ ہو جاتا ہے جبکہ صاحب لوگ دفتر سے لیٹ ہو جاتے ہیں۔ پوچھا جائے ”جناب آپ خلاف معمول تاخیر سے تشریف لائے، خیریت تو تھی۔“ صاحب بھائی لے کر کہتے ہیں: ”آج فردوس صاحب کی گاڑی ہی شارٹ نہیں ہوئی، آنکھ ہی نہیں کھلی۔“ اور اکثر یہ بھی ہوتا ہے کہ جس روز یہ عظیم شرف دیدار بخشنے کے لیے شہر نہ نکلے تو ”فریادی“ خود ہی آنکھیں سینٹنے کے لیے فردوس صاحب کے گھر جمع ہو جاتے ہیں اور ایک آدھ بار تو ایسا بھی ہوا کہ موصوف تین روز تک گیراج ہی میں استراحت فرماتی رہیں، تو شہر بھر سے زائرین کے جلوبس

”نکد شہادت“ کا درد کرتے ہوئے جائے حادثہ کی طرف چل پڑے جبکہ چند قریبی دوست تو فردوس صاحب کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو بھی پڑے، لیکن فردوس صاحب نے یہ کہہ کر ماتی جلوس کو تسلی دی: ”بھائیو! جی ہاں کہ نہ کرو موصوف تا حال بتید حیات ہیں، بس میری طبیعت ہی کچھ دنوں سے بھاری بھاری تھی، دوا لے رہا ہوں جو ٹی بی من سنبھلا نہیں لے کر حاضر ہو جاؤں گا“ اور جلوس خوشی کے شادیا نے بھاجا ہوا منتشر ہو گیا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے، فردوس عالم صاحب اسی گاڑی پر مزہ گشت کے لیے نکلے، جو ٹی بی وہ آزاد کشمیر ہاؤس کے قریب سے ہوتے ہوئے مارگلہ روڈ پر پہنچے تو انجن سے پی پی ٹی ٹھک، پی پی ٹی ٹھک کی اضافی آوازیں آنے لگیں، ابھی فردوس صاحب اس آواز پر پوری طرح پریشان بھی نہیں ہو پائے تھے کہ چرٹیں کی ایک اور آواز گونجی اور ایک جھٹکے سے گاڑی رک گئی، انجن بند ہو گیا، پورے شہر کی فضا میں سکوت مرگ طاری ہو گیا، ہوا میں اڑتے بے چین پرندے واپس درختوں پر آ بیٹھے، شہر سے فرار ہوتے گیدڑ اور لومنز بھی واپس پلٹ آئے، اعصابی مریضوں نے کانوں سے روٹی نکال لی اور بچے بیسویں صدی کے آخری معجزے کے نظارے کے لیے گھروں سے نکل آئے۔

گاڑی خراب ہو چکی تھی، فردوس صاحب ہونٹ کھول کر باری باری سارے پرزوں پر پھونکیں مار چکے تھے، سیلف دینے سے پہلے سورۃ الناس کا ورد بھی کہہ کے دیکھ لیا، بچوں سے ایک گلو میٹر تک دھکا بھی لگوایا۔ مارگلہ روڈ کے زیادہ تر ڈرائیوروں نے بھی اپنے اپنے ٹوکنے آزما لیے لیکن گاڑی اوڑیل ٹوکی طرح ٹس سے مس نہ ہوئی۔ مکینک لائے گئے، انہوں نے بھی سارے جتن کر لیے، لیکن گاڑی پی پی ٹی ٹھک — پی پی ٹی ٹھک کے بعد بند ہو جاتی۔ جب شام کے سائے لیے ہو گئے اور گیدڑ مارگلہ کی پہاڑیوں سے اتر کر تماش بینوں میں شامل ہونے لگے تو فیصلہ ہوا اسے کسی دوسری گاڑی کے پیچھے باندھ کر ورکشاپ پہنچایا جائے، ترکیب لا جواب تھی، لہذا فوراً عملدرآمد شروع ہو گیا۔ یوں پہلی بار ایسا ہوا کہ فردوس صاحب کی گاڑی چلی لیکن درختوں سے پرندے اڑے نہ ہی بچوں نے ڈر کر کانوں پر ہاتھ رکھا۔

فردوس صاحب کی اپنی روایت کے مطابق مکینک رات گئے تک فالت ٹریس کرتے رہے، آدھے سے زیادہ انجن کھول کر دیکھ لیا، سیلف کھول کر دیکھ لیا، بیٹری چیک کر لی، ہر چیز درست تھی، مکمل تھی مگر گاڑی پھر بھی شارت نہیں ہو رہی تھی۔ فردوس صاحب نے زنج ہو کر گاڑی ورکشاپ پر چھوڑی اور سکندر کی طرح خالی ہاتھ واپس جانے کا فیصلہ کر لیا، لیکن ابھی دو بج سے پوری طرح اٹھتے بھی نہیں پائے تھے کہ انجن سے پی پی ٹی ٹھک..... پی پی ٹی ٹھک کی آواز آئی اور پوری فضا جاگ اٹھی، پرندے درختوں سے اڑ گئے، گیدڑ پہاڑوں کی طرف بھاگ کھڑے ہوئے اور لوگ جڑ بڑا کر بسترؤں میں بیٹھ گئے۔ فردوس صاحب کی ہاتھیں مکمل انھیں، مکینک نے ہونٹ گرایا، ناکی سے ہاتھ صاف کیے اور فردوس صاحب کے قریب آ کر بولا: ”صاحب اگر آپ پھر پٹرول ڈالے بغیر گاڑی چلانے کی کوشش کریں گے تو اسی طرح پی پی ٹی ٹھک..... پی پی ٹی ٹھک کی آوازیں

آتی رہیں گی، گاڑی اسی طرح بند ہوتی رہے گی، آپ بھی اسی طرح خوار ہوتے رہیں گے۔“
 بعض اوقات مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے یہ ملک فردوس عالم کی گاڑی سے مختلف نہیں، یہ بھی عین
 بیچ سڑک بند ہو چکا ہے اور اب یہ پیچھے سرکتا ہے اور نہ ہی آگے بڑھتا ہے۔ ہم نے دھکا لگا کر دیکھ لیا کوئی نتیجہ
 برآمد نہیں ہوا، ہم نے بار بار سیلف مار کر دیکھ لیا، ایک آدھ بار جی جی ٹھک..... جی جی ٹھک کی آواز آئی لیکن
 دوبارہ خاموشی طاری ہو گئی۔ ہم نے مکینک بدل کر دیکھ لئے، آدھے سے زائد انجن کھل گیا، بیٹری میں نیا پانی
 ڈلوایا، الیکٹرک سپلائی کی ساری تاریں بدل دیں، پرانے پرزوں کی جگہ نئے ڈال دیئے، کئی بار نیا رنگ روغن
 کرایا، سیٹوں کے کشن بدلے، نئے نئے ڈرائیور رکھے، ٹبر پلٹیں تک بدل کر دیکھ لیں، لیکن گاڑی سے جی جی
 ٹھک..... جی جی ٹھک کی آوازوں کے سوا کچھ برآمد نہیں ہوا۔ پیسے میں ذرا بھر حرکت نہیں ہوئی، انجی بھر
 مسافرت طے نہیں ہوئی۔ ہم نے سارے جتن کیے، ہاڈی کو ٹھنڈ سے تک مارے، کمپنی کو بنانے والوں کو، چلانے
 والوں کو گالیاں تک دیں، لیکن کبھی پٹرول ٹینک کا ڈھکن کھول کر نہیں دیکھا، کبھی پٹرول کی زنگ آلود خشک
 نالیوں کی جانچ نہیں کی۔

ہم یہ بھول گئے، جب تک یہ خشک نالیاں ہری بھری نہیں ہوں گی، ٹینک پٹرول سے نہیں مچھلے گا، دنیا
 کا کوئی مکینک جی جی ٹھک..... جی جی ٹھک کی آوازیں نہیں روک سکتا، گاڑی کو طے پھر مجبور نہیں کر سکتا۔
 ہاں ایسا انداز ہی، فرض شناسی اور ملک سے محبت قوموں کے لیے پٹرول کا درجہ رکھتی ہے، یہ نہ ہوں تو
 تو میں تو میں نہیں ہوتیں، جی جی ٹھک..... جی جی ٹھک ہوتی ہیں۔



کچھ وقت تو لگے گا

اکثر محسوس ہوتا ہے جیسے ہم سب کسی ڈانٹنگ نیبل پر بیٹھے ہیں، ایسی ڈانٹنگ نیبل پر جس پر پانی کے خالی جگ اور چند گھاسوں کے سوا کچھ نہیں۔ ہم بے چینی سے کچن کی طرف دیکھتے ہیں، نوکروں کو دروازے کی طرف پکارتے اور پھر باہر نکلتے دیکھتے ہیں، برتن کھڑکے کی آواز سنتے ہیں، ڈونیاں چلنے، پڑنے کے گنے اور پتیلے سرکے کی آوازیں سنتے ہیں۔ ہم تو رے، مرغ پلاؤ اور حلیم کی خوشبو سونگھتے ہیں، وہی بو ہے، ساج کباب اور قے کی خوشبو بھی گھیر لیتی ہے، ہمیں روٹیاں پلٹنے، نان گرم کرنے اور سلا دینے کی آوازیں بھی آتی ہیں۔

ہاں ہم ہر آواز، خوشبو کے ہر جھونکے اور آنے جانے والی ہر ڈش کی جھلک سے خوش ہوتے ہیں، ایک دوسرے کو نکھیلنے سے دیکھتے ہیں، مسکراتے ہیں اور دوبارہ انگلیوں میں الجھ جاتے ہیں، تھوڑی دیر بعد جب موضوع کشش کو بیٹھتا ہے، زبان ٹھک جاتی ہے اور غوروں کے وقفے بڑھنے لگتے ہیں تو ہم چونک کر میزبان کی طرف دیکھتے ہیں، وہ مسکرا کر کچن کی طرف دیکھتا اور پھر ہماری طرف مڑ کر کہتا ہے، لگتا ہے کہ ”کڑی“ کے لیے پکڑے تلے جا رہے ہیں، کھانا بس آیا ہی چاہتا ہے، دراصل آپ آئے بڑی تاخیر سے ہیں، اب کچھ وقت تو لگے گا۔

یہ تماشا صبح تک جاری رہتا ہے، یہاں تک کہ کچھ مہمان نقاہت سے وہیں میز پر اوندھے ہو جاتے ہیں، چند اٹھ کر چلے جاتے ہیں اور باقی ماندہ آس کا دامن تھامے اسی طرح پر امید بیٹھے رہتے ہیں جبکہ اندر کچن کے اندر اسی طرح برتن کھڑکے رہتے ہیں، آوازیں اٹھتی رہتی ہیں، روٹیاں پکتی رہتی ہیں اور نوکر آتے جاتے رہتے ہیں۔

میں جب بھی حکومت کے فعال پر زوروں سے گفتگو کرتا ہوں تو انہیں مطمئن اور سرور پاتا ہوں، انہیں فائیکس لہراتے، بازو تھپتھپاتے، اعداد و شمار کے پہاڑ کھڑے کرتے اور دعوؤں کے انبار لگاتے دیکھتا ہوں تو میں انہیں توکتا ہوں۔ ایک لمحے کے لیے خیالی دنیا سے باہر قدم رکھنے کی درخواست کرتا ہوں، وہ دکتے ہیں ایک لمحے کے لیے دکتے ہیں تو میں عرض کرتا ہوں ”یارو کچھ خیال کرو، عام آدمی کی حالت بڑی تپلی ہے، ۳۶ روپے کو پیاز کون خریدے گا، بجلی کے پچاس یونٹ کا بل پانچ سو روپے کون دے گا، گیس کا بل چار ہزار روپے

کس کی جیب سے ادا ہوگا۔ کون اپنے بچوں کی فینس دے گا، یہ لوگ کیسے زندہ رہیں گے؟ وہ مجھے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہیں، فائل کھولتے ہیں، کاغذ کے ایک پرزے پر انگلی پھیر کر کہتے ہیں، انشاء اللہ اس برس ٹیکسوں کی آمدنی میں ۵۰ ملین کا اضافہ ہوگا، ۲۱ ملین کی ایکسپورٹس بڑھیں گی، ۹۴ ملین کا چاول بیچیں گے، ہمیں آئی ایم ایف ۲۲ ملین ڈالر کی امداد دے گا اور ہم دفاعی بجٹ میں ۲ ملین کی کمی کریں گے، بس اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے سارے مسائل حل ہو جائیں گے، مہنگائی کم ہو جائے گی، گیس، بجلی اور پٹرول کی قیمتیں گر جائیں گی، بخواتین بڑھ جائیں گی۔

میں ان سے کہتا ہوں دوستو، کچھ امن و امان پر توجہ دو، مسجدوں کو فرقہ واریت سے پاک کرو، مریضوں کا حفاظتی نظام بہتر بنادو، ناجائز اسلحے کی بڑھتی ہوئی مقدار پر قابو پاؤ، بموں کا راستہ روکو، کلاسٹرفیس پکڑو، دہشت گردی کا نیٹ ورک توڑو، کچھ تو ان مظلوم لوگوں کا خیال کرو، وہ مجھے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہیں، فائل کھولتے ہیں، کاغذوں کا دست نکالتے ہیں اور پھر پورے یقین سے کہتے ہیں: ”جناب آپ سمجھیں اب تو ہر مسئلہ ہی ختم ہو گیا، بس ایلٹ فورڈز آنے کی وجہ سے، سارے دہشت گرد بھاگ جائیں گے، خدمت کیشیاں اپنے اپنے علاقے میں امن و امان کی بحالی کی کوشش کریں گی، خفیہ ادارے فرقہ واریت کا زور توڑ دیں گے، پولیس کے لیے وضع کردہ نیا نظام لائینڈ آرڈر کی ساری صورتحال درست کر دے گا اور سرسری عدالتیں مجرموں کو عبرت کی علامت بنادیں گی۔ بس اللہ اللہ بخیر ملے۔“

میں ان سے کہتا ہوں صاحبو! کچھ سرحد پار کی صورتحال پر بھی توجہ کرو، دشمن حملے کی تیاریاں کر رہے ہیں، امریکہ جنوبی ایشیا میں اپنے مہرے بدل رہا ہے، افغانستان کی آگ اب ادھر بھی دھواں دے رہی ہے، بھارت مقبوضہ کشمیر میں کشمیری آبادی کی ”ڈاؤن سائزنگ“ کر رہا ہے، سرحد پار سے سینکڑوں جاسوس ادھر تمس آئے ہیں، وہ مجھے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہیں، کوئی دوسری فائل نکال کر دکھاتے ہیں، مسکراتے ہیں اور پھر دعوئی سے کہتے ہیں، نہیں جنگ نہیں ہوگی، بیٹھا گون کے ماہرین کا کہنا ہے بھارت کبھی سرحد عبور کر کے پاکستان میں گھسنے کا رسک نہیں لے گا، رابن رائیل کا بھی یہی خیال تھا، البرائٹ بھی یہی کہہ رہی ہے، کچھ ہم بھی نکیل کاٹنے سے لیس ہیں، اب تو ہمارے پاس غوری بھی ہے، تم فکر نہ کرو۔

میں ان سے کہتا ہوں، حضرت اس ملک میں ۳۵ ارب روپے صرف حکومت چلانے پر خرچ ہوتے ہیں۔ مہربانی فرما کر حکومتی اخراجات کم کرو، ایوان صدر، وزیر اعظم ہاؤس، پرائم منسٹر سیکرٹریٹ، گورنر ہاؤس، وزیر اعلیٰ ہاؤس، ایم این اے اور ایم پی اے ہاسٹل کی نج کاری کرو، وزیروں، مشیروں اور جیئر مینوں کے خرچے کم کرو، سرکاری گاڑیوں کی تعداد گھٹاؤ، پٹرول کی حد مخصوص کرو، نوکروں چاکروں کی چھٹی کراؤ، سادگی اختیار کرو، وہ مجھے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہیں، فائل نکالتے ہیں، انگلی پھیرتے اور کہتے ہیں صدر نے ایک ماہ میں اتنے ملازمین فارغ کیے، پرائم منسٹر سیکرٹریٹ سے اتنے لوگ دوسرے محکموں میں کھپائے گئے، ان ان

خرچوں پر پابندی لگائی گئی، یہاں یہاں ضرب لگانے کا منصوبہ ہے، ادھر ادھر سے اخراجات سمیٹے جائیں گے۔ میں ان سے کہتا ہوں آقاؤ! ان غلاموں کے لیے اس نظام کی چند کھڑکیاں ہی کھول دو، ہوا کے چند جھونکے تو اندر آنے دو، انصاف سستا کرو، قلم روک دو، تعلیم عام کرو، قانون کو نرم اور سیدھا بنا دو، عدالتوں کو دکانیں بننے سے بچاؤ، تھانوں کو عقوبت خانوں سے دور کر دو، پولیس کا فیشیل کو قصاب نہ بننے دو، ٹاپ تول کا نظام ہی ٹھیک کر دو، کمی کو جاگیر دار سے بچاؤ، اور ملک کو فارن الوبیسٹروں کے چنگل سے آزاد کرالو، وہ مجھے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہیں، فائل نکالتے ہیں اور کاغذ اٹھا کر پڑھنا شروع کر دیتے ہیں، نئے آئینی سیکٹیج سے لوگوں کو ان کے دروازوں پر انصاف ملے گا، حکومت ۲۰۰۳ء تک پورے ملک میں تقابلی انقلاب لے آئے گی، لوگوں کو تھانداروں کا احتساب کرنے کا موقع ملے گا، عدالتوں میں ہر شخص کو پورا پورا حق دیا جائے گا، ٹاپ تول میں بے ایمانی کرنے والوں کو کڑی سزا دی جائے گی، خوداک میں ملاوٹ کرنے والے قانون کی گرفت سے بچ نہیں سکیں گے، حالات بہت جلد درست ہو جائیں گے۔

یقین فرمائیے میں جب بھی حکومت کے ان پرزوں سے بات کرتا ہوں، مجھے یوں محسوس ہوتا ہے لوگ ڈانٹنگ فیشیل پر بیٹھے بھوک کو بہلاوے دے رہے ہیں اور اندر برتن کھڑک رہے ہیں، ڈونیاں چل رہی ہیں، تر کے لگ رہی ہیں، چیلے چیلیاں سرک رہی ہیں، قورے، مرغ پلاؤ اور حلیم کی خوشبو اڑ رہی ہے، دہلی بڑے سچ کہاب اور تھکے کی تھک آرہی ہے، روٹیاں ملتی جا رہی ہیں، نان گرم، کچے جا رہے ہیں اور سلا دکاتا جا رہا ہے لیکن باہر کچھ نہیں آرہا، میز پر بدستور ایک خالی جگہ اور درجن مہرگلاس دھرے ہیں۔ کچھ مہمان نقاہت سے اوندھے ہو چکے ہیں چند اٹھ کر جا چکے ہیں اور باقی ماندہ لوگ پیٹ پر ہاتھ باندھے پر امید بیٹھے ہیں اور میزبان بار بار کہہ رہا ہے معاف کیجیے گا کڑی کے لیے پکڑے سے جا رہے ہیں، کھانا بس آیا ہی چاہتا ہے، دراصل آپ آئے بڑی تاخیر سے ہیں۔ اب کچھ دقت تو لگے گا۔



مکمل سوال

جونی ٹرین اداسلو سے باہر نکلی، مجھے محسوس ہوا دروازے کے قریب کھڑا نارویجن مجھے "واچ" کر رہا ہے، مجھے بڑی حیرت ہوئی، مجھے یہ حیرت ہوئی بھی چاہیے تھی کیونکہ نیویارک کے ایک گرام ڈاکٹر میں نارویجن لوگوں کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے اور ڈاکٹر بھی وہ، جو ناروے میں ایک بچے سے زیادہ قیام کا ارادہ ہی نہ رکھتا ہو، میں نے سوچا پھر وہ نیلی آنکھوں، بھورے بالوں اور سرخ رنگت والا نارویجن "لیبو" مجھے کیوں گھور رہا ہے، مجھے اپنی آنکھوں سے ادبھل کیوں نہیں ہونے دیتا۔

ٹرین میں چھ سو سافر تھے، ان میں اونٹ جتنے لمبے آسٹریلین بھوپاری تھے، ان میں سرخ رنگت اور وحشی ہوئی آنکھوں والے امریکی تھے، ان میں مٹی کی پرانی پنڈ پانچیسے سیاہ لیکن برگڈ کے درخت جیسے لمبے، گھنے اور مضبوط افریقی تھے، ان میں پست ناک والے زرد رو جاپانی بھی تھے۔ ان میں اک آدھ چینی اور انڈین بھی تھا، لیکن وہ شخص صرف مجھے ہی گھور رہا تھا۔ اس سلوک پر مجھے بڑی بے چینی ہو رہی تھی، میں نے دھیان بنانے کے لیے پہلو بدلا اور اپنا چہرہ کھڑکی کے شیشے سے چپکا دیا۔

باہر پورا ناروے ہوا کے دوش پر اتر رہا تھا، سبز مٹی کھیت، کھیتوں میں چرتی صحت مند گائیں، سفید چاندنی جیسی ندیاں، ندیوں کے کنارے آباد صاف ستھرے گھر، گھروں کے صحنوں میں بھرتی صحت مند لڑکیاں اور لڑکیوں کے قریب کھیلنے سرخ گالوں اور بھورے بالوں والے بچے، سب تیزی سے پیچھے کھٹک رہے تھے۔ میں نے سوچا خدا نے اس خطے کو کس فراخ دلی سے حسن سے نوازا ہے اور کیا حسن کی یہ تقسیم وسیع نہیں ہو سکتی؟ کیا افریقہ کے گھور جنگل اور غربت کی چکی میں پستے ایشیا میں ایسے منظر ظہور نہیں ہو سکتے۔ میں نے سوچا اور انسان صرف خوبصورتی دیکھنا چاہتا ہے۔ اور۔۔۔ اچانک میری نظر کھڑکی سے اڑ کر دروازے پر کھڑے جاسوس پر جا گری اور میری سوچ کا دھارا پتھر پر گرتی آبی لیکر کی طرح چھیننے بن کر اڑ گیا، وہ مشکوک نارویجن مجھے بدستور گھور رہا تھا، میں نے بے چینی سے پھر پہلو بدلا، بیچ میں لرزش سی ہوئی تو میرے پہلو میں بیٹھے بلخارین بوڑھے نے چہرے سے اخبار کھسکا کر مجھے گھور کر دیکھا، میں جھینپ گیا۔

ٹرین کسی غیر اہم سٹیشن پر رکی، دروازے کھلے اور چند لوگ اخبارات، نقشن اور بیگ لے کر پلیٹ فارم

پر کود گئے، اگلے چند سیکنڈ میں دروازے بند ہوئے، پہیوں نے درد کی سسکاری لی اور منظر پھر تیزی سے پیچھے دوڑنے لگے۔ کیا رشتہ میں رش بڑی حد تک کم ہو چکا تھا، جاسوس نے کلائی سیدھی کی، قمیض کا کف سر کا یا، وقت دیکھا، گردن ہلائی اور پورے اطمینان سے میری طرف بڑھنے لگا۔ میری دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔

جاسوس میرے قریب کھڑا ہوا، جیب میں ہاتھ ڈال کر سرکاری کارڈ نکالا اور میرے سامنے لا کر بولا: "سر میں انسٹرکشن آفیسر ہوں، آپ کے سامان کی تلاشی لینا چاہتا ہوں؟" میں فوراً گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ "مگر کیوں سر؟" میری آواز میں حیرانی اور غصہ دونوں تھے۔ "بی کا زیو آراءے پاکستانی سر" مجھے جھٹکا سا لگا اور میں نے چلا کر کہا: "نہیں میں پاکستانی نہیں ہوں، میں امریکن ہوں، بائی برتھ امریکن" اس نے اپنی دونوں ٹانگوں پر پورا وزن ڈالا اور آواز میں ایک معنوی بھاری پن لا کر بولا: "ہو سکتا ہے، آپ ٹھیک کہہ رہے ہوں، لیکن میں اس کے باوجود آپ کے کاغذات دیکھوں گا، سامان کی تلاشی لوں گا۔" میرا دماغ اس امتیازی سلوک پر آتش فشاں کی طرح پھٹنے لگا، میں نے غصے سے جیکٹ کی جیب سے سارے کاغذ نکالے اور اس کے ہاتھ میں تھما دیے اس نے میرا امریکن پاسپورٹ کھول کر دیکھا، ایک ایک مہر، ایک ایک نقش کو بلب کے سامنے رکھ کر پڑھا، میرا گرین کارڈ چیک کیا، میری قاسم، میرے شناختی نشانات کی تصدیق کی، ناروے کے ویزے کی پڑتال کی، میرا کنٹ چیک کیا، جب مکمل اطمینان ہو گیا تو مجھے کاغذات واپس کرتے ہوئے بولا: "میرا احمد حسینک پو وری بچ، اب آپ اپنا سامان دکھائیں گے۔" میں نے پاؤں کی ٹھوکر سے بیک اس کی طرف دھکیل دیا، اس نے مسکرا کر مجھے دیکھا اور تپ کھول کر بیک فرش پر الٹ دیا، ٹھک ٹھک کی کئی آوازیں گونجیں اور پرفیوم، آئینہ شیشو اور سافٹ ڈرنکس کے ڈبے فرش پر لڑھکے لگے، سارے مسافر نشستوں سے اٹھے اور جم کر تماشا دیکھنے لگے، میری آنکھوں میں آنسو آ گئے، میں نے ناک پر نشو رکھا اور اپنا چہرہ دوبارہ کھڑکی کے شیشے سے چپکا دیا، منظر اسی طرح، پیچھے کی طرف بھاگ رہے تھے۔

جاسوس نے میری گندی چٹلون کی جیسس الٹ کر دیکھیں، صاف شرفوں کے بارڈرنول کر دیکھے، کتابیں ہماڑ کر تسلی کی، آئینہ شیشو اور پرفیوم کی خوشبو سونگھ کر تحنید لگایا، چاقو سے بیک کے استراڈیزر کر معائنہ کیا، جب کچھ نہ ملا تو مجھے جرموں کی طرح کھڑا کر کے میرے جسم کے سارے حصے نول کر دیکھے۔ جب اس میں بھی بری طرح ناکامی ہوئی تو مسکرا کر میرا شکر یہ ادا کیا، تکلیف کے لیے معافی مانگی اور اپنے تئیں قدموں سے چٹا ہوا دوبارہ دروازے کے قریب جا کر کھڑا ہو گیا، غرین اسی طرح فرارے بھر رہی تھی، مسافری طرح سینوں پر بیٹھے تھے، بلغارین بوز حاجی چہرے پر اخبار اوڑھے اسی طرح اونگھ رہا تھا، لیکن میرا پورا جسم غصے، نفرت اور توہین کی آگ میں جل رہا تھا۔

اس رات میں نے اپنے میزبان سے اس سلوک کے بارے میں پوچھا تو وہ ٹھنکے لہجے میں بولا: "ناروے حکومت نے انسٹرکشن کے عملے کو پاکستانیوں پر نظر رکھنے کا حکم دے رکھا ہے۔" "پر کیوں؟" "اس

لیے میرے شہزادے کے ماروے میں ۸۵ فیصد جرائم کے پیچھے پاکستانیوں کا ہاتھ ہوتا ہے، اوسلو کے ۱۵ ٹائٹ کلیمز میں سے ۵ پاکستانیوں کے ہیں، جن میں لڑائی جھگڑا، دنگ فساد اور قتل معمول بن چکا ہے، جبکہ خفیات اور عصمت فروشی کے دھندوں پر بھی بڑی حد تک پاکستانیوں کی ”مٹاپلی“ ہے۔ لہذا تارو بگن گورنمنٹ جہاں سنے پاکستانیوں کی آمد کو ”ڈس کرچ“ کرتی ہے وہاں ہر سنے پاکستانی پر کڑی نظر بھی رکھتی ہے۔ ”میزبان نے ایک ہی سانس میں سارا کچا چھٹا سنا دیا۔ ”لیکن میں تو پاکستان سے نہیں، نیویارک سے آیا ہوں، پائی برتھ امریکن ہیٹل ہوں، میری ساری گروتھ نیویارک میں ہوئی۔ میں نے ایجوکیشن نیویارک سے پائی، میرا حلیہ بھی امریکن تھا، پھر چھ سو مسافروں میں سے اس نے صرف مجھے ہی شناخت کیوں کیا۔ اس نے صرف میری ہی تلاشی کیوں لی۔“ میرے لہجے میں بدستور غصے کی آغچ تھی۔ ”اس لیے ایمی ڈیز“ میزبان کے چہرے پر طنز یہ مسکراہٹ بھی تھی۔ ”اس لیے ایمی ڈیز کہ ایگریژیشن والوں کے لیے صرف گندی رنگت، سیاہ آنکھیں اور السلام علیکم ہی کافی ہوتا ہے۔“

ایمی نے یہ ساری واردات سنا کر آخر میں پوچھا: ”آخر ہمارا کیا قصور ہے، ہم لوگ کچھلی ایک نسل سے پاکستان سے مفرور ہیں۔ پانچ سال بعد اسلام آباد، لاہور یا کراچی کا چکر لگاتے ہیں۔ ہمارا سارا لائف سٹائل امریکن ہے، ہم اردو بول سکتے ہیں اور نہ ہی سمجھ سکتے ہیں لیکن اس کے باوجود ہم جہاں بھی جاتے ہیں۔ ہمیں پاکستانی فنی کی حیثیت سے فریٹ کیا جاتا ہے، اسی طرح ہمارا سارا سامان کھولا جاتا ہے، ہمارے کپڑوں، ہمارے جسم کی تلاشی لی جاتی ہے۔ ہمیں ڈرنی پاکی کہا جاتا ہے، ہمیں چور، سنگر اور قاتل سمجھا جاتا ہے، کیوں، آخر کیوں؟“

میں نے ایمی کا سوال سنا تو خاموش ہو گیا، مجھے یقین ہے، آپ بھی میری طرح ایمی کے اس سوال پر خاموشی اختیار کریں گے کہ بعض سوال اپنے جوابوں سے زیادہ، جامع، زیادہ مکمل اور زیادہ بلیغ ہوتے ہیں۔



تو کیا ہوگا؟

برسوں پہلے برلن میں وہ پاکستانی طالب علم جو ہری تعلیم حاصل کر رہے تھے، تحصیل علم کے بعد ان میں سے ایک امریکہ چلا گیا جہاں اس نے انٹنی توانائی کے ایک ادارے میں ملازمت کر لی، نوجوان تختی تھا لہذا دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کرتا چلا گیا یہاں تک کہ اس کا شمار دنیا کے سب سے زیادہ معاوضہ لینے والے سائنس دانوں میں ہونے لگا جبکہ دوسرا نوجوان واپس پاکستان آ گیا جہاں اس نے انٹنی پلانٹ کی بنیاد رکھی، غیر سائنسی ماحول میں دن رات کام کیا اور آنے والے دس پندرہ برس میں ڈاکٹر عبدالقدیر بن کر طلوع ہوا، کبوتر یا سے کیپ کیخوڑل اور اسلام آباد سے مل ایب تک اس کے تذکرے ہونے لگے، جب اس کی یہ شہرت ازنی ہوئی پہلے ”نوجوان“ تک پہنچی تو اس نے ڈاکٹر عبدالقدیر کو کھٹ لکھا جس میں مبارک باد کے بعد پیشکش کی ”میں بھی آپ کی طرح پاکستان کی خدمت کرنا چاہتا ہوں، مجھے مشورہ دیں کیا کروں؟“ ڈاکٹر عبدالقدیر نے انہیں مشورہ دیا ”پاکستان فلاحی کاموں میں بہت پیچھے ہے آپ کو اللہ تعالیٰ نے دولت سے نواز رکھا ہے، آپ خدا کے دیے میں سے کچھ پاکستان کی سماجی بہبود پر بھی خرچ کر دیا کریں، اللہ تعالیٰ آپ کو بہت اجر دے گا۔“ کچھ عرصے بعد ڈاکٹر عبدالقدیر کو اس ”نوجوان“ کا ایک اور خط موصول ہوا جس میں اس نے بڑے جذباتی انداز میں اعلان کیا ”قدیر تمہارے مشورے نے میری آنکھیں کھول دیں، میں نے سوچا یہ دنیا کا مال ہے اس نے دنیا ہی میں رہ جاتا ہے، میں اگر اس میں سے کچھ اپنے ہم وطنوں پر خرچ کر دوں گا تو اس سے بڑی سعادت کیا ہوگی، چنانچہ میں نے امریکہ میں ایک اسلامی مدرسہ کو پورے پچیس (۲۵) ڈالر کا چیک بھجوا دیا ہے، ویسے تو نیکی کی تشکر نہیں کرنی چاہیے لیکن تم غیر تھوڑے ہو لہذا تمہیں بتا رہا ہوں کسی دوسرے سے ذکر نہ کرنا کہیں میری نیکی غارت نہ چلی جائے میں اس مدرسے کو ہر سال اتنی ہی رقم ڈونٹ کیا کروں گا۔“

یہ واقعہ فقط ایک واقعہ نہیں بلکہ ایک ایسی سچ حقیقت ہے جس پر ہم جتنا چاہیں ماتم کریں کم ہے کیونکہ یہی وہ الہ ہے جس میں ہماری پسماندگی کی ساری جزیں پیوست ہیں، آئے روز ڈاکٹر مرتضیٰ آرام کی جیسے حضرات شکا کو سے پاکستان تشریف لاتے رہتے ہیں ہمیں ہماری کم مانگی، پسماندگی، جہالت، بیماری، بد اخلاقی، کرپشن اور غیر جمہوری روایات کا احساس دلاتے رہتے ہیں، ”انسان بن جاؤ ورنہ برباد ہو جاؤ گے۔“

کی وعید سناتے ہیں، دعوتیں اڑاتے ہیں، تالیاں بجواتے ہیں اور واشنگٹن، لندن، یون، سڈنی اور زیورخ واپس چلے جاتے ہیں، ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں جو ہماری اصلاح کے لیے، ہماری کم مائیگی، پس ماندگی، جہالت، بیماری اور کرپشن دور کرنے کے لیے یہاں رک جائے دوسری طرف ہماری بد قسمتی دیکھیے ہم سر جھکا کر ان کے یہ طعنے سن لیتے ہیں، خود کو لبرل اور براڈ مائنڈڈ ثابت کرنے کے لیے مناسب موقعوں پر تالیاں بھی پیٹ لیتے ہیں لیکن انہیں کبھی ٹوک کر نہیں کہتے جناب جس ملک کے ۲۲ ہزار ۳ سو ۲۳ آکٹر (صرف امریکہ میں ۶ ہزار پاکستانی ڈاکٹر ہیں) ملک سے باہر ہوں اس میں بیماری نہیں ہوگی تو کیا ہوگا؟ جس ملک کے ۱۷ ہزار ۵ سو ۱۸ انجینئرز کو الاپور سے لاس انجلس تک غیروں کی بھڑیاں جھونک رہے ہوں اس کے پانچ چھ ہزار صنعتی یونٹ بند نہیں ہوں گے تو کیا ہوگا؟ جس ملک کے ساڑھے چار ہزار زرعی ماہرین کینیڈا، آسٹریلیا اور امریکہ کی بھر زمینوں میں رزق پورے ہوں، اس کی لاکھوں ایکڑ اراضی پر قحط کاشت نہیں ہوگا تو کیا ہوگا؟ جس ملک کے ۲۱ ہزار دامغانڈل ایسٹ، فارایسٹ، یورپ، آسٹریلیا اور امریکہ کی ٹیکسٹریاں، کارپوریشنز اور بزنس فرمز چلا رہے ہوں، اس کے ہاتھ میں مشکل نہیں ہوگا تو کیا ہوگا؟ جس ملک کے ۳۳ ہزار بینکار ٹوکیو، سنگاپور، دوئی، لندن، زیورخ اور واشنگٹن میں بیٹھ کر یہودیوں کے لیے سرمایہ جمع کر رہے ہوں، اس میں اقتصادی بحران ختم نہیں لیں گے تو کیا ہوگا؟ جس ملک کے ۸۱ ہزار بزنس مین دنیا کی جونی بیوی مارکیٹوں میں بیٹھ کر ان بوائے بچوں کے اس کی صنعت کو زوال نہیں آئے گا تو کیا ہوگا؟ جس ملک کے اڑھائی ہزار اساتذہ غیر ملکی اداروں میں غیر ملکی طالب علموں کو ترقی کا درس دیں گے اس میں ناخواندگی کا اندھیرا نہیں پھیلے گا تو کیا ہوگا؟ جس ملک کے ۵۰ سو ۵۰ ماہرین غیر ملکی ایئر لائنز چلا رہے ہوں اس کے ۱۲ طیارے کیا نہیں بنیں گے تو کیا ہوگا؟ جس ملک کے ۱۲ سو ۸ بہترین دماغ دنیا کی ۱۱ شپنگ کمپنیاں چلا رہے ہوں، اس کے ملاحوں کے چپو نہیں ٹوٹیں گے تو کیا ہوگا؟ اور جس ملک کے ۱۰ لاکھ کارکن امریکہ، ۲۳ لاکھ یورپ، ۲ لاکھ آسٹریلیا، کینیڈا، نیوزی لینڈ، ۷ لاکھ جاپان، ملائیشیا، انڈونیشیا، تھائی لینڈ، ہانگ کانگ اور سنگاپور میں ہوں گے، جس کے ۲۰ لاکھ ہنرمند مشرقی یورپ، متحدہ عرب امارت، وسطی ایشیا اور جنوبی افریقہ کی مٹی کو سونا بنا رہے ہوں گے اس میں پس ماندگی، غربت اور کرپشن نہیں ہوگی تو کیا ہوگا؟

عقل سوال کرتی ہے جب ایک ڈاکٹر عبد القدیر اس ملک کو جو ۲۱ ویں صدی کے دروازے پر کھڑا ہو کر سائیکل کا چین اور ہیرنگ تک باہر سے منگواتا ہے، دنیا کی ساتویں ٹیوٹر حرقات بنا سکتا ہے تو ملک سے باہر بیٹھ کر اس کی بربادی کا تماشا دیکھنے والے ایک لاکھ ۹۰ ہزار ڈاکٹر عبد القدیر، پچاس ساڑھے لاکھ کام کرنے والے ہاتھ اور اتنے ہی سوپنے والے دماغ واپس آ کر اسے جاپان، سنگاپور اور کوریا نہیں بنا سکتے؟

ظلم یہ نہیں کہ ہم بہت پیچھے ہیں ظلم یہ ہے کہ ہم اس ٹیلنٹ کے باوجود پیچھے ہیں جو پوری دنیا کی اقتصادیات چلا رہا ہے، اگر آئے والے چند برسوں میں یہ ٹیلنٹ واپس نہ آیا تو کیا ہوگا؟ اس کا انداز جناب مرتضیٰ آرائیں جیسے دانشور بھی لگا سکتے ہیں اور ہم ان کھجور، بیک ورو، یورپیئل بھی۔

جاگنے والے

بھارت کی لوگ سبھانے جب یہ بل پاس کیا تو میں ٹیلی ویژن کی آواز بند کر کے اخبار پڑھ رہا تھا۔ خبر کے آخر میں جہاں باقی صفحے پر بقیہ ۳۹ لکھا تھا، پہنچ کر میں نے غیر شعوری طور پر سکرین پر نظر ڈالی تو مجھے سفید کرتوں، سفید دھوتیوں اور سفید ٹوپوں میں ملبوس ارکان اسمبلی کے چہرے پر غیر معمولی چمک نظر آئی، زیادہ تر ایک دوسرے سے بغل گیر ہو رہے تھے، کچھ ہاتھ ہلا کر مبارکبادیں دے رہے تھے اور چند ایک حضرات شوخی میں شاید نعرہ بازی کر رہے تھے، ایک لمحے کے لیے میں نے سوچا شاید یہ لوگ بھارت کی پارلیمانی تاریخ کا کوئی اہم فیصلہ کر چکے ہیں۔ ہو سکتا ہے پنجاب کے سکھوں کے حقوق بحال کر دیئے گئے ہوں، تامل علیحدگی پسندوں کے مطالبات مان لیے ہوں، ناگالینڈ کا مسئلہ حل ہو گیا ہو، بنگالیوں کے خلاف ریاستی سختی ختم کرنے کا اعلان کر دیا گیا ہو۔ کشمیریوں کو حق خود ارادیت دینے کا فیصلہ ہو گیا ہو یا مسلم کش فسادات کے خلاف کوئی سخت قانون پاس ہو گیا ہو، وغیرہ وغیرہ۔ بہر حال مجھے ریموٹ کنٹرول تلاش کرتے جھنمی دیر لگی، میرا دماغ اتنی دیر طرح طرح کے مفروضے تراش رہا لیکن جب میں نے ”ریموٹ“ کا بٹن دبا کر ٹیلی ویژن کی گویائی اسے لوٹا دی تو یہ سن کر حیران رہ گیا کہ لوگ سبھانے کے ممبران بھی پاکستانی ارکان پارلیمنٹ کی طرح اپنی تنخواہوں میں چار سو گنا اضافے پر جشن منا رہے تھے۔ مجھے حلق میں پتھر سے گرتے محسوس ہوئے۔ میں نے ریموٹ کنٹرول اٹھایا اور ڈش کارڈیسور آف کرنے کے لیے بٹن پر ہاتھ رکھ دیا، لیکن اس سے قبل کہ خلیف سے جھماکے ساتھ شیشے بے رنگ ہو جاتا، سکرین پر ارکان پارلیمنٹ کی پرانی اور نئی تنخواہوں کا چارٹ آ گیا۔

جی ہاں مضبوط اقتصادی بنیادوں پر کھڑے اس ملک میں، جس کی بندرگاہوں سے روزانہ کروڑوں ڈالر کا سامان عالمی منڈیوں کی طرف اپنا سفر شروع کرتا ہے، جس کے ڈیزل لاکھ بڑے صنعتی یونٹوں کی بھلیاں پورا سال گرم رہتی ہیں، جس کے بارہ بارہ ایکڑ کے فارم دنیا میں سب سے زیادہ پیداوار دیتے ہیں، جس کے گڑگا اور جتنا جب جوش میں کناروں سے باہر نکلتے ہیں تو دو دو تک زرخیزی پھیلاتے جاتے ہیں، جو دنیا کا چوتھا بڑا سیاحتی مرکز ہے، جو دنیا کا ساتواں بڑا صنعتی زون ہے اور جو قدرتی وسائل کے حوالے سے دنیا کا بارہواں بڑا ملک ہے، اس کا رکن قومی اسمبلی (لوگ سبھا) ۶ ستمبر ۱۹۷۱ء تک صرف چند سو روپے ماہانہ تنخواہ

وصول کرتا تھا اور ان لوگوں نے ۱۵ سو سے ۶ ہزار روپے ماہانہ تک "پروموشن" کے لیے کتنے عرصے تک کندھے سے کندھا ملا کر جدوجہد کی۔ اپنی اپنی پارلیمانی پارٹیوں میں کتنی طویل آئینی جنگ لڑی تھی۔ پارلیمنٹ میں سب تک اپنے "حق" کے لیے "یہ" لڑا، صرف یہ لوگ جانتے ہیں یا بھارت کی پارلیمانی تاریخ، کیونکہ ان لوگوں نے جب اپنی تنخواہوں میں اضافے کا سوال اٹھایا، انہیں جواب ملا، جس ملک کے ۳ کروڑ عوام فٹ پاٹھوں پر سوتے ہوں، جس ملک کے سات صوبوں میں جنگ ہو رہی ہو، جس ملک کے پچاس فیصد عوام غربت کی لیکر سے نیچے زندگی بسر کر رہے ہوں، جس ملک میں بیروزگاری اپنی انتہائی حدوں کو چھو رہی ہو، جس ملک میں محصمت فروشی سب سے بڑی انڈسٹری ہو، جس ملک کی زیادہ تر بیعتیں مہلک بیماریوں سے جنگ میں صرف ہو رہی ہوں اور جس ملک کا ہنرمند اور - ۸ روپے روزانہ کھاتا ہو، اس ملک کے رکن پارلیمنٹ کے لیے ۵۰ روپے روزانہ کم نہیں..... یہ تو خیر ہو آئی کے گجرا ل کی، سودا درجن سیاسی پارٹیوں پر مشتمل یونائیٹڈ فرنٹ کی کمزور حکومت کی اور "دا" کے اس خفیہ سروے کی جس میں خدشہ ظاہر کیا گیا کہ اگر ارکان پارلیمنٹ کی تنخواہیں نہ بڑھیں تو آسمان کو چھوئی مہنگائی ان لوگوں کو کرپشن پر مجبور کر دے گی، لہذا ان کی تنخواہیں ۴۰ سو گنا اضافے کے بعد ۶ ہزار روپے ماہانہ کر دی گئیں۔

نی دی کے سامنے سے اٹھتے ہوئے مجھے دو پاکستانی سفیر یاد آگیا، جس نے بھارت سے واپسی پر مجھے بتایا تھا "لوگ سچا میں ابھی تک ایسے نمبران کی تعداد کم نہیں، جو رکشوں اور ٹیکسیوں پر اجلاس میں شرکت کے لیے آتے ہیں، ہانگ کر اخبار پڑھتے ہیں، سودا ادھار لیتے ہیں، بارش میں بوسیدہ جمتری لے کر گھروں سے نکلتے ہیں، جوتے بغل میں دیا کر کچھڑے سے گزرتے ہیں اور گلی کے قتل سے پانی بھر کر لاتے ہیں۔"

اور مجھے دو پاکستانی سیاستدان بھی یاد آیا، جس نے بڑے دھڑکی سے کہا تھا:

"پاکستان کی پارلیمنٹ میں ایک بھی ایسا شخص نہیں جس کے پاس ذاتی گھر، گاڑی اور بینک بیلنس نہ ہو، جس کا روزانہ کا خرچ کم از کم پانچ ہزار نہ ہو، جس کے بچے مہنگے ترین اداروں میں نہ پڑھتے ہوں، جو بچوں کی شادی میں پچاس ساٹھ لاکھ روپے خرچ نہ کرتا ہو، جس کے الیکشن کے اخراجات تیس چالیس لاکھ سے کم نہ ہوں اور جو اپنے باؤی گاروڑ کو ہزاروں روپے ماہانہ تنخواہ نہ دیتا ہو۔"

اور مجھے وہ سابق سپیکر بھی یاد آگیا، جس نے ایک نجی محفل میں کہا تھا:

"پاکستان کی پارلیمانی تاریخ میں ارکان اسمبلی کی تنخواہوں میں اضافے کے مل واحد "ایڈیٹرز" تھے جن پر کسی رکن اسمبلی نے کوئی اعتراض نہیں کیا، جبکہ ان میں ایک بھی ایسا شخص نہیں تھا جس کے لیے دس بیس ہزار کوئی ناگزیر رقم ہو۔"

اور مجھے وہ اقتصادی ماہر بھی یاد آگیا، جس نے بڑے دکھ سے کہا تھا

"کیا وہ ملک اقتصادی موت نہیں م رہا جس کے کھیتوں میں صرف بھوک اٹھی ہو، جس کے دریا

صرف سیلاب لاتے ہوں، جس کے کارخانے صرف سرمایہ داروں کے ٹیکسال ہوں اور جس کی پارلیمنٹ صرف چوروں، سنگروں اور نادہندوں کی محافظ ہو۔"

اور مجھے وہ ریٹائرڈ جنرل بھی یاد آگیا، جس نے بوے دکھ سے کہا تھا:

"دواذیتیں ہیں، جو مجھے جھین نہیں لینے دیتیں، اول پاکستانی سیاستدان جو سیاست تو پاکستان کی کرتا ہے لیکن خود پاکستانی نہیں، دوم ہندوستانی سیاستدان، جو سیاست تو بین الاقوامی کرتا ہے، لیکن خود بری طرح ہندوستانی ہے۔"

اور مجھے وہ عالم بھی یاد آیا جو ساری رات دنیا بھر کے کافروں کو جہنم کی آگ میں جلاتا رہا اور نماز فجر کے بعد جب میں نے اس سے پوچھا زمین، نیکی، اچھائی اور امن پھیلانے والے کافر کی درازی عمر کے لیے دعا گو ہوتی ہے یا ایک بددیت، بدطینت اور عمل سے خالی "مومن" کے لیے؟ تو اس نے غصے سے کہا روزِ محشر کافروں کے حامی بھی کافروں کے ساتھ ہی اٹھائے جائیں گے۔

ہاں ٹی وی کے سامنے سے اٹھتے ہوئے میں نے اپنے آپ سے سوال کیا..... عملِ عظیم ہے یا خواب؟
تو جواب آیا جاگنے والے کے لیے عمل اور سوتے والوں کے لیے خواب۔

Kashif Azad @ OneUrdu.com



پوچھنے والا کوئی نہیں

یہ شاید ۹۷ جون کی بات ہے، بھارت کو اپنی اقتصادی پوزیشن کو سنبھالا دینے کے لیے ۵۰ ارب روپے کی ضرورت پڑی۔ کابینہ کا اجلاس ہوا تو ایک وزیر نے آئی ایم ایف سے مختصر مدت کے لیے قرضہ لینے کا مشورہ دیا۔ دوسرے نے قومی اٹاک بیچ کر رقم حاصل کرنے کی تجویز پیش کی۔ تیسرا بولا کیوں نہ کسی "برادر" ملک سے چند ماہ کے لیے ادھار پکڑ لیا جائے۔ چوتھے کا مشورہ عجیب تھا، کہنے لگا، ہم بھارت ہی میں کسی بڑے صنعت کار سے رقم لے لیتے ہیں، سال چھ ماہ میں ادا کر دیں گے، ابھی تجاویز کا سلسلہ جاری تھا کہ بھارت کے وزیر خزانہ بی چند برم کھڑے ہوئے، وزیر اعظم سے بولنے کی اجازت چاہی اور پھر کابینہ کے ارکان کو مخاطب کر کے بولے

Kashif Azad @ OneUrdu.com

"حضرات اگر میں آپ کو اس سے کہیں زیادہ رقم حاصل کرنے کا طریقہ بتاؤں جو مستقبل میں واپس کرنی پڑے اور نہ ہی اس پر سوویتا پڑے تو....."

سب نے بے صبری سے کہا: "ہاں ہاں، بتائیے۔"

چند برم نے عادتاً کان کی لوچکی میں ربائی، اسے ذرا سا سسلا اور پھر گویا ہوا:

"حضرات میری سنڈی کے مطابق اس وقت بھارت میں لگ بھگ ۵ کھرب روپے کالے دھن کی صورت میں موجود ہیں، جنہیں بھارت سرکار استعمال کر سکتی ہے اور نہ ہی وہ لوگ جن کے قبضے میں یہ رقم ہے، اگر ہم کوئی ایسی سکیم پیش کر دیں جس سے یہ ۵ کھرب روپے جائز شکل اختیار کر جائیں تو دو فائدے ہوں گے۔" وہ ایک لمحے کے لیے رکے، حاضرین کے چہرے پر نظریں جمائیں، ناف پر ہاتھ باندھے اور پھر بولے

"دو فائدے ہوں گے، ایک سرکار کو ٹیکس کی شکل میں ۳ ہزار کروڑ سے لے کر ۷ ہزار کروڑ تک رقم مل جائے گی، دوسرا ایک کھرب ۶۳ ارب ۳ کروڑ ۳۳ لاکھ روپے تجویز ہوں، خفیہ اکاؤنٹس اور یوریوں سے نکل کر سرکولیشن میں آجائیں گے اور....."

اچانک ایک رکن اٹھا، جھک کر وزیر اعظم سے اجازت لی اور پھر چند برم کو ٹوک کر بولا: "لیکن منسٹر آپ اتنے وثوق سے ریکوری کا دعویٰ کیسے کر سکتے ہیں؟" چند برم نے آنکھیں بند کر کے یوگیوں کی طرح لمبا

سائنس لیا اور پھر اسے آہستہ آہستہ خارج کرتے ہوئے بولے: "میں اسی طرف آرہا ہوں۔" میرا خیال ہے اگر ہم آج سے پورے بھارت میں اعلان کر دیں، جس کے پاس جتنا کالا دھن ہے، وہ اسے ظاہر کرے، اس میں سے ۳۰ فیصد سرکاری خزانے میں جمع کرائے اور باقی ۷۰ فیصد کاروبار میں لگا دے، وہ بھی خوش ہو جائیں گے اور سرکار بھی مطمئن ہو جائے گی۔"

"لیکن اس سے سرکار کو کتنی رقم حاصل ہوگی؟" دوسرے وزیر نے سوال کیا۔ "ہم بڑی آسانی سے ۴۰ سے ۵۰ ارب روپے حاصل کر سکتے ہیں۔" چند مہرم اسی اطمینان سے بولے۔

ایک دوسرا وزیر کھڑا ہوا، بولنے کی اجازت چاہی اور پھر چند مہرم کو مخاطب کر کے بولا: "آپ تو کہہ رہے تھے ملک میں ۵ کھرب روپے زیر زمین ہیں، لیکن برآمد صرف پونے دو کھرب کر رہے ہیں؟" چند مہرم نے دوبارہ کان کی لوچنگی میں دہائی اور وزیر اعظم کو متوجہ کر کے بولے: "میری سنڈی کے مطابق اس سکیم سے صرف اتنا روپیہ ہی باہر آ سکتا ہے کیونکہ بھارت کے اندر صرف ۲ کھرب روپے چھپے ہیں، باقی تین کھرب ملک سے باہر سیکرٹ اکاؤنٹس میں پڑے ہیں، انہیں حاصل کرنے کے لیے کسی دوسرے وقت، کوئی دوسری سکیم بنائیں گے۔" وزیر اعظم نے گردن ہلائی اور پھر انہیں مخاطب کر کے بولے: "لیکن مسٹر چند مہرم اس کا کیا ثبوت ہے کہ ہم سکیم کا اعلان کریں اور لوگ کالا دھن لے کر وزارت خزانہ کے حضور پیش ہو جائیں۔"

"ہاں، یہ بات بھی تفصیل طلب ہے۔" چند مہرم نے گردن اثبات میں ہلا کر کہا: "میری تجویز ہے لوگوں کو ۳۱ دسمبر ۹۷ تک وقت دیا جائے، اس دوران جو لوگ اس سکیم سے فائدہ اٹھالیں، ٹھیک، ورنہ بصورت دیگر یکم جنوری ۹۸ سے جس سے بھی کالا دھن برآمد ہوا سے موقع پر ہی گرفتار کر لیا جائے اور قید کی سزا سنائی جائے، ورنہ آں۔" چند مہرم جھکا، سب کا شکر یہ ادا کیا اور بیٹھ گیا۔

اور پھر کابینہ کا اجلاس ختم ہوتے ہی بھارت میں دی ڈی آئی ایس (ڈائریکٹری ڈس کلوژر آف انکم سکیم) کا اعلان کر دیا گیا، رشوت خوروں، منشیات فروشوں، ڈکیتیوں اور چوروں کو ۳۱ دسمبر تک کا وقت دے دیا گیا، ملک بھر میں اپنے سفرز قائم کر دیے گئے جہاں لوگ کالا دھن کی رپورٹ کر سکتے ہیں اور پھر اس کے بعد اخبارات کے رپورٹروں نے دیکھا، کالے دھن کے مالکان نے تین تین گھنٹے قطاروں میں کھڑے ہو کر رقم جمع کرائی، یہاں تک کہ ۳ جنوری ۱۹۹۸ء کے اعداد و شمار کے مطابق سرکاری خزانے میں تقریباً ۵۰ ارب روپے جمع ہو گئے، بہت چند مہرم کی چیخیں گونئی کے مطابق ایک کھرب ۶۳ ارب ۳ کروڑ ۳۳ لاکھ روپے یورپوں سے نکل کر تری معاشی دائرے میں داخل ہو گئے، اب اس رقم سے کاروبار ہوگا، بے روزگاری ختم ہوگی، روپیہ ایک ہاتھ سے نکلا کر دوسرے اور دوسرے سے تیسرے ہاتھ میں جائے گا اور بھارت کی معاشی ترقی کی رفتار تیز ہو جائے گی۔

اس لمحے جب بھارتی اخبارات چند مہرم کو بھارت کی اقتصادی تاریخ کا ہیرو قرار دے رہے تھے، مجھے ۱۹۹۲ء کا ایک منظر یاد آرہا ہے، جب ایک ۲۲ واں گریڈ اسلام آباد کے قومی بچت کے ایک مرکز میں داخل

ہوا تو فیجر نے پلاننگ کمیشن کے ڈپٹی چیئر مین اور سابق سیکرٹری خزانہ کا کھڑے ہو کر استقبال کیا، صاحب کے لیے چائے منگوائی گئی، آپریٹر کو "میں مصروف ہوں، کوئی فون نہ ملایا جائے" کا حکم جاری کیا گیا، اسے سی جیز کر دیا گیا اور پھر بڑے ادب سے پوچھا گیا: "جی سر میرے لائق کوئی خدمت ۲۲ ویں گریڈ نے تھکسا نہ انداز میں کہا: "میرے پاس کچھ نیشنل ڈیفنس سیونگ سرٹیفکیٹ ہیں، انہیں بیچ کر پانچا جاتا ہوں۔" ۲۲ ویں گریڈ نے بریف کس کھولا اور ۶۰ ہزار کے سرٹیفکیٹ نکال کر فیجر کے حوالے کر دیئے۔ فیجر نے گھنٹی بجائی، چپڑا سی بھجوا کر کیٹیر بلوایا اور سرٹیفکیٹس اس کے حوالے کر کے رقم لانے کا حکم دے دیا، چائے آئی، مپ شپ ہوئی، لطیفے سنائے گئے، خوشامد کی گئی، اتنے میں کیٹیر رقم لے کر آ گیا، ۲۲ واں گریڈ نے نوٹ گئے تو ناگواری سے ناک سیکڑ کر بولا: "فیجر یہ تو کم ہیں" فیجر نے چونک کر کیٹیر کی طرف دیکھا، کیٹیر نے نہایت ادب سے ڈپٹی چیئر مین پلاننگ کو مخاطب کر کے عرض کیا: "جناب اس میں سے ٹکس کٹ گیا۔" ۲۲ ویں گریڈ نے مڑ کر گھور کر دیکھا تو فیجر شرمندہ سا ہو کر بولا: "سراین ڈی ایس سی پریوٹھ ٹکس لاگو ہوتا ہے۔" ۲۲ ویں گریڈ نے رقم میز پر رکھی اور کھردرے سے لہجے میں بولا: "فیجر آپ میرے سرٹیفکیٹ واپس منگوا دیں، میں انہیں چند روز بعد بیچ کر اڈاں گا۔" فیجر نے فوراً تپل دے دی۔

فٹیک چار روز بعد ۲۲ واں گریڈ دوبارہ مرکز میں داخل ہوا، سیدھا فیجر کے کمرے میں گیا اور اس کی میز پر ایک سفید کاغذ پھینک کر دھاڑا: "آفسر اب تم میری ایک ہائی نہیں کاٹ سکتے۔" فیجر نے گزبوا کر کاغذ اٹھایا اور پڑھنا شروع کر دیا، سفید کاغذ کے ایک کونے پر جلی حروف میں سنٹرل بورڈ آف ریونیو چھپا تھا، دوسرے کونے پر ٹائپ کے باریک حروف میں آرڈر نمبر 30/92 لکھا تھا، جبکہ اس کے نیچے ملک بھر کے نیشنل سیونگ سٹرز کو چیئر مین کی طرف سے واضح طور پر ہدایت کی گئی تھی کہ وہ تمام سرٹیفکیٹ جن پر زکوٰۃ کاٹی جاسکتی ہے، آج سے وٹھ ٹکس سے مستثنیٰ قرار دیئے جاتے ہیں۔ فیجر نے پریشانی کے عالم میں رومال سے پسینہ صاف کیا، گھنٹی دے کر ۲۲ ویں گریڈ کی رقم منگوائی، اس کے حوالے کی اور اسے گینت تک رخصت کرنے آیا۔

ادھر کیپیئر پر بیٹھے کلرک نے بورڈ کے چند حروف اور کچھ ہندسے دبائے اور پرنٹر سے ایک ٹیٹ نکال کر پریشان حال فیجر کو پیش کر دی۔ فیجر نے چونک کر کلرک کو دیکھا اور پھر جھٹکے جھٹکے لہجے میں پوچھا: "یہ کیا ہے؟" وہ بولا: "مرا اس شخص نے اپنے چند سوروپے بھانے کے لیے صرف ۵۰ سینکڑ میں قومی خزانے کو ۸۳ لاکھ ۲۲ ہزار ۱۳ روپے کا نقصان پہنچایا، جو اگلے برس تک اتنے ادب بن جائے گا۔"

فیجر نے السردہ لہجے میں جواب دیا: "ہاں، ان لوگوں کو پوچھنے والا کوئی نہیں۔"



آقا

ہاں، جس ملک کی ۷۰ فیصد آبادی کا "خدا" ظالم، ان پڑھ اور جاہل جاگیردار ہوگا اس ملک میں بھوک، افلاس، جہالت اور بیماری نہیں ہوگی تو کیا ہوگا؟

جی ہاں، جس ملک کی کل آبادی کا صرف ۷ فیصد حصہ اس کی ۶۰ فیصد قابل کاشت زمین پر بھجی پھیلے بیٹھا ہوگا، جس ملک کے 0.1 فیصد جاگیرداروں کے قبضہ میں ۱۵ فیصد زرخیز زمین ہوگی، جبکہ باقی 15.4 فیصد سونا زمین 1.1 فیصد جاگیرداروں کے ہاتھ میں ہوگی، جس کے پنجاب کے 0.5 فیصد شاہ، لغاری، مزاری، کھوسے، مخدوم، چودھری، ملک، نوانے اور گیلانی ۶۰ فیصد زمین کے متنازع ہوں گے، جس کے سندھ کے ایک فیصد پورے چھوٹی، جام اور شاہ ۳۰ فیصد رقبہ گے بادشاہ ہوں گے، جس کے سرحد کے 0.1 فیصد خٹک، آفریدی، نواب، الائی، میر اور باپے 12.5 فیصد زمین کے "خدا" ہوں گے، جس کے بلوچستان کے سہری، مینگل اور بگٹی ایک ایک انچ زمین کے دیوتا ہوں گے، اس ملک کے ۱۴ کروڑ عوام کی، حرارے اور باری نہیں ہوں گے تو کیا ہوئے؟

جی ہاں، جس ملک کے ۶۳ فیصد چھوٹے کاشتکاروں کے پاس صرف ۳ فیصد زمین ہوگی، جس ملک کے ۹۳ فیصد کاشتکاروں میں سے ۶۵ فیصد کسانوں کے پاس صرف ۱۵ فیصد قابل کاشت زمین ہوگی، جس کے پنجاب کے ۸۰ فیصد کسانوں کے پاس صرف ۷ فیصد نہری اور بارانی زمین کا قبضہ ہوگا، جس کے سندھ کے ۶۰ فیصد ہاریوں، چھوٹے زمینداروں اور کاشتکاروں کے پاس صرف ۱۲ فیصد زمین ہوگی، جس کے سرحد کے ۷۲ فیصد کاشتکاروں کے پاس صرف 8.2 فیصد رقبہ ہوگا اور جس کے بلوچستان کے ۹۰ فیصد کسانوں کے ہاتھ میں ایک مرلہ زمین نہیں ہوگی، اس ملک کے عوام امدادی گندم سے پیٹ نہ پالیں تو کیا کریں؟

جی ہاں، جس ملک کا سارا نہری پانی، بیج، کھاد، کپڑے مار ادویات، زرعی آلات اور بینک جاگیرداروں کے ہاتھ میں ہوں۔ جس کے گیلانیوں، مخدوموں، شاہوں، چودھریوں، لغاریوں، کھوسوں اور باسوں نے زرعی ترقیاتی بینک کے ۲۰ ارب روپے مار لیے ہوں، جس کے جاگیرداروں نے ۹۵-۱۹۹۳ء میں سپاس کی فصل سے ۳۰ ارب ۶۰ کروڑ روپے کھاد، گندم اور دانوں سے کمائے ہوں لیکن ایک روپیہ ٹیکس نہ دیا ہو،

جس کے "شہزادے" ہر سال ۴ ارب ۸۲ کروڑ ۷۷ لاکھ روپے بحروں، کتا دوزلوں، ریچھ کی لڑائیوں، بیئر بازیوں اور عیاشیوں میں ضائع کرتے ہوں، جس کے "شاہ" ہر سال ۱۱ ارب ۲۱ کروڑ کی گاڑیاں خریدتے ہوں، سو کروڑ روپے کا غیر ملکی تبا کو چھوٹکتے ہوں، جس کے "شہنشاہوں" کی شہری آبادی میں ایک کھرب ۲ ارب ۲۸ کروڑ کی جائیدادیں ہوں اور جس کے "سکندروں" کے ۱۵ لاکھ ملازمین، گارڈز اور ہر کارے ہوں، اس ملک میں بیماری، بے برکتی اور افسردگی نہیں ہوگی، تو کیا ہوگا؟

جی ہاں، جس ملک کی پارلیمنٹ، بیوروکریسی، لوکل باڈیز اور فوج پر جاگیرداروں کا قبضہ ہو، جس کے ۷۰ فیصد عوام کی گردن زمینداروں کے جیزوں میں دبی ہو، جس کی ساری معیشت فرعونوں کے قبضے میں ہو، جس کا نظریہ، جس کی سالیٹ اور جس کی بقا بے حس لوگوں کے قدموں میں پڑی ہو، اس ملک کے عوام رہنے والے کیڑے نہ بنیں تو کیا بنیں؟

جی ہاں، جس ملک کے "برہمن" نہریں نہ کھدے دیں، سکول نہ بنے دیں، مڑکیں نہ بکھنے دیں، بجلی نہ لگنے دیں، ٹریکٹر نہ چلنے دیں، دوٹ نہ ڈالنے دیں، مردم شماری نہ ہونے دیں، گاؤں میں ریڈیو نہ بجنے دیں، اخبار نہ آنے دیں، گندم نہ ہونے دیں اور سوال نہ کرنے دیں، اس ملک میں صرف شور نہ پس تو کون ہے؟

جی ہاں، جس ملک میں ۲۰ ویں صدی کی آخری ساعتوں تک قیودل ازم قائم ہو، اس ملک میں ظلم کا وہ کاروبار قائم ہو جو جاری و ساری ہے برطانیہ نے ۱۶۶۶ء میں اکھال پیچھا تھا، جسے بھارت نے آزادی کے ساتھ ہی کھل دیا تھا، جس پر پوری دنیا میں کم و بیش پابندی لگ چکی ہو، اس ملک میں لوگ گونگے، بہرے اور بے حس نہ بنیں، تو کیا بنیں؟

جی ہاں، اس وقت جب اقوام متحدہ کے اسکاٹ ڈیولپمنٹ انسٹی ٹیوٹ کے ماہرین پوری دنیا کے مطالعے کے بعد اعلان کر چکے ہوں کہ "لینڈ ریٹارمرز کے بغیر کوئی ملک ایک انچ ترقی نہیں کر سکتا۔" انسانی بہبود کے سارے عالمی ادارے اس بات پر متفق ہو چکے ہوں کہ قدرتی وسائل ضائع کرنے والے ملک زیادہ دیر تک زندہ نہیں رہ سکتے۔" دنیا بھر کے زرعی ادارے یہ بنیادی نکتہ پا چکے ہوں کہ "جو ملک اپنا ۵۱٪ اپنی زمین پر کاشت نہیں کرتے وہ بھوکے مر جاتے ہیں۔" تمام عالمی ماہرین معیشت اس نتیجے پر پہنچ چکے ہوں کہ "جس ملک کے کمانے والے ٹکس نہیں دیتے وہ چل نہیں سکتے۔" کہہ ارض کے تمام سماجی دانشوروں کا متفقہ فیصلہ ہو کہ "جس ملک میں مزدوروں، کسانوں اور کارکنوں کی کمائی سست الوجود، جاہل، حریص جاگیردار، سرمایہ دار اور کارخانے دار کھا جاتے ہوں، وہاں ترقی نہیں ہوتی۔" ہاں ۲۱ ویں صدی میں بھی جس ملک میں جاگیرداری نظام اپنے پورے گروفر سے چل رہا ہوں وہاں بھوک، الماس، جہالت اور بیماری نہ ہو تو کیا ہو؟

ہاں قارئین کرام! میں جب بھی اس ملک کی دم توڑتی معیشت پر نظر ڈالتا ہوں، عام آدمی پر جرحتا ہوا دباؤ محسوس کرتا ہوں، تمام بنیادی اداروں کو برباد ہوتے دیکھتا ہوں، ملک سے شہریوں کی کمٹنٹ کمزور

ہوتے، انہیں ضروریات زندگی کے ہاتھوں خوار ہوتے، روزگار، صحت اور تعلیم کے پیچھے بھاگتے دیکھتا ہوں تو سوچتا ہوں خرابی کہاں ہے؟ کیا اس ملک میں ہاتھ سے کام کرنے والوں کی کمی ہے، کیا اس ملک میں سوپنے اور منصوبہ بندی کرنے والے دماغ نہیں ہیں؟ کیا اس ملک میں زمین نہیں، کیا اس ملک میں زمین کو زرخیز بنانے کے لیے پانی نہیں، کیا اس ملک میں چاروں موسموں نہیں، کیا اس ملک میں بیج کو نمودینے والی ہوا نہیں چلتی اور کیا اس ملک پر فصل پکانے والا سورج طلوع نہیں ہوتا؟

ہاں قارئین کرام! یہاں زمین ہے، ہوا ہے، پانی ہے، بیج ہے، بونے اور کاٹنے والے ہاتھ ہیں لیکن اس کے باوجود بھوک ہے، محتاجی ہے "کل کیا ہوگا؟" کے اندیشے ہیں، کبھی آپ نے سوچا ایسا کیوں ہے؟ جی ہاں، جب اللہ کی زمین پر جاگیر دار فرعون بن کر قابض ہوگا تو کھیتوں میں بھوک نہیں اُگے گی تو کیا اُگے گا؟ مجھ سے یہ بیزار، افسردہ اور پریشان حال نظریں پوچھتی ہیں، اللہ نے جو زمین اپنے بندوں کے لیے تخلیق کی اسے فرعونوں سے چھروانے کے لیے کوئی موسیٰ آئے گا۔ میں جواب دیتا ہوں نہیں، جو قومیں اپنے سے بدتر، جاہل اور بدکردار لوگوں کو اپنا آقا بنا لیں، ان کے لیے کبھی کوئی موسیٰ نہیں اُترا کرتا۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

کاشف ازاد

”دو گھنٹے“

کاش دیکھنے، سننے اور دلوں کے مجید پانے والا رب ۵۸ برس، ۸ ماہ اور ۱۵ روز بعد بھی ایک بار منو پارک کی طرف دیکھ لیتا، بینار پاکستان کے سائے میں کھڑی بے نظیر کی پکار سن لیتا، دلوں میں چھپے خوف کو دعا سمجھ کر قبول کر لیتا اور جوں کی کرسیوں پر واقعی طالبان بٹھا دیتا تو اس ملک کے لیے، اس ملک کے پونے چودہ کروڑ سکتے، ریگلتے، ترپتے لوگوں کے لیے اس سے بڑا انعام کیا ہوتا؟

میں آج سے چھ ماہ پہلے کابل کی ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں داخل ہوا تو سامنے قالین کے پوشیدہ نکلنے پر ایک سرخ و سپید ”جوان“ بیٹھا تھا، اس کے سامنے پڑے پیالے سے بھاپ اٹھ رہی تھی، کوٹھری میں قبوہ کی خوشبو پھیلی تھی وہ مجھے دیکھ کر اٹھا، نقل گیر ہوا، شفقت سے سامنے بٹھایا، ایلو کیم کی کیتلی سے کیٹی منی کے پیالے میں قبوہ انڈیا، میرے سامنے رکھا، رات کا خشک باسی نان توڑ کر آدھا مجھے پیش کیا اور باقی قبوہ سے میں ڈبو کر خود کھانے لگا، مجھ سے نان کا وہ نکلنا لگا، نہ گیا تو وہ شرمندہ سا ہو کر بولا ”معاف کرنا بھائی ہمارے پاس آپ کی خدمت کے لیے اس وقت اور کچھ نہیں۔“ افغان اسی شرمندہ لہجے والے شخص کو امیر المومنین کہتے ہیں، اس جوان کو جو میرے سامنے بیٹھ کر اس رغبت سے سوکھا نان کھا رہا تھا جیسے وہ پیرس کے کسی بیڑا ہاؤس کا کوئی شبکار ہو، میں نے سوچا یہ واقعی اسی اعزاز کا لال ہے کیونکہ حضرت عمر بن عبد العزیز کے بعد یہی وہ شخص ہے جس کے دروازے پر کوئی دربان نہیں، جس کا کوئی بھی افغان راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے، جس کی خوراک وہی سوکھا، نان اور آدھا پیالہ قبوہ ہے جو اس وقت اس کے تمام ساتھیوں کے سامنے رکھا ہے۔

میں اس کوٹھری سے باہر نکلا تو میں نے وہاں ایک عجیب کابل دیکھا، ایک ایسا پرسن، مطمئن اور شاداں کابل جسے دیکھ کر کوئی سوچ بھی نہیں سکتا کہ یہی وہ شہر ہے جس کے ٹیلی ویژن سنٹر سے ۳۱ برس تک بیوہ لائیں نشر ہوتی رہیں، جہاں ۱۳ برس تک روسی فوجی افغان جرنیلوں کی بیویاں اٹھا کر کیپوں میں لے جاتے رہے، جہاں برسوں تک روسی کرنیلوں کے خیموں سے افغان وزراء، امراء اور سزاء کی بیوی بیٹیوں کے بین سنائی دیتے رہے، جہاں سے جب روسی پلٹے تو وہاں ایک ایسی ”پاسٹرل جرنیشن“ پیدا ہو چکی تھی جن کے چہروں پر ہکرائن کے نقش جھلکتے تھے، جہاں ۱۹۹۵ء کے آخر تک روٹی ملتی نہ ملتی لیکن واڈ کا کی بوتلیں اور بیئر کے ٹین ضرور

ملنے تھے، جہاں جہاد کے بعد آپس میں برسرِ پیکار ”مجاہدین“ دوسرے کمانڈر پر شب خون مار کر اس کے علاقے سے لڑکیاں اغمالے جاتے تھے، جہاں ایک چودہ سالہ لڑکے کے ”حقوق ملکیت“ پر دو مقدمہ جاری کمانڈروں میں ٹینگوں کی لڑائی ہوئی تھی، جہاں مجاہدین کے ایک کیمپ میں چار چار سال کی بچیوں سے گینگ ریپ ہوا تھا، جہاں مجاہدین کے ایک ٹھکانے سے خواتین کی ۲۳ برہنہ لاشیں برآمد ہوئی تھیں، جہاں ”مجاہدین“ کے خوف سے لوگ خواتین اور نابالغ بچوں کے ساتھ کوئٹہ سے چمن تک سفر نہیں کرتے تھے، جہاں سارے محل، حویلیاں، کولھیاں، کھیت اور باغ مال غنیمت کی طرح ہانٹے جا چکے تھے۔

میں نے میزبان سے پوچھا ”آپ نے چوتھائی صدی سے جگڑے اس معاشرے پر کیا پڑھ کر پھونکا کہ پچھلے دو برس سے یہاں کوئی چوری نہیں ہوئی، چیزوں کے نرخ اوپر نیچے نہیں ہوئے، کسی نے کسی کا گھانٹا نہیں کھانا، کسی نے خواتین کی طرف آنکھ بھر کر نہیں دیکھا، کسی نے جھوٹ نہیں بولا، کسی چیز پر ناجائز قبضہ نہیں ہوا۔“ میزبان نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”کچھ بھی نہیں، ہم نے تو صرف انصاف قائم کیا، معاشرہ خود ہی سدھر گیا۔“ میں نے پوچھا ”کیسے؟“ بولا ”بہت ہی سیدھے طریقے سے، ہم نے اعلان کیا آج کے بعد جس نے جرم کیا وہ خود کو قرآن و سنت کے مطابق سزا کے لیے تیار پالے اور بس“ میں نے عرض کیا ”ذرا مثالیں دے کر تو واضح کریں۔“ میزبان نے اسی اطمینان سے جواب دیا ”ہاں کیوں نہیں، ہم نے اعلان کیا جن کی زمینوں، جائیدادوں پر دوسرے لوگ قابض ہیں وہ جھوٹ لے کر آجائیں ہم دو گھنٹوں میں قبضہ دلا دیں گے، لوگ آگئے، ہم نے واقعی دو گھنٹے میں ان کی جائیداد کا قبضہ دلا دیا، ہم نے قاتل پکڑا، دو گھنٹے میں فیصلہ کر کے قاریغ کر دیا، ہم نے گمراہ فرس پکڑا، پکڑ کر دو گھنٹے میں الزلہ لگا دیا، کوئی چور ہمارے گھر چڑھا، ہم نے دو گھنٹے میں ہاتھ کاٹ کر دوسرے ہاتھ میں پکڑا دیا اور بس امن ہی امن، سکون ہی سکون۔“ میں نے پوچھا ”ان چنگیزی اقدامات کا کیا نتیجہ نکلا؟“ بولا ”ہم نے کانڈ کے گزروں پر کچی فسل سے ہند سے لکھ کر کہا، یہ نوٹ ہیں، پورے دو سال تک لوگوں نے انہیں نوٹ سمجھا افغانستان میں انہی سے ساری خرید و فروخت ہوئی، کابل میں لکسی کا نظام ایک ۱۶ برس کے بچے کے حوالے کر دیا، آج تک کوئی شکایت نہیں آئی، نرخ پر اس قدر قابو ہے کہ کابل یونیورسٹی کا پروفیسر ہزار روپے تنخواہ میں گزارہ کرتا ہے، گورنر صبح سے شام تک سڑکوں پر گشت کرتے ہیں، کوئی بھی شخص انہیں روک کر شکایت کر سکتا ہے، جن کا ازالہ فوراً ہوتا ہے۔“ میں نے پوچھا ”آپ لوگ دو گھنٹے میں انصاف کیسے کر لیتے ہیں؟“ اس نے ہنس کر کہا ”منصف کی نیت صاف ہو اور دل میں ایمان کی رتی موجود ہو تو انصاف کے لیے دو گھنٹے بھی دو صدیاں ہوتی ہیں۔“

کاش دیکھنے، سننے اور دلوں کے بھید جاننے والا رب ۵۸ برس، ۸ ماہ اور ۱۵ روز بعد بھی ایک پارمنٹو پارک کی طرف دیکھ لیتا، مینار پاکستان کے سائے میں کھڑی بے نظیر کی پکار سن لیتا، دلوں میں چھپے خوف کو دعا سمجھ کر قبول کر لیتا اور تجوں کی کرسیوں پر طالبان، بشاد دیتا تو اس ملک کے لیے، اس ملک کے پونے چودہ کروڑ

سکتے، رہ گئے، تڑپتے لوگوں کے لیے اس سے بڑا انعام کیا ہوتا؟
 کاش بے نظیر شکوے سے پہلے یہ حقیقت جان لیتی کہ یہ خوف نہیں، خواب ہے، ان لوگوں کا خواب
 جو دو گھنٹوں میں انصاف چاہتے ہیں، اس سے قطع نظر کہ یہ انصاف انہیں سچ دیتے ہیں یا طالبان!

(نوٹ: یہ کالم ۲۸ نومبر کو عوامی اتحاد کے جلسے میں بے نظیر کے اس خطاب سے متاثر ہو کر لکھا گیا جس میں محترم نے
 غدش ظاہر کیا تھا "جوں کی کرسیوں پر طالبان کو بٹھانے کا پروگرام بن چکا ہے۔"



Kashif Azad @ OneUrdu.com

کہیں ایسا نہ ہو جائے

مکمل کنکھ تو مناسب نہیں کیونکہ جیسے بھی ہیں آخر ہیں تو دوست ہی!

فکری طور پر پورے امریکی ہیں، عالمی بینک کے ملازم ہیں، ڈالروں میں تنخواہ لیتے ہیں، سال کے دس ماہ واشنگٹن میں گزارتے ہیں، دو مہینے تیسری دنیا کی زبانوں میں گزارتے ہیں، پاکستان جیسے چھوٹے ممالک میں بسر کرتے ہیں، ماں اور بیوی دونوں امریکی ہیں، بچے کچھ کچھ دیسی اور زیادہ زیادہ "ولانتی" ہیں پاکستان کے ساتھ تعلق کی وجہ ان کے والد ہیں جو منڈی زمان کے رہنے والے تھے کہیں بہت پہلے غربت سے مجبور ہو کر امریکہ چلے گئے تھے جہاں انہوں نے "باغزت امریکی" کہلانے کے لیے "میم" سے شادی کر لی چند برس کی اس رفاقت کی "ڈاؤن پلٹ" میرے یہ دوست ہیں جن کی پیدائش کے بعد ان کا کوئی دوسرا بہن بھائی اس لیے روئے زمین پر تشریف نہ لاسکا کہ یہ ابھی ہسپتال ہی میں تھے تو ان کا نام رکھنے پر ان کے والدین میں جھگڑا ہو گیا جس کا انجام "ادھر تم ادھر ہم" نکلا۔ خود بتاتے ہیں۔ "ماما اپنے آنجھانی کتے کی یاد میں میرا نام جم رکھنا چاہتی تھیں لیکن پاپا اپنے والد کی مناسبت سے راؤ ریاست علی۔ دونوں جب دو گھنٹے کی عمر کے بعد کسی فیصلے پر نہ پہنچ سکے تو انہوں نے علی گہ کی فیصلہ کیا۔" بہر حال ان تمام عارضوں کے باوجود وہ خود کو پاکستانی سمجھتے ہیں جس پر ہم تمام احباب کئی بار ان کا شکریہ ادا کر چکے ہیں۔

پچھلا پورا مہینہ پاکستان میں گزارا آئیٹیل ٹور پر تھے پاکستان کی اقتصادی بد حالی پر رپورٹ مرتب کرتے رہے، کرپشن اور لوٹ کھسوٹ کی وجوہات تلاش کرتے رہے جب اس کڑے تحقیقی کام سے فارغ ہوئے تو بہت مسرور تھے میں نے وجہ پوچھی تو ہاتھ پر ہاتھ رگڑ کر بولے "میں نے آخر کار پاکستان کے معاشی بحران کی وجوہات تلاش کر لی ہیں۔" میں نے پریشان ہو کر پوچھا "کیا مطلب؟" بولے "بھائی میرے پاکستان کے دو بڑے اقتصادی مسئلے ہیں یہ حل ہو جائیں تو ملک ڈیفالٹ سے بچ سکتا ہے!" پوچھا "دو مسئلے کون کون سے ہیں؟" بولے "سرکاری ملازمین اور سرکاری منصوبے" عرض کیا "اگر کچھ تفصیل مل جائے تو بچے دعا میں دیں گے۔" ملی تقاضا سے بولے "پاکستان ہر ماہ سرکاری ملازمین پر اربوں روپے خرچ کرتا ہے، لیکن یہ ملازمین ایک دھیلے کا کام نہیں کرتے، تم وفاق کو دیکھو تھو سو سرکاری ادارے فیڈرل کپینل کے زیرِ اہتمام کام

کر رہے ہیں جن میں دس لاکھ ملازمین ہیں ان چھ سو اداروں میں سے صرف چار ادارے اپنے اخراجات پورے کر رہے ہیں، پورے پاکستان میں ایک سو دس بڑے سرکاری ادارے ہیں جن میں چھ لاکھ ۶۰ ہزار ملازمین ہیں۔ یہ سارے ادارے ہر سال حکومت سے ایک سو ارب روپے وصول کرتے ہیں لیکن جواب میں ایک روپیہ تک نہیں لوٹاتے، پنجاب میں آٹھ لاکھ نوے ہزار اور سندھ میں چار لاکھ پینتالیس ہزار افراد سرکار سے تنخواہیں لیتے ہیں لیکن کام ایک دھیلے کا نہیں کرتے۔ اور منصوبے؟ میں نے ان کی بات کاٹ کر پوچھا ”ہاں منصوبے“ انہوں نے سر ہلایا ”پاکستان میں ۱۴۵ ایسے منصوبے ہیں جو ہر سال اربوں روپے کھا جاتے ہیں لیکن ان سے دوسو روپے کی آمدنی نہیں ہوتی۔“ میں نے پوچھا ”اگر یہ بیس پچیس لاکھ ملازمین فارغ کر دیئے جائیں اور یہ ۴۵ منصوبے بند ہو جائیں تو پاکستان کی اکانومی آسان سے باتیں کرنے لگے گی، غربت، بے روزگاری اور مہنگائی ختم ہو جائے گی؟“ انہوں نے پورے جوش سے گردن ہاں میں ہلا دی۔

کچھ دیر کے سکوت کے بعد میں نے جم (ہم انہیں ان کی والدہ کے آنجنابی جم کی یاد میں جم ہی کہتے ہیں) سے عرض کیا ”لیکن نہیں دوست نہیں، میرا خیال اس سے مختلف ہے میں سمجھتا ہوں، یہ دنیا جس میں ۸۴ کروڑ لوگ خوراک کی کمی کا شکار ہیں، ایک ارب ۳۰ کروڑ لوگ پناہ گاہوں سے محروم ہیں ۴۰ کروڑ لوگ بے گھر ہیں ۸ کروڑ بچے گلیوں میں آوارہ بھر رہے ہیں، یہ دنیا جنت بن سکتی ہے اگر یورپ اور امریکہ اپنے لائف سٹائل میں ذرا سی تبدیلی کر لے۔“ وہ پریشان ہو کر بولے ”کیا مطلب؟“ میں نے عرض کیا ”ہم بھری جان، غربت، بیماری اور جہالت سے تنہا ہی دنیا میں جہاں پاکستان جیسے ملکوں کا سالانہ بجٹ چھ سات ارب ڈالر سے زیادہ نہیں ہوتا صرف یورپی اور امریکی باشندے سالانہ چار سو ارب ڈالر کی خشیات استعمال کرتے ہیں۔ یورپ میں ہر سال ایک سو پانچ ارب ڈالر کی شراب لی جاتی ہے، یورپ گیارہ ارب ڈالر کی سالانہ آئس کریم کھا جاتا ہے، صرف یورپ میں بارہ ارب ڈالر کے پرفیوم خریدے جاتے ہیں امریکہ میں کتوں کی خوراک پر سترہ ارب ڈالر خرچ ہوتے ہیں، جاپان اور امریکہ کے تاجر بزنس انٹرنیشنل منٹ پر پینتیس ارب ڈالر ضائع کرتے ہیں، امریکہ کے ۶۰ افراد کے پاس تین سو گیارہ ارب ڈالر ہیں، دنیا کے تین امیر ترین افراد کے اثاثے پورے افریقہ کی مجموعی دولت سے زیادہ ہیں اور دنیا کے صرف ۲۲۵ افراد کے پاس دنیا کی ۴۷ فیصد آبادی کا رزق ہے۔“ جم نے بے چین ہو کر پوچھا ”تم کہتا کیا چاہتے ہو؟“ میں نے مسکرا کر جواب دیا ”میں عرض کر رہا ہوں میرے دوست اگر یورپ اور امریکہ شراب پینی بند کر دے خشیات کا استعمال ترک کر دے، ایک سال کے لیے آئس کریم اور پرفیوم خریدنا بند کر دے اور صرف دو برس کے لیے کتوں کو کتے سمجھ لے تو پاکستان جیسے ۱۲۱ ممالک بھوک، بیماری اور غربت سے بچ سکتے ہیں ورنہ۔۔۔۔۔“ ورنہ؟“ اس نے مزید پریشان ہو کر پوچھا۔ ”ورنہ تم لوگ جس طرح تیسری دنیا کے سرکاری ملازمین کو فارغ کرانے کا پلان بنا رہے ہو، مجھے خطرہ ہے آنے والے برسوں میں کہیں یہ محروم ملک ایسے لشکروں کی فیکٹریاں نہ بن جائیں جو دنیا میں ہر آئس کریم کھانے

والے کا منہ نوچ لیں، ہر خوشہ لوگانے والے کو جلا دیں اور ہر شرابی کا خون پی جائیں..... آخر عدم مساوات، بے انصافی اور وسائل کی غلط تقسیم کے سمندر میں اٹھنے والی غربت کی ان موجوں نے کسی نہ کسی ساحل سے تو ٹکراتا ہے۔"



Kashif Azad @ OneUrdu.com

چیلوں کے گھونسلے

چلنے والے فرسٹ راج عزیز سی بی آر کے لیے نیا چیئر مین "درآمد" کرنے میں کامیاب ہو ہی گئے، ایک ایسا چیئر مین جو حکومت سے ماہانہ ۱۸ لاکھ (۸ لاکھ تنخواہ، ۱۰ لاکھ کی مراعات) روپے وصول کرے گا، ایسا چیئر مین، جو براہ راست وزیر اعظم کو جوابدہ ہوگا، ایسا چیئر مین جو ملازم رکھنے اور پرانے ملازمین فارغ کرنے میں مکمل با اختیار ہوگا، ایسا چیئر مین جو باقاعدہ سودے بازی کے بعد پاکستان آیا۔

ہاں، جناب معین الدین، اس بے نظیر بھنو سے ٹیکس وصول کریں گے، جس کی تیسری الٹی کی صرف ایک انگوٹھی ایک لاکھ ڈالر میں خریدی گئی جس کے ایک ٹیکس کی قیمت ایک لاکھ پاؤنڈ ہے لیکن وہ ٹیکس صرف ۳۲ ہزار ۸ سو ۸ روپے دیتی ہیں، اس آصف علی زرداری سے ٹیکس وصول کریں گے جس کے اصل میں ساٹھ لاکھ کے ادھنٹائی گھوڑے تھے، دس دس لاکھ کے اونٹ، چار چار لاکھ کے کتے اور چالیس چالیس ہزار کی بھینز تھیں، جو براعظم سرحد پر سفر کرتے تھے لیکن انکم ٹیکس کے فارم پر سفر انکم لکھ کر ٹیکس دینے سے انکار کر دیتے ہیں۔ ان نواز شریف سے ٹیکس وصول کریں گے جو وزیر اعظم ہاؤس کے اخراجات اپنی جیب سے ادا کرتے ہیں، لیکن ٹیکس صرف ۲ ہزار ۶ سو ۸ روپے ادا کرتے ہیں۔ ان شہباز شریف سے ٹیکس وصول کریں گے جن کی امارت کے قصبے ہر زبان پر ہیں لیکن ٹیکس صرف ۸ سو ۹ روپے دیتے ہیں۔ ان انور سیف اللہ سے ٹیکس وصول کریں گے جن کے لان میں دو دو لاکھ کے کتے چلتے ہیں لیکن ٹیکس ۳ ہزار روپے دیتے ہیں۔

ہاں، جناب معین الدین ان اکبر بگٹی سے ٹیکس وصول کریں گے جن کے باڈی گارڈز کی تعداد اڑھائی سو ہے لیکن انکم صفر، ٹیکس صفر۔ ان نواب ذوالفقار علی بھٹو سے ٹیکس وصول کریں گے جو گنگی قبیلے کے سردار ہیں، ہر ماہ کروڑوں روپے کماتے ہیں لیکن انکم صفر، ٹیکس صفر۔ ان سردار فاروق احمد لغاری سے ٹیکس وصول کریں گے جو چوٹی میں کروڑوں کا "ایوان صدر" تعمیر کرتے ہیں، مہران بینک خالی کر دیتے ہیں، کروڑوں روپے کی کپاس کاشت کرتے ہیں لیکن انکم صفر، ٹیکس صفر۔ ان شیخ عزاری سے ٹیکس وصول کریں گے، جن کے طرز، ہائٹس میں نوابوں کی جھلک ہے لیکن انکم صفر، ٹیکس صفر، ان فیصل صالح حیات سے ٹیکس وصول کریں گے، جن کے سرید ہر سال کروڑوں روپے کے چڑھاوے چڑھاتے ہیں لیکن انکم صفر، ٹیکس صفر۔ ان این ڈی خان

سے ٹیکس وصول کریں گے، جن کے ہوٹل کے بل لاکھوں سے تجاوز کر جاتے ہیں لیکن انکم صفر، ٹیکس صفر۔ ان ضیف راے سے ٹیکس وصول کریں گے، جن کے بچن کا ماہانہ خرچ ایک لاکھ روپے سے بڑھ جاتا ہے لیکن انکم صفر، ٹیکس صفر۔

ہاں، جناب معین الدین ان جاگیرداروں سے ٹیکس وصول کریں گے، جو لنڈی کوتل سے گواد اور واہگہ سے چمن تک پھیلے ہیں۔ جو چودھری، ملک، مخدوم، لغاری، کھوسہ، نواب، بگٹی، میٹگل، بگٹی، تاپور اور شاہ کہلاتے ہیں، جن کی زمینوں پر لاکھوں حزار سے جانوروں جیسی زندگیاں گزار رہے ہیں، جن کے بچے دنیا کی مہنگی ترین درس گاہوں میں تعلیم حاصل کرتے ہیں، جو ہر سال کروڑوں روپے طوائفوں پر لٹاتے ہیں، جن کی رہائش گاہیں چاروں صوبائی مراکز اور وفاقی دارالحکومت میں ہیں، جو ہر سال یورپ میں چھٹیاں گزارنے جاتے ہیں، جو مہمانوں کو لاکھوں روپے کا ”روٹی کرز“ کھلا دیتے ہیں، جن کے کتے، گھوڑے، اونٹ اور بیلر ویسی سچی، انڈوں، مربیوں اور مرسل وافر پر پلتے ہیں، جو ہر سال ۸۰، ۸۰ لاکھ کی گاڑیاں خریدتے ہیں لیکن مجموعی طور پر صرف ۲۲ لاکھ روپے سالانہ ٹیکس ادا کرتے ہیں۔

ہاں، جناب معین الدین ان کھرب پیوں سے ٹیکس وصول کریں گے، ان ارکان پارلیمنٹ، ان پشتی امراء اور ان جنرلوں سے ٹیکس وصول کریں گے جن کی امارت کی کوئی حد نہیں، جن کی انگی سناٹا ہشتیس دودھ سے نہا سکتی ہیں، سونے کے نوالے کھا سکتی ہیں، چاندی کے پتنگ پر استراحت فرما سکتی ہیں، لیکن ان سے زیادہ ٹیکس کراچی کا ایک وکیل خالد اسحاق دیتا ہے (۹۳-۱۹۹۳ء میں ۵۸ لاکھ روپے ٹیکس دیا تھا)۔

ہاں، جناب معین الدین اس ملک سے ٹیکس وصول کریں گے، جہاں ۱۳ کروڑ لوگوں میں سے صرف ۷ لاکھ افراد ٹیکس ادا کرتے ہیں (حکومت ۱۵ لاکھ کا دعویٰ کرتی ہے) جہاں ۸۵ فیصد ٹیکس وٹیر سرکاری اور نجی ملازمین ہیں۔ (ان لوگوں کا ٹیکس بھی تنخواہوں سے کتنا ہے) جہاں انکم ٹیکس کا چھوٹے سے چھوٹا ملازم بھی لاکھوں روپے کی پراپرٹی کا مالک ہے۔ ذاتی گاڑی پر دفتر آتا ہے، بچوں کو مہنگے ترین اداروں میں تعلیم دلاتا ہے، جہاں اسے سی انکم ٹیکس کی سیٹ پیچاس پیچاس لاکھ میں فروخت ہوتی ہے، جہاں ہر ٹیکسری، ہر ادارے اور ہر سینھ نے ٹیکس بچانے کے لیے چارٹرڈ اکاؤنٹنٹس ملازم رکھے ہوئے ہیں۔

ہاں، جناب معین الدین اس ملک کے کس فرد سے ٹیکس وصول کریں گے، انہیں مجنو ٹیکس دیں گے، لغاری، مزاری، کھوسہ، بگٹی، میٹگل، مخدوم اور شاہ ٹیکس دیں گے۔ کیا سین، ولیکا، سینھ، میاں اور بٹ ان کے سامنے اپنی ساری آمدنی کھول کر رکھ دیں گے۔

ہاں، جناب معین الدین کو ان لوگوں سے کچھ نہیں ملے گا۔ کیا چوروں نے بھی کبھی زکوٰۃ دی ہے؟ جیلوں کے گھونسلوں سے بھی کبھی ماس ملا ہے؟ ویک نے بھی کبھی لکڑی کی حفاظت کی ہے؟

ہاں، معین الدین تو ۱۸ لاکھ والے چھوٹے سے معین الدین ہیں۔ یہاں ۱۸ کروڑ والے بڑے سے

معین الدین بھی آجائیں تو کچھ حاصل نہیں ہوگا کہ دنیا کا کوئی شخص پتھروں سے رس نہیں نچوڑ سکتا۔

(نوٹ: اس کالم کے تمام اعداد و شمار سی بی آر کی انکم ٹیکس ڈائریکٹری ۹۳-۱۹۹۳ء سے لیے گئے ہیں اب ۱۹۹۷ء تک ان لوگوں کے ادا کردہ ٹیکسوں میں چند سو روپے کا اضافہ ہو چکا ہے۔)



Kashif Azad @ OneUrdu.com

ٹیکس چوری

اپریل ۱۹۷۰ء کی ایک سہ پہر کو جب اپالو ۱۳ زمین کی قید سے آزاد ہو کر چاند کی حدود میں داخل ہوا تو کیپ کیونرل کے محلے نے اطمینان کا طویل سانس لیا۔ طبعی ماہرین نے ہیڈ فون اتارے، سکرین کی روشنیاں مدھم کیس اور نشستوں سے ٹیک لگا کر چند لمحوں کے لیے آنکھیں بند کر لیں، چاند گاڑی کے کل پرزوں کے ماہرین نے سکرین سے نظریں ہٹائیں اور کافی کی ہلکی ہلکی چسکیاں لینے لگے۔ فیول کا جائزہ لینے والے بھی تانیاں ڈھیلی کر کے لیے لیے سانس لینے لگے۔ رہے آکسیجن پلانٹ کے ماہرین تو انہوں نے لان میں چہل قدمی کا پروگرام بنانا شروع کر دیا، لیکن اس سے پہلے کہ یہ لوگ اپنی جگہ چھوڑتے، خطرے کے الارم بج اٹھے، ہنگامی بتیاں تیزی سے جلنے لگیں، گیس کے بعد کنٹرول روم کے ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک برقی رو دوڑ گئی، ساری سکرینیں آن ہو گئیں، سارے ہیڈ فون، سارے مائیکروفون زندہ ہو گئے۔

ہینٹل پر بیٹھے چیف نے مائیک آن کیا اور زمین سے چاند تک ایک ہلکی لیکن با اعتماد آواز کو سنے لگی: ”جم آر یو آل رائٹ؟ جم ویز آر یو، وی وائٹ نوٹس یو جم..... اور“ چیف کے خاموش ہوتے ہی پسٹیکر آن ہوئے اور ایک جھلکے سے شور کے ساتھ چاند گاڑی کی سرکشی ٹیم کے سربراہ جم لول کی گھبراہٹی ہوئی آواز سنائی دی: ”ہمارا آکسیجن ٹینک پھٹ چکا ہے، اب جم اور ہماری ٹیم چند ہی لمحوں کے مہمان ہیں.....“ چیف نے جم لول کی بات مکمل ہوتے ہی ایمرجنسی کا بٹن دبا دیا، جس کے ساتھ ہی کیپ کیونرل کے اندر ہنگامی صورتحال کا اعلان کر دیا گیا۔ امریکی صدر کو اطلاع کر دی گئی۔ سرکشی ٹیم کے لواحقین کو لانے کے لیے گاڑیاں بھیج دی گئیں اور نیلی ویشن کے ذریعے پوری دنیا سے خلا نوردوں کے لیے دعا کی اپیل کر دی گئی جبکہ ہینٹل پر بیٹھے ماہرین جم کو آکسیجن کا متبادل نظام وضع کرنے کی ہدایات دینے لگے۔ فلاں جگہ سے پائپ نکالو، اسے فلاں شہین کے ساتھ فٹ کر دو، فلاں جن آن کرو، ساری بتیاں بجھا دو، بجلی پچاؤ، بیئر بند کر دو، لیکن آکسیجن تھی کہ کم سے کم ہوتی جا رہی تھی یہاں تک کہ کنٹرول روم کا ہر فرد تینوں خلا نوردوں کی طرف قدم بہ قدم بڑھتی سوت کی چاپ خننے لگا۔

اچانک ہینٹل پر جم کی آواز گونجی: ”مسٹر پال آج کیا تاریخ ہے؟“ چیف نے جن دبا دیا، مائیک آن کیا

اور تاریخ بتا کر کہا: ”جم یہ تاریخ پوچھتے نہیں، تاریخ بنانے کا وقت ہے؟“ ”پال میں مارا گیا۔“ جم کی گھبراہٹ ہوئی آواز آئی۔ ”کیسے؟“ چیف نے پوچھا۔ ”یاد آج آگم ٹیکس کی ریٹرن فائل کرنے کی آخری تاریخ تھی لیکن میں بھول ہی گیا، مجھے تو کورٹ سے سزا ہو جائے گی۔“ جم کی آواز میں گھبراہٹ اور افسردگی تھی، سب نے سر ہلکے لیے چیف نے آکسیجن کے میٹر پر نظر ڈالی، سونیاں آخری حدود کو چھو رہی تھیں، اس نے گردن کو جھٹکا دیا اور ہینٹل کا ایک بٹن پریس کر کے بولا: ”مسٹر پریذیڈنٹ میں کیپ کیونرل کنٹرول روم سے بول رہا ہوں، آپ جم لودل کی آواز سن رہے ہیں، اگر اسے فوری ریلیف نہ دی گئی تو تینوں خلا نورد خلائی میں محمد ہو جائیں گے، ورنہ اسے میٹر آف تھری لائنس سر۔۔۔ اور“ چند ساعتوں تک دوسری طرف مکمل خاموشی رہی، پھر اچانک ہینٹل پر صدر ٹیکس کی آواز گونجی، ”پال میں اپنے خصوصی اختیارات استعمال کرتے ہوئے تمہیں اجازت دیتا ہوں، جم لودل کو خوشخبری سنا دو، وہ چاند مٹن سے واپسی پر اپنی ریٹرن فائل کر دے، میں ٹیکس چیف سے اس کی خصوصی سفارش کروں گا۔ اور“

اس کہانی کا کوئی نہیں روکتے ہیں اور کیپ کیونرل کے کنٹرول روم سے نکل کر پاکستان آتے ہیں، جہاں ہمارے ایک ریٹائرڈ جنرل جب پورے وزیر داخلہ تھے تو انہوں نے آگم ٹیکس کے فارم پر آگم کے خانے میں سفر لکھا، ٹیکس کے خانے کو گراس کیا اور دستخط کر کے فارم اپنے پی ایس کے حوالے کر دیا اور بھول گئے۔ تقریباً چھ ماہ بعد وزیر داخلہ نے پٹا دور میں ایک جائیداد خریدی جس پر ہینٹل ویلیو ٹیکس (سی وی ٹی) لگا ہوتا تھا (جائیداد کی تفصیل ریکارڈ میں موجود نہیں) جنرل نے فون اٹھایا اور سی بی آر کے چیئرمین کو دفتر آنے کا حکم دیا۔ حکم حاکم کا تھا، لہذا چیئرمین فوراً حاضر ہو گیا۔ وزیر داخلہ نے چیئرمین کو حکم دیا: ”مجھے سی وی ٹی سے اسٹی کا سرٹیفکیٹ چاہئے، آپ کل بجھوا دیجیے گا۔“ چیئرمین نے ”جو آپ کا حکم سر“ کہہ کر بیٹے پر ہاتھ رکھا اور تھوڑا سا جھک کر اجازت چاہی۔

چیئرمین دفتر آیا اور آکر متعلقہ حکام کو حکم کی بجا آوری کی ہدایت کر دی، ممبر نے اسٹنٹ کو بلا کر کہا، اسٹنٹ نے جا کر جنرل کی فائل نکلائی تو پتا چلا وزیر داخلہ نے تو صفر آگم ظاہر کر رکھی ہے اور سی وی ٹی سے اسٹنٹ کا سرٹیفکیٹ صرف انہیں دیا جاسکتا ہے جو آگم ٹیکس ادا کرتے ہیں۔ اسے ڈی نے ممبر کو اطلاع کر دی تو ممبر نے جا کر معاملہ چیئرمین کے گوش گزار کیا، پھر چیئرمین نے ڈرتے ڈرتے وزیر داخلہ کو اس ”قانونی معذوری“ سے مطلع کیا تو جواب آیا ڈرا آپ چند لمحوں کے لیے میرے دفتر تشریف لائیں۔ چیئرمین چلا گیا، واپس آیا تو اس کے کان سرخ تھے اور ٹھوڑی سے پسینہ ٹپک رہا تھا، اس نے آتے ہی بجلی میٹنگ بلائی۔ سی بی آر کے اعلیٰ دماغ جمع ہوئے، ٹیکس تو انہیں کی ساری کتابیں میز پر جمع کی گئیں، کافی کا آرڈر دے دیا گیا، ٹیلی فون بند کر دیئے گئے اور سارا اعلیٰ کسی ایسی دفعہ کی تلاش میں سرگرداں ہو گیا جسے تو زمر و زمرہ وزیر داخلہ کے لیے سرٹیفکیٹ کا جواز پیدا کیا جاسکے، لیکن رات گئے تک ایسی کوئی دفعہ ہاتھ نہ آئی، سب تھک گئے، سب کرسیوں پر

امیر ہو گئے، سب بے بس ہو گئے تو نسبتاً ایک جونیئر آفیسر چنگی بجا کر بولا:

”سر میرے دماغ میں ایک تجویز آئی ہے۔“ سب چونک کر سیدھے بیٹھ گئے۔ وہ آفیسر چنگی کر بولا: ”اگر وزیر داخلہ یہ لکھ کر دے دیں کہ وہ چند طالب علموں کو نیشنل پڑھاتے رہے ہیں تو سارا مسئلہ ہی حل ہو سکتا ہے۔“ چیئر مین نے گردن سلی اور بیڑاری سے بولے: ”لیکن اس سے مسئلہ کیسے حل ہو سکتا ہے؟“ آفیسر نے اسی شوخ لہجے میں جواب دیا۔ ”سر ہم ان کی آمدنی ٹیکس لسٹ سے ایک دو ہزار زیادہ شوکر کے ایک آدھ سو روپے ٹیکس لگا نہیں گے، اپنی جیب سے ادائیگی کریں گے اور پھر انہیں سرٹیفکیٹ جاری کر دیں گے۔“ سب نے جوش سے ہوا میں بازو لہرائے اور زندہ یاد کیا کہ اس آفیسر کی عقل و فراست کی داد دی۔

ہاں، قارئین کرام، یہ سچ ہے جم لودل صدر کی خصوصی اجازت کے باوجود ایک عرصے تک ٹیکس ریٹرن فائل کرنے کے لیے خوار ہوتا رہا اور یہ بھی سچ ہے ہمارے وزیر داخلہ کو تیسرے ہی روز سی وی ٹی سے اسٹیج کا سرٹیفکیٹ مل گیا، لیکن محترم قارئین، یہ دونوں واقعات پڑھنے کے بعد آپ کے اندر کوئی چیز ٹوٹی نہیں؟ آپ کو بھی میری طرح اپنی بے بسی، معذوری اور مجبوری کا احساس نہیں ہوتا؟ ایسا کیوں ہے، محترم قارئین کبھی آپ نے سوچا؟

بات صرف اتنی ہی ہے کہ جہاں قانون کمزور ہوتا ہے وہاں کے حکمران بہت ہی مضبوط ہوتے ہیں۔

Kashif Azad @ OneUrdu.com



یاجوج ماجوج

بنگالی ملاح جب کسی شخص کی حمايت، غير حاضر دماغي اور بے نتيجہ کوشش کا ذکر کرتے ہیں تو یہ لوگ داستان ضرور سناتے ہیں۔

خلیج بنگال کے ایک دور دراز جزیرے میں ایک ملاح رہتا تھا، اسے سب بھولا کہتے تھے، بھولا فطرتاً محنتی، بخلص اور بے لوث لیکن دماغ کا ذرا ذیلا تھا لہذا جو بھی کام کرتا آغاز ہی میں کوئی نہ کوئی ایسی حمايت کر بیٹھتا جس سے کام الٹا ہو جاتا، مثلاً آپ اس کے مچھلیاں پکڑنے کے اس واقعے ہی کو لیں جس میں اسے کھلے پانیوں میں پہنچ کر یاد آیا وہ تو جال ہی گھر بھول آیا ہے یا پھر آپ اس کے کشتی باندھنے کا احوال یاد کریں، جس میں اس نے چٹان میں چبڑھو پکھنے کی کوشش کی اور پھر وہ دن تک وہیں جڑ بیٹھ گیا، وغیرہ وغیرہ بھولے کی زندگی اس قسم کی حمايتوں کی ہزار داستان تھی لیکن ان تمام حمايتوں پر وہ حمايت سب سے ہماری تھی جو اب باقاعدہ لوگ داستان کی شکل اختیار کر چکے ہیں۔ کہنے والے کہتے ہیں ایک گہری سیاہ اور طوفانی رات کو چند مسافر اس کی کنیا میں آئے اور اسے چکا کر کہا: ”بھولے بھائی، ہم لوگوں کو ہر صورت صبح شہر پہنچنا ہے لیکن اس وقت کوئی ملاح ہمیں لے جانے کے لیے تیار نہیں، تمہارے پاس بڑی آس لے کر آئے ہیں، ہمیں مایوس نہ کرنا۔“ بھولے کے لیے یہ الفاظ کافی تھے۔ وہ فوراً اٹھا اور انہیں ساتھ لے کر ساحل پر پہنچ گیا۔ کہنے والے کہتے ہیں بھولے نے مسافروں کو کشتی میں بٹھا کر چبڑھو چلانے شروع کر دیے، جس کے بعد ساری رات کشتی چلتی رہی، لیکن جب سپید صبح نمودار ہوا تو مسافروں کو معلوم ہوا، بھولا تو کشتی کا رس کھولنا ہی بھول گیا تھا لہذا وہ ساری رات کے سفر کے بعد ابھی تک اسی ساحل پر کھڑے ہیں جہاں سے چلے تھے۔

پتا نہیں کیا بات ہے میں جب بھی اس ملک کے سارے گیارہ لاکھ دفاتر دیکھتا ہوں، ان میں کام کرنے والے ان سوا کروڑ لوگوں کے بارے میں سوچتا ہوں جو صبح ۸ بجے سے ۳ اور ۳ بجے سے ۹ بجے تک کام کرتے ہیں، جو روز بروز تازہ چہرے لے کر آتے ہیں اور تھک ٹھک کر گھر جاتے ہیں، جو اپنی زندگی کا بہترین وقت ان ٹھنڈے، گرم اور چمکتے دفاتروں میں ضائع کر دیتے ہیں، لیکن اس جہد مسلسل کے باوجود اس ملک کے تمام مسائل وہیں کھڑے رہتے ہیں تو مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے خود دیکھئے یہاں کوئی ایک ایسا منصوبہ نہیں جو خود

کار نظام کے تحت شروع ہو اور خود بخود مکمل ہو گیا ہو، کوئی ایسی فائل نہیں، جس کا سفر چند ماہ میں اختتام پذیر ہو گیا ہو، پھر آخر ہماری آبادی کا یہ دس فیصد حصہ کیا کر رہا ہے؟ یہ کس ملک، کس قوم اور کس عوام کے لیے مصروف کار ہے؟ جب دیوار نے یہیں کھڑے رہنا ہے تو پھر یہ لوگ اسے کیوں چاٹ رہے ہیں؟

میں نے ”شاہ جی“ اپنے سینئر بیورو کریٹ دوست سے پوچھا: ”سر آپ ایمان سے بتائیں آپ نے ۴۰ سال کی سروس میں کیا کیا؟“ شاہ جی نے ہاتھ کی پشت سے اپنی ٹھوڑی کے سخت بال کھجائے اور پھر لرزتی آواز میں کہا: ”اگر ٹھیک ٹھیک بتاؤں تو بات صرف اتنی ہے میں نے زندگی بھر فہرستیں بنائی ہیں، فائلیں مرتب کی ہیں۔“ میں نے قریبی صاحب سے پوچھا: ”یار آپ لوگ دفتر میں بیٹھ کر سارا سارا دن کیا کرتے ہیں؟“ قریبی صاحب نے لمبی آؤ بھری اور نیپل پر شیشے کا پیپر ویٹ گھما کر بولے: ”لشیں بناتے ہیں۔“ ”کیا مطلب؟“ میں نے حیرت سے پوچھا، قریبی صاحب نے اپنی میلی آنکھیں مجھ پر جمائیں اور پھر اپنے جھٹکے دار لہجے میں بولنا شروع کر دیا۔ ”جب حکومت کو خزانے کے خالی ہونے کا احساس ہوتا ہے تو وہ ہمیں حکم دیتی ہے، بینکوں سے قرضے لینے، والوں کی فہرستیں بنانی جائیں، ہم لیس سرکہہ کر سیلوٹ کرتے ہیں اور فوراً فہرست بنانا شروع کر دیتے ہیں۔“ ”کیا فہرستیں مکمل ہو جاتی ہیں؟“ میں نے بھولپن سے پوچھا: ”ہاں ہاں ضرور مکمل ہوتی ہیں۔“ قریبی صاحب کی آواز میں چڑچڑاہٹ آگیا، ”پھر ان فہرستوں کا کیا بنتا ہے؟“ میں نے پوچھا: ”کچھ بھی نہیں، کیونکہ فہرستوں کی تیاری تک حکومت کسی دوسرے محاذ پر مصروف ہو جاتی ہے، یا پھر تبدیل ہو جاتی ہے، لہذا ہم انہیں فائلوں میں لگاتے ہیں اور الماریوں میں رکھ کر بھول جاتے ہیں۔“ کیا ایک وقت میں صرف ایک ہی فہرست تیار ہوتی ہے؟“ میں نے پوچھا: ”نہیں، ایک وقت میں کئی فہرستیں بنتی ہیں چھوٹے قرضے لینے والوں کی فہرستیں، قرضے صاف کرانے والوں کی فہرستیں، قرضوں کے لیے درخواستیں دینے والوں کی فہرستیں، زرعی قرضے لینے والوں کی فہرستیں، صنعتی اور تعلیمی قرضے حاصل کرنے والوں کی فہرستیں، الغرض فہرستیں ہی فہرستیں۔“ میں نے آغا جی سے پوچھا: ”آغا جی آپ وفاقی سیکرٹری ہیں، پوری زندگی آپ نے اس نظام کی خدمت میں گزار دی، ذرا یہ تو بتائیں اگر کوئی غیر ملکی محقق ہمارے دفتری نظام کے مطالعے کے لیے پاکستان آئے تو اسے ان الماریوں، ان گوداموں اور ان بڑے بڑے رجسٹروں سے کیا ملے گا؟“ آغا جی نے سر سے ٹوپی اتاری اور پھر آگے جھک کر کہا: ”یار اسے یہاں فہرستوں کے سوا کچھ نہیں ملے گا، یہ سڑوک عمارتوں کی فہرست ہے، یہ نئی عمارتوں کی فہرست ہے، یہ تین اور چار منزلہ عمارتوں کی فہرست ہے، یہ پارکوں، ٹوٹی سڑکوں، ندی، تالابوں اور نہروں کی فہرست ہے، یہ دھواں چھوڑنے والی گاڑیوں کی فہرست ہے، یہ جنگلوں کی فہرست ہے، یہ شجر کاری کے لیے منتخب کیے گئے علاقوں کی فہرست ہے، یہ قابل کاشت اور خیر علاقوں کی فہرست ہے، یہ مذہبی رہنماؤں کی فہرست ہے، یہ وی آئی پی حضرات کی فہرست ہے، یہ ایگزٹ کنٹرول لسٹ ہے، یہ اشتہاری مجرموں کی فہرست ہے، یہ سنگروں اور قاتلوں کی فہرست ہے، یہ اسلوا لائنس رکھنے والوں کی فہرست ہے، یہ

ناجانہ ہتھیاروں کی فہرست ہے، یہ پڑھے لکھے بے روزگاروں کی فہرست ہے، یہ کارکن بچوں کی فہرست ہے، یہ سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی فہرست ہے، یہ بد عنوان اور راشی افراد کی فہرست ہے، یہ معذوروں اور بیماروں کی فہرست ہے، یہ فلاں فہرست ہے، یہ فلاں فہرست ہے؟ خدا کی پناہ! جس الماری میں جھانک کر دیکھو، جس کلرک کو بلاؤ، جو رجسٹر کھولو، جہیں ایک نئی فہرست ملے گی۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم صرف فہرست مرتب کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ "آغازی کودے کا دورہ پڑا، ان کی سانس کی نالی میں سیٹی بیٹنے لگے۔ انہوں نے کپکپاتے ہاتھوں سے کوٹ کی جیب نکل کر "ان اہلر" نکالا، پورا منہ کھول کر حلق میں پچکاری ماری اور لمبے لمبے سانس لینے لگے۔

میں نے ایک سینئر بیورو کریٹ کو مشورہ دیا: "ڈاکٹر صاحب آپ ان ساری فہرستوں کی بھی ایک فہرست کیوں نہیں بنوا لیتے؟" ڈاکٹر صاحب نے فلک شکاف قہقہہ لگایا اور شریر نظروں سے مجھے گھور کر بولے: "کہیں یہ ہمارے بڑے صاحب کو نہ بتا دیا وہ واقعی بنوا لے گا۔"

یقین فرمائیے جب میں ان ساڑھے گیارہ لاکھ دفاتر میں جھانک کر دیکھتا ہوں، ان سوا کروڑ ملازمین کو صبح سے شام تک فہرستوں کی دیوار چاٹتے اور پھر تعمیر کرتے دیکھتا ہوں، تو مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کروڑوں بھولے اپنی اپنی کشتیوں کے رے کھولے بغیر چپو چلا رہے ہیں، اس شب دروز کی منت سے ان کے بازو سوکھ کر رہی بن چکے ہیں، سر کپاس کے کھیت ہو چکے ہیں، چہرے چمک کر پرانے برٹن بن چکے ہیں اور کرسمس کی شکل اختیار کر چکی ہے لیکن کشتی ہے کہ وہیں کھڑی ہے، مسافر وہیں کھڑے ہیں جہاں سے چلے تھے۔

دوستو! ہم نے کبھی سوچا یہ کیا نظام ہے جو مریض کو دوا کی بجائے رپورٹ دے کر گھر بھیج دیتا ہے، جو انصاف نہیں صرف فیصلہ دیتا ہے، جس کی ساری جمع تفریق کاغذوں تک محدود ہے جس کی کل کائنات فائلیں اور فہرستیں ہیں ہم نے کبھی سوچا یہ "سٹسٹم" کوئی سٹسٹم نہیں یہ بھولے کی کشتی ہے جو ساری رات چلتی ہے لیکن ایک بالشت آگے نہیں بڑھتی۔

ہاں دوستو! ہم نے کبھی سوچا ہم کب تک گرم پانیوں کے سمندروں میں برف کے جزیرے بناتے رہیں گے، ہم کب تک یہ دیواریں چاٹتے رہیں گے، ہم کب تک ساحلوں سے بندھی کشتیاں کھیچے رہیں گے، کب تک آخر کب تک۔



وی ٹرین

دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر جرمن فوجوں کو فرانس خالی کرنے کا حکم ملا تو جرمن کمانڈنٹ نے ماتحت افسروں کو جمع کر کے کہا: ”آفسرز جنگ ختم ہو چکی ہے، ہم نازی پار چکے ہیں، فرانس ہمارے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔ یہ سچ ہے۔۔۔۔۔ اور یہ بھی سچ ہے کہ شاید اگلے پچاس برسوں تک ہم میں سے کسی کو فرانس میں داخلے کی اجازت نہ ملے، لہذا میرا حکم ہے جیس کے عجائب گھروں، نوادرات سے بھرے نمائش گھروں اور ثقافت سے مالا مال ہنر گدوں سے جو کچھ سمیت سکتے ہو، سمیت لو کہ جب فرانسیسی منتظمین شہر کا نظم و نسق سنبھالیں تو انہیں جیس سے جلی راکھ، پٹے کاغذ اور مرجھائے چروں کے سوا کچھ نہ ملے۔“

جزل کا حکم تھا لہذا تمام ماتحت افسر اور جو ملن عجائب گھروں پر نوٹ پڑے، اہریوں ڈال کر کے نوادرات اٹھالائے۔

ان میں ڈونچی کی مونا لیزا تھی، وین گاف کی مختلف رنگوں کی سیریاں تھیں اور ان میں ونس ڈی ملو کا مرمی جسم تھا، گویا سب کچھ تھا، جب عجائب گھر خالی ہو گئے تو جزل نے سارے نوادرات ایک ٹرین میں بھرے اور ڈرائیور کو سب کچھ جرمنی لے جانے کا حکم دے دیا۔ ٹرین روانہ ہوئی لیکن شہر سے باہر نکلنے ہی انجن خراب ہو گیا انجینئر آئے، انجن ٹھیک ہوا، ٹرین پھر روانہ ہوئی، لیکن ۱۰ کلومیٹر طے کرنے کے بعد اس کے سپنے جام ہو گئے۔ انجینئر آئے، سپنے ٹھیک کیے، ٹرین پھر روانہ ہوئی، لیکن چند کلومیٹر بعد بواکمر پھٹ گیا، پھر انجینئر آئے بواکمر مرمت کیا گیا، ٹرین پھر روانہ ہوئی، لیکن اس بار چند کلومیٹر کے بعد پریشر ٹانے والے پمپن جواب دے گئے، انجینئر آئے، پمپن بدلے گئے اور ٹرین پھر چلی۔ الغرض ٹرین خراب ہوتی رہی، جرمن انجینئر اسے ٹھیک کرتے رہے، یہاں تک کہ یورپ پر جرمن اقتدار ختم ہو گیا، نازی فوجیں واپس چلی گئیں اور فرانس دوبارہ فرانسیسی منتظمین کے قبضے میں آ گیا، لیکن ٹرین جرمنی کے بارڈر سے کہیں پیچھے خراب ہوتی رہی، ٹھیک ہوتی رہی اور پھر ایک روز ڈرائیور کو پیغام ملا ”موسیو آپ کا بہت بہت شکریہ، اب ٹرین یون ٹیپس واپس جیس آئے گی، ہم آزاد ہو چکے ہیں۔“

ڈرائیور نے اٹھیاں تہہ کر کے مکا بنایا، ہوا میں لہرایا اور نعرہ لگا کر واپس جیس چل پڑا۔ تاریخ کہتی

ہے، جب یہ ٹرین چھکا چھک کرتی پیرس کے ریلوے سٹیشن پر رکی تو فرانس کی ساری لیڈر شپ پلیٹ فارم پر اس ڈرائیور کے استقبال کے لیے کھڑی تھی، ڈرائیور پر گل پاشی کی گئی، اس کا ہاتھ چومایا گیا اور پھر اس کے ہاتھ میں ہائیکروفون دے دیا گیا۔ تھکان سے چور ڈرائیور نے ایک لمبا سانس لیا اور پھر جھوم کو مخاطب کر کے بولا: "حاضرین، جرمن گدھوں نے نوادرات تو ٹرین میں بھروسے، لیکن یہ بھول گئے، ڈرائیور تو فرانسیسی ہے اور اگر ڈرائیور نہ چاہے تو گاڑی کبھی منزل مقصود تک نہیں پہنچا کرتی۔"

عرسے بعد ہالی وڈ نے اس ڈرائیور پر "دی ٹرین" کے ٹائٹل سے فلم بنائی، جس کا شمار دنیا کی مقبول ترین فلموں میں ہوتا ہے۔

اگر موجودہ حکومت کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو یہ بھی "دی ٹرین" کی کہانی سے مختلف نہیں، کیونکہ فرانسیسی ٹرین کی طرح ہر چند کلومیٹر بعد کبھی اس کا انجن ٹھپ ہو جاتا ہے، کبھی بوائکر پھٹ جاتا ہے، کبھی پمپن جواب دے جاتے ہیں، کبھی پانی ختم ہو جاتا ہے، کبھی پیپے جام ہو جاتے ہیں اور کبھی بڑی نوٹ جاتی ہے، غرض پہلے دن سے اب تک بحرآن ہی بحرآن ہیں۔ اب گئی کہ کل گئی، کی انواہیں ہی انواہیں ہیں اور نا کامی ہی نا کامی ہے۔ "قرض واپس کریں" کی دھمکی سے بچتے ہیں تو "قسط نہیں ملے گی" کا امتحان سامنے کھڑا ہو جاتا ہے، بجٹ کم کرنے کے امتحان سے گزرتے ہیں تو ڈاؤن سائزنگ کی مجبوری سامنے کھڑی ہوتی ہے، وہاں سے جان بچتی ہے تو "توقع کم کریں" کا حکم مل جاتا ہے، اس سے جان بچتی ہوتی ہے تو چیف جنٹلمن بگڑ جاتے ہیں، اس سے نکتے ہیں تو "صدر صاحب نہیں مانتے" کا مسئلہ پھاڑ بن جاتا ہے۔ ان سے جان "چھوٹی" ہے، تو چیف ایکشن کسٹرن جناب رفیق تارڑ کے کاغذات مسترد کر دیتے ہیں۔

غرض ٹرین ہر چند کلومیٹر کے بعد رک جاتی اور انجینئر سارے کام چھوڑ چھڑا کر انجن کھول کر بیٹھ جاتے ہیں، دھرے پٹے اور کیل قبضے صاف کرنے میں جت جاتے ہیں، پرانے جوڑ توڑنے اور نئے تانگے لگانے میں مصروف ہو جاتے ہیں اور جب اس جہد مسلسل کے بعد انجن دوبارہ شارت ہو جاتا ہے تو وہ اطمینان کا سانس لے کر سستانے بیٹھ جاتے ہیں لیکن چند کلومیٹر چلنے کے بعد ٹرین دوبارہ رک جاتی ہے۔ اس مسلسل حرمت اور "ٹھوکا ٹھاک" سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے منزل مقصود سے کہیں پہلے ہی وقت ختم ہو جائے گا، دور بدل جائے گا اور پھر ایک پیغام کے ذریعے ٹرین کو جہاں ہے جیسے ہے کی بنیاد پر واپسی کا حکم مل جائے گا۔

قارئین کرام، اگر آپ مجھے سنجیدگی سے بات کرنے کا موقع دیں تو میں عرض کروں کہ اگر حکومت کو ایک ٹرین تصور کر لیا جائے تو اس کا ڈرائیور بیوروکریسی ہوتی ہے۔ وہ بیوروکریسی، جو کاغذ کا ایک کلزادہ کر سارا نظام مفلوج کر سکتی ہے، جو ایک فائل پھاڑ کر، ایک رجسٹر گم کر کے یا ایک آرڈر کو معمول کے چیلل میں ڈال کر سارے نظام کی بریکیں لٹل کر سکتی ہے، جو پھنسی کی ایک درخواست کے ذریعے سسٹم کے پیپے جام کر سکتی ہے، جو چند لفظوں کے ہیر پھیر سے حکومت کے تمام ہی خواہوں کو دشمن اور تمام حلیفوں کو حریف بنا سکتی

ہے، جو سیزنگ کی معمولی سے جنبش یا غلط ٹریک کی طرف مرکز سارے مسافروں کو کہیں سے کہیں پہنچا سکتی ہے، جو انجن میں "رول اجازت نہیں دیتا" کی ریت ڈال کر ٹرین کو جنگل میں رکنے پر مجبور کر سکتی ہے، ہاں جو جب چاہے، جو چاہے کر سکتی ہے اور مضبوط سے مضبوط حکمران کے پاس خون کے گھونٹ بھرنے، اپنی ہی کلائیوں پر "چل" مارنے اور میز پر رکے برسانے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا، آپ نے اگر کبھی "ڈنٹے" ہوئے سیکرٹریوں اور غصے سے کانپتے ہوئے وزراء کے مکالمے سنے ہوں (جن میں سیکرٹریوں کی ایک ہی دلیل وزیروں کے سارے دلائل پر بھاری ہوتی ہے کہ جناب آپ ہیں عارضی طور پر با اختیار، آج ہیں کل چلے جائیں گے، لیکن ہم تو مستقل ملازم ہیں، کل بھی یہیں تھے، آج بھی یہاں ہیں اور کل بھی یہیں ہوں گے) تو آپ کو اصل ڈرامیور اور اس کے اختیارات کا بخوبی اندازہ ہو جائے۔

میاں نواز شریف سے غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے بھاری سینڈیٹ کی کموار سے ٹرین کے "ڈرامیوروں" کو دھمکانا شروع کر دیا، جہذا نوبت یہاں تک آچکی کہ سمجھدار لوگ اس وقت کی آہٹ من رہے ہیں، جب وزیراعظم کے دستخط سے ایک آرڈر جاری ہوا اور ہیڈ کلرک اس پر یہ لکھ کر واپس بھیج دے، "جناب آپ اس شخص کو وفاقی وزیر مقرر نہیں کر سکتے، کیونکہ یہ تو بیوی بچوں سے لڑکر اسلام آباد آیا ہے۔ جو شخص گھر نہیں چلا سکتا وہ ایک پوری وزارت کیسے چلائے گا۔" یا نئے وزراء کے حلف اٹھانے سے چند لمبے قبل کوئی سول جج یہ آرڈر جاری کر دے گا "آئین کسی محنوارے شخص کو وزیر بننے کی اجازت نہیں دیتا، لہذا اخلاص لکھان اور کان پارلیمنٹ حلف نہیں اٹھا سکتے۔" یا کوئی سربراہ مملکت پاکستان کے دورے پر آئے گا تو سیکورٹی فورس کا کوئی اہلکار اسے یہ کہہ کر واپس بھیج دے گا۔ "اس نے تو حفاظتی ٹیکوں کا کورس ہی مکمل نہیں کیا۔"

ہاں، اس نظام میں جہاں چیز اسی چھٹی پر چلا جائے تو موست ارجنٹ فائل ایک میز سے دوسری میز تک فاصلہ مینوں میں طے کرتی ہے، وہاں کوئی شخص پوری سٹیبلشمنٹ سے کیسے لڑ سکتا ہے؟

ہاں ہاں، میاں نواز شریف صاحب، خرابی انجن میں نہیں، ڈرامیور کی نیت میں ہے، اس پر توجہ دیں، اسے "راضی" کرنے کی کوشش کریں ورنہ آپ جو کام کرنا چاہیں گے اس پر "انجیکشن" لگا کر قائل واپس کر دی جائے گی۔

فرانسیسی ڈرامیور نے جج کہا تھا: "اگر ڈرامیور نہ چاہے تو گاڑیاں بھی منزل مقصود تک نہیں پہنچا کر تیں۔"



کی کری جانا اے

ان دنوں کا قصہ ہے جب ذوالفقار علی بھٹو پاکستان کو خود انحصاری کی پٹری پر چڑھانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن ان کی جہد مسلسل کے باوجود ملک ترقی پر مائل نظر نہیں آتا تھا، حالات روز بروز دیگر گوں ہو رہے تھے۔ یہ صورتحال جب پنجابی کے غالب استاد داسن کے نوٹس میں آئی تو انہوں نے برہتہ کہا:

کدی لاؤکانہ تے کدی مری جانا اے

کی کری جانا اے، کی کری جانا اے

اتے کبیل دے کہ دری کھی جانا اے

Kashif Azad @ OneUrdu.com

کی کری جانا اے

کی کری جانا اے، کی کری جانا اے

استاد داسن کے کہنے کا مطلب تھا لاؤکانہ اور مری کے درمیان بھاگنے کا کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ آپ جاڑے کے موسم میں غریب عوام پر کبیل دے کر نیچے سے دری کھینچ رہے ہیں۔

دھماکے کے بعد، میں میاں نواز شریف کے سویبیوں سے چشم پوشی کے لیے تیار ہوں، میں ان کے قومی ایجنڈے سے بھی ہزار فیصد متفق ہوں، ان کی نیت پر بھی شک کی بظاہر کوئی وجہ نظر نہیں آتی، لیکن طریق کار..... ہاں البتہ اس میں اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔ میرا ذاتی خیال ہے سرکاری دفاتر میں چائے کم کرنے، سرکاری تقریبات پر پابندی لگانے، دو کے بجائے ایک کاغذ استعمال کرنے، فوٹو سٹیٹ مشینیں بند کرنے اور مہمانوں کو دال روٹی کھلانے سے یہ قوم ملائیشیا نہیں بنے گی، ایک دفتر سے دوسری عمارت میں منتقلی، آٹھ کے بجائے چھ ڈپٹی سیکرٹری، چار کے بجائے دو ڈرائیور اور ۱۸ کے بجائے پرنٹنگ مشینوں پر اسکا سے بھی معاملات درست نہیں ہوں گے۔ فلج، یورپ اور امریکہ میں ریال، پونڈ اور ڈالر کمانے والے پاکستانیوں کی معاونت سے بھی یہ ملک جرمی نہیں بنے گا کیونکہ ابھی تک دو سو رائج بند نہیں ہوئے جن سے قومی دولت رس رس کر رہا ہو رہی ہے اور عقل یہ کہتی ہے، جب تک آپ ان پر توجہ نہیں دیتے حالات نہیں سدھریں گے، خواہ

آپ لاکھ بچت کر لیں، پانی پانی جوڑ لیں، دو وقت کا کھانا اور چار وقت کی چائے بند کر دیں۔

اچھی بات ہے میاں نواز شریف چائے کے بجائے تھوہ پیتے ہیں۔ انہوں نے ایک سال تک نئے کپڑے نہ سلوانے کا فیصلہ بھی کر لیا۔ کرسٹل فلائٹس سے سفر کرتے ہیں۔ بڑے گھر سے چھوٹے گھر منتقل ہو چکے ہیں۔ زندگی میں سادگی لا رہے ہیں، لیکن اس سے قومی خزانے کو کتنا فائدہ پہنچے گا؟ ۵۰ ہزار، ایک لاکھ یا ۱۰ لاکھ روپے ماہانہ جبکہ اس وقت سینٹ کے ۸۷ ارکان ۳۳ لاکھ ۶۰ ہزار روپے تنخواہ لے رہے ہیں اور انہیں ۴ کروڑ ۳ لاکھ ۳۸ ہزار کی مراعات حاصل ہیں۔ چیئر مین اور ڈپٹی چیئر مین سینٹ کے پاس ۱۰ لاکھ روپے کے صوابدیدی فنڈز ہیں۔ صرف ڈپٹی چیئر مین کا عہدہ تو کم کو ۹ لاکھ ۱۵ ہزار روپے (سالانہ) میں پڑتا ہے۔ قومی اسمبلی کے سپیکر اور ڈپٹی سپیکر کے سالانہ اخراجات اور مراعات ۹۷ لاکھ ۴۱ ہزار ہیں (اس میں ان کے ۱۰ لاکھ روپے کے صوابدیدی فنڈز شامل نہیں) قومی اسمبلی کے ارکان ایک کروڑ ۲۰ لاکھ روپے بطور تنخواہ پاتے ہیں، جبکہ ان کے ریگولر لائڈنس ۳ کروڑ ۳۰ لاکھ اور ۳۴ ہزار روپے ہیں۔

قوم دو کپ چائے کم کر کے ۲ کروڑ روپے بچا رہی ہے لیکن وفاقی وزراء بدستور ۲۰ کروڑ روپے کی مراعات لے رہے ہیں۔ سینٹ اور قومی اسمبلی کی سینڈنگ جمک کینیوں کا ہر چیئر مین ساڑھے ۱۲ لاکھ روپے سالانہ تنخواہ لیتا ہے۔ یوں صرف چیئر مینوں کو ۵ کروڑ ۸ لاکھ ۷۶ ہزار روپے سالانہ ادا کیے جاتے ہیں، جن میں ہر چیئر مین کا ۳۶۰ لیز پٹرول، ساڑھے سات ہزار ماہانہ ٹیلی فون بل، سیٹنگز اور سیٹنگز کے اخراجات شامل نہیں ہیں۔ ان کے ذاتی عملے کی تنخواہیں اور دفاتر کے روزمرہ کے اخراجات اس کے علاوہ ہیں۔ اس سلسلے میں صرف کشمیر کینی کی مثال ہی کافی ہے، جسے ۹۷ میں مسئلہ کشمیر و جا کر کرنے کے لیے ایک کروڑ ۲۸ لاکھ ۸۱ ہزار روپے دیے گئے لیکن اس خطیر رقم کے باوجود مسئلہ کشمیر حل ہوا اور نہ ہی عالمی رائے عام ہوا رہی۔

ان سارے اخراجات سے صرف نظر کر دیا جائے تو بھی قومی اسمبلی میں قائد حزب اختلاف جیسے تحریقی عہدے پر ۶ لاکھ ۲۵ ہزار روپے خرچ ہوتے ہیں۔ یہ رقم صرف بے نظیر کی تنخواہ اور مراعات پر ضائع ہوتی ہے جبکہ سینٹ میں لیڈر آف دی ہاؤس اور قائد حزب اختلاف کے مجموعی اخراجات ۶۳ لاکھ ۵۸ ہزار روپے ہیں۔

مجھے ایک صاحب بتا رہے تھے کہ پارلیمنٹ ہاؤس کے اندر رہنے والی ”مخلوق“ کی نگہداشت پر ہر سال ۱۰۰ کروڑ روپے ضائع ہوتے ہیں جبکہ یہ لوگ جو کام کرتے ہیں وہ اس سے کہیں کم پیسوں میں عام سطحی ذہنیت کا مالک شہری، تجویزی سرانجام دے سکتا ہے، پھر ان لوگوں کے خیرے کیوں اٹھائے جائیں۔ لوگ کیوں ان لوگوں کی تنخواہوں، مراعات اور اللوں تلوں کے لیے اپنے پیٹ کاٹیں۔ کیوں اپنی ضروریات کا گلہ گھونٹ کر خود انحصاری فنڈ میں رقم جمع کرائیں۔

جب اس بیانی کے پیچھے، جو میں نے شدید طلب کے باوجود نہیں پی، میرے کرپٹ، بے ایمان اور

بے اصول ایم این اے پارٹی افسر کی جیب میں جانے ہیں تو پھر میں اپنی طبیعت پر جبر کیوں کروں؟
یقین فرمائیے میں نے تو قومی ایجنڈے کے اعلان کے بعد پارلیمنٹ ہاؤس، سنٹر کالونی، ایم این اے ہاسٹل، فیڈرل لاجز اور سیکرٹریٹ کی زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں دیکھی، دولت کا زیاں، قومی وسائل کا بے دریغ استعمال اور اسراف میں کوئی کمی نہیں آئی۔ ایک ایم این اے کی پیرو کل بھی پانچ ہزار کا پٹرول پھونکتی تھی، آج بھی اس کے سلسلے سے اتنا ہی دھواں خارج ہوتا ہے۔ ایک وزیر کا شمل بھی اتنا تھا اور آج بھی اتنا ہے۔ قائد کشمیریوں کے ارکان کل بھی ٹی اے ڈی اے کی چٹیں فائلوں میں لگا کر پھر رہے تھے آج بھی ان کے ہاتھوں میں چیک ہیں۔ سینیٹر کل بھی سٹرل وائر پیٹے تھے، آج بھی ان کی گاڑیوں میں ”میڈ ان فرانس“ ہے۔ ارکان اسمبلی کل بھی ”ڈن بل“ سگریٹ پیٹے تھے، آج بھی ان کی گاڑیوں سے غیر ملکی تباہ کی خوشبو آتی ہے۔ پھر وہ خود انحصاری کہاں ہے، جس کا اعلان میاں نواز شریف کر رہے۔ وہ بچت، اخراجات کم کرنے کے وہ نعرے اور پیٹ پر پتھر باندھنے کے عزم کہاں ہیں۔

جناب میاں نواز شریف صاحب! مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آپ دلدل پر عمارت تعمیر کرنے کی کوشش کر رہے ہیں یا پھر ریت کے گڑھوں میں پانی جمع کر رہے ہیں، ورنہ آپ کو یہ ۱۰۰ کروڑ روپے ضرور نظر آتے ہیں جن کا اس قوم کو کوئی بھر فائدہ نہیں۔

آپ یقیناً جائزے کے موسموں میں اس غریب پاکستانی، جس کے تن پر کپڑے بھی پورے نہیں، کھل دے رہے ہیں، لیکن آپ کے ساتھی اس کے نیچے سے درمی کھینچ رہے ہیں۔ آپ اگر اس غریب کا بھلا چاہتے ہیں، تو اس پر کھل بے شک نہ دیں، بس درمی کھینچنے والے ہاتھ پکڑ لیں۔

اس ”ویسٹ لینڈ“ جس میں ایک ایک رکن اسمبلی کروڑ روپے اجازت دے، جائے کی پیالیوں میں کمی سے ملک کو خود انحصاری کی بیڑی پر لانے کا خواب چھت پر چڑھ کر درخت لگانے جتنی حماقت ہے۔



کتنی دور باندھیں

مہجرات، میرے علاقے میں یہ قصہ بڑا مشہور ہے۔

کسی زمیندار کی بھینس نے دودھ دینا بند کر دیا، زمیندار بڑا پریشان ہوا، اسے پریشان ہونا بھی چاہیے تھا، کیونکہ بھینس کو ”زچگی“ کے مراحل سے گزرے ابھی چند ہی ماہ گزرے تھے، اسے مکمل بنوٹا اور چارہ بھی خوب ملتا تھا، بھل سیوا بھی ٹھیک ہوتی تھی، بھینس سے سلی کا دودھ بھی دوستانہ تھا، پھر اس کی ناراضی ناقابل فہم نہ ہو تو کیا ہو، زمیندار بھینس کو ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ ڈاکٹر نے انگلیشن دیا، کوئی فرق نہ پڑا، بھینس کو گھاؤں کے سیانے کے پاس لے جایا گیا، اس نے نوے نوے آزمائے لیکن وہ دھس سے دھس نہ ہوئی، مہموش شاہ کو لایا گیا، اس نے سرچوں کی دھوئی دی، دم کیا ہولناکی چھڑکا، گلے میں ٹوٹا ہوا جوتا باندھا، کوئی اتفاق نہ ہوا۔ زمیندار کی ماں کی مدد لی گئی ”بے بے جی“ نے بھینس کی خوراک بڑھا دی، دودھ میں دھس لگی ملا کر دیا، لیکن یہ جتن بھی بھینس کے آگے میں اتنی کامرت ہوا، بالآخر زمیندار شاید ذہنی کوفت کا شکار ہو گیا، چنانچہ اس نے بھینس قصائی کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا، لیکن اس سے قبل کہ وہ اسے عملی جامہ پہنا تا وہاں سے سائیں بلی کا گزر ہوا۔ سائیں بلی جسے گاؤں کے لوگ جھلا (پاگل) کہتے تھے، نے سارا قصہ سن کر زمیندار سے پوچھا ”چودھری یہ تو بتاؤ تم کتنا (بھینس کے صاحبزادے کو پنجابی میں اسی نام سے پکارا جاتا ہے) کہاں باندھتے ہو۔ چودھری نے فوراً جواب دیا، بھینس کی کھری پر۔“ بلی نے دوسرا سوال کیا ”کتنے کا سٹنگل (زنخیر) لبا ہے یا چھوٹا؟“ زمیندار نے تھوڑا سا سوچ کر کہا ”لبا ہے۔“ بلی نے تہقہہ لگایا اور چیخ کر کہا ”چودھری ساری ج (بھینس) تو کتنا چنگ (پلی) جاتا ہے، جہیں کیا ملے گا، کتنا بھینس سے دور باندھا کرو۔“

قومی اسمبلی اور سینٹ کی ۵۰ کمیٹیاں ہیں، ہر کمیٹی کا ایک چیئر مین ہے، ہر چیئر مین کے ذاتی دفتر کی تیاری پر ۹۳ میں دو دو کروڑ روپے خرچ ہوئے تھے، ہر چیئر مین سات ہزار روپے ماہانہ تنخواہ لیتا ہے، اسے گریڈ سترہ کا پرائیویٹ سیکرٹری، گریڈ پندرہ کا ایک سینیٹر، ایک نائب قاصد، ۱۳۰۰ سی سی کی برائڈ نیو گاڑی، ایس ٹی وی فون ۳۶۰ لیٹر فی گازی پٹرول، رہائش اور رہائش پر فرائی فون کی سہولت حاصل ہے۔

رول کے مطابق یہ لوگ صرف قومی اسمبلی اور سینٹ کے سیشنوں کے دوران اجلاس بلا سکتے ہیں،

لیکن ان کمیٹیوں نے کراچی، لاہور، کوئٹہ اور پشاور سمیت ملک کے درجنوں شہروں میں بیسیوں اجلاس بلائے اور فی ممبر پانچ ہزار روپے ہر اجلاس میں کمائے (یہ کروڑوں روپے بنتے ہیں)

ان کمیٹیوں کا اجلاس جہاں بھی ہو متعلقہ وزارت کے سیکرٹری کا وہاں پہنچنا ضروری ہوتا ہے۔ تمام ممبروں کی رہائش، انٹر میٹ، اور گاڑیوں کا انتظام کیا جاتا ہے، انہیں اجلاس شروع ہونے سے تین روز پہلے اور تین روز بعد تک کافی اے ڈی اے دیا جاتا ہے، یوں ایک مہینے کے مطابق گزشتہ تین برسوں میں یہ ۵۰ کمیٹیاں ساڑھے چار ارب روپے کا دودھ "چنگ" چکی ہیں، اب ان کے ماہانہ خرچے چار کروڑ روپے سے زائد ہیں۔

سوچنے کی بات ہے، ایک ایسا ملک جو بے حد غریب اور مقروض ہے، جہاں لوٹ کھسوٹ و دہشت گردیاں، اختیارات سے تجاوز، کرپشن اور قرضے پی جانا کلچر بن چکا ہے۔ جہاں کرپشن کے ۹۲ فیصد الزامات ارکان اسمبلی، موجودہ اور سابق حکمرانوں پر عائد ہوتے ہیں، جہاں دس گیری اڈوں کی خرید و فروخت و منشیات کا دھندہ، ناجائز اسلحہ کے ڈپو اور چمک ٹکس وصول کرنے تک کے سارے کام ارکان اسمبلی کے زیر سایہ ہوتے ہیں، اس ملک میں یہ کمیٹیاں کیا قانون سازی کر رہی ہیں، وہ کون سے "مقدمات" ہیں، جو ان کے زیر ساعت ہیں، انہوں نے کن کن معاملات کی چھان بین کی، کتنے کیس بنا کر عدالتوں کے سپرد کئے اور کتنے مسائل سلجھا کر ایوان میں پیش کئے، پھر ان کمیٹیوں کی کیا جیٹل ٹیکنیک ہے؟

ہو سکتا ہے، ان کمیٹیوں کے معزز ارکان دعویٰ کریں کہ وہ نظام کی اصلاح کے لیے رات دن کام کرتے رہے۔ نیند کی کمی سے ان کی آنکھیں پتھر ہو گئیں، مگر سیوں پر بیٹھ بیٹھ کر ان کی کمر بے زخم آگئے، اور لکھ لکھ کر ان کی اگھیاں سو جھگڑ گئیں، درست ہے، لیکن سوال ہے، اس محنت شاقہ کے باوجود نظام ٹھیک کیوں نہیں ہوا؟ کیوں اصلاح احوال کی کوئی تدبیر نظر نہیں آئی، کیوں حالات کے الجھے ہوئے دھاگے نہیں سلجھے؟ کیوں صحرا میں ٹھنڈی ہوا کے جھونکے نہیں چلے۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان معزز ارکان کا "ٹیلنٹ" ہی غلط جگہ صرف ہو رہا ہو، انہیں ایسی دیوار چاننے پر لگا دیا گیا ہو جس نے صبح دوبارہ سامنے آکر کھڑا ہوتا ہے، انہیں مغرب کے بجائے مشرق کی طرف سفر کا حکم دے دیا گیا ہو، اگر ایسا ہے تو پھر انہیں کسی پیداواری کام پر کیوں نہیں لگایا جاتا ہے؟

مجھ سے ایک تھوکتی کا دندے نے پوچھا "حکومت قوم کو بچت کے لیے کیسے قائل کر سکتی ہے؟" میں نے عرض کیا "عوام تو برسوں سے بچت ہی کر رہی ہے اب آپ لوگ بھی کچھ خیال کریں۔" بولا "کیا مطلب؟" میں نے دوبارہ عرض کیا "میرے عزیز اس ملک میں کتنے لوگ ہیں، جو سال میں دو جوڑے کپڑے سلوا سکتے ہیں، کتنے لوگ ہیں جو دن میں تین بار کھانا کھا سکتے ہیں، کتنے لوگ ہیں، جو ہوائی سفر کا لطف اٹھا سکتے ہیں، کتنے لوگ ہیں جو ٹیلی فون پر لمبی لمبی کالیں کر سکتے ہیں؟ چند ہزار یا چند لاکھ۔ جب تک یہ لوگ قربانی نہیں دیتے، بات آگے نہیں بڑھے گی، تم خود دیکھو یہ لوگ اقتدار سے الگ کیوں نہیں ہوتا چاہتے، صرف اس لیے

میرے عزیز کہ اقتدار ایک ایسی ماں ہے، جو ان لوگوں کے سارے خیرے اٹھاتی ہے، جب تک یہ لوگ اپنا لائف سائل نہیں بدلیں گے کوئی فرق نہیں پڑے گا، کوئی تبدیلی نہیں آئے گی۔

جی ہاں محترم قارئین! ایک کنٹین اور مشکل وقت ہمارے دروازے پر کھڑا ہے، ہمیں پیٹ پر ہتھ باندھنے پڑھیں گے ہم باندھیں گے بھی۔ پر یہ تو ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ہم تو بھوکے سوئیں، ہمارے بچے تو قربانی کی سولی تڑھ جائیں لیکن کمیٹیوں کے "اجلاس" اسی طرح جاری رہیں، اسی طرح ساڑھے چار کروڑ روپے ماہانہ ضائع ہوتے رہیں۔ "کئے" اسی طرح سارا دودھ "پٹکتے" رہیں۔

ہم سے قربانی مانگنے سے پہلے آپ کو بھی تو ان "کنوں" کی زنجیریں چھوٹی کرنا ہوں گی۔ انہیں بھیڑیوں سے دور باندھنا ہوگا۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

روکو، روکو

کچھ شاعر مشاعرہ پڑھنے کے لیے فیصل آباد جا رہے تھے، منتظمین نے ہازک "خلوق" کو سفر کی صعوبتوں سے بچانے کے لیے "سالم" کوچ کرا دی، کوچ جوں ہی لاہور سے باہر نکلے منیر نیازی نے ہاتھ پیٹ پر رکھے اور "روکو، روکو" کا نعرہ لگا دیا، ڈرائیور نے پیچھے مڑ کر دیکھا "مجھے وہ آیا ہے" منیر نیازی نے چھوٹی انگلی اٹھا کر با آواز کہا، ڈرائیور نے بریک لگا دی، منیر نیازی نے پھلانگ لگائی اور بھاگ کر کھیتوں میں گھس گئے، دس منٹ بعد وہ مطمئن چہرہ اور ایک طویل منٹا لے کر واپس آ گئے، کوچ میں داخل ہوتے ہی انہوں نے ڈرائیور سے معذرت خواہانہ لہجے میں کہا "معاف کرنا بھائی میرا مٹانہ ذرا کمزور ہے۔" ڈرائیور نے گردن ہلا کر "کوئی بات نہیں" کہا اور کوچ گیر میں ڈال دی، ابھی گاڑی نے بمشکل دس بارہ کلومیٹر کا فاصلہ طے کیا تھا کہ منیر نیازی نے دوبارہ پیٹ پر ہاتھ رکھے اور "روکو، روکو" کا نعرہ لگا دیا، بریک لگی اور دوبارہ کھیت میں گم ہو گئے، دس منٹ بعد واپس لوٹے تو ان کے ہاتھ میں تازہ سولی تھی، ڈرائیور نے گردن ہلا کر "کوئی بات نہیں" کہا اور گاڑی گیر میں ڈال دی لیکن چند کلومیٹر بعد ایک بار پھر پیچھے سے "روکو، روکو" کی آواز آئی، بریک چرچرائے اور منیر نیازی آزادار بند ہاتھ میں پکڑ کر کھیت کی طرف کھانچیں بھرنے لگے، اس بار واپسی پر ان کے ہاتھ میں گولنگو (ضلع) تھا، ڈرائیور نے تھکا تھکا سا "کوئی بات نہیں" کہا اور چل پڑا..... لیکن ابھی..... موقع واردات پر موجود یعنی شاہدوں کے مطابق جب متعدد بار "روکو، روکو" میرا ذرا مٹانہ کمزور ہے، کوئی بات نہیں" کے بعد بھی گاڑی فیصل آباد سے اتنی ہی دور تھی جتنی تین گھنٹے اور پندرہ عدد روکو، روکو سے پہلے تھی تو ڈرائیور نے زنج ہو کر کہا "بھائی صاحب یوں تو ہم کبھی فیصل آباد نہیں پہنچ سکیں گے۔" منیر نیازی نے دونوں ہاتھ نیچے پر جما کر پوچھا "کیا فیصل آباد ابھی بہت دور ہے؟" اب اس سے قبل کہ ڈرائیور کی طرف سے کوئی "دندان شکن" جواب موصول ہوتا پیچھے سے شریف کچا ہی صاحب نے ہانک لگائی "نہیں خیر اب اتنا بھی دور نہیں بس یہی کوئی میں بھیجیں روکو، روکو کا ہی تو فاصلہ ہے۔"

گو ۲۰۱۰ء والے احسن اقبال موجودہ حکومت اور اس سے پہلے آنے والی متعدد حکومتوں میں سے معقول ترین وزیر ہیں، ان کی آنکھوں میں ہر وقت کچھ کرنے کی تڑپ اور ان کے لہجے میں اصلاح احوال کی

شدید ترین خواہش کروٹ لیتی رہتی ہے لیکن اس کے باوجود ان کے سارے سوال ”کیا فیصل آباد ابھی بہت دور ہے“ ہی نکلتے ہیں، کچھ روز پہلے جمیئر آف ریٹائرمنٹ کا نفرنس پر ان سے ملاقات ہوئی تو وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اولڈ پرائمری ماسٹر سیکرٹریٹ کے ایک کونے میں بیٹھ گئے، اور پھر دیر تک جذباتی انداز میں مجھے اپنے پلان سمجھاتے رہے، ہم اگلے سال تک اسے سلیبس تیار کریں گے، اسنے نئے سکول کھولیں گے، کمپیوٹر کو اتنا فروغ دیں گے، پورے ملک سے اتنا ٹیلنٹ اکٹھا کریں گے، اسنے جمیئر آف ریٹائرمنٹ جمع کریں گے، نظام کو اتنا سبب بنا دیں گے، اتنی خوشحالی آئے گی، اتنا تاج ہوگا، اتنی فراوانی اور اتنی آسودگی حاصل ہوگی، اور پھر آخر میں، کیا اس ترقی کے بعد بھی ہم ایک محروم اور پسماندہ قوم ہی کہلائیں گے؟ وغیرہ وغیرہ“ میں نے انہیں خاموش دیکھ کر فیصل آباد کا فاصلہ بتانے کے لیے منہ کھولا چاہا لیکن انہوں نے مجھے ہاتھ کے اشارے سے خاموش رہنے کی ہدایت کر دی اور پھر اسی خروش سے بولتے چلے گئے جو ایک کھرے مگر خواب دیکھنے والے شخص کا خاصا ہوتا ہے۔

”تم سنگا پورہ کی مثال لو جب وہ اگست ۱۹۶۵ء میں آزاد ہوا تو وہاں غنیمت چٹانوں اور سمندری جھاگ کے سوا کیا تھا لیکن صرف ۱۰ ہی برس میں ساری دنیا کی معاشی جڑیں اس بے آب و گیاہ جزیرے میں پیوست ہو گئیں آج اس جزیرے کے ذخائر سولین ڈالر کے قریب پہنچ چکے ہیں، جب سنگا پور کے چند لوگ یہ معجزہ دکھا سکتے ہیں تو ہم ۱۳ کروڑ لوگ مل کر اس ملک کا مقدر کیوں نہیں بدل سکتے؟“ میں نے جواب عرض کرنے کے لیے پہلو بدلا لیکن انہوں نے مجھے انگلی سے خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا۔

”تم کوریا، ملائیشیا، انڈونیشیا اور تھائی لینڈ کی مثال لو ۱۹۶۷ء میں ان کی مجموعی برآمدات پاکستان سے کہیں کم تھیں، ان کے ایکسپورٹس ہماری ترقی کا جائزہ لینے پاکستان آتے تھے، لیکن آج۔۔۔“ انہوں نے المسوس سے گردن ہلائی ”تم ان میں سے کسی ملک کی برآمدات کا چارٹ اٹھا کر دیکھو وہ تمہیں پاکستان سے کئی گنا آگے نظر آئے گا کیوں، آخر کیوں؟ وہ لوگ ہم سے آگے کیوں ہیں؟ ہم لوگ ان تک کیوں نہیں پہنچ سکتے اور تم لکھ لو ہم انشاء اللہ ۲۰۱۰ء تک۔۔۔“ میں نے انہیں ایک بار پھر فیصل آباد کا فاصلہ بتانے کی کوشش کی لیکن انہوں نے اس بار بھی مجھے اشارے سے خاموش رہنے کی ہدایت کر دی۔

”دیکھو ہم محنت اور چلانگ کے ذریعے، وسائل اور ٹیلنٹ کی لچ روک کر دس بارہ برسوں میں ان ممالک کے قریب پہنچ سکتے ہیں اہم کر سکتے ہیں بھائی کر سکتے ہیں اب دلی دور نہیں ہے۔“ میں نے اندر ہی اندر چیخ و تاب کھائے، میرا جی چاہا، میں ان کی انگلی کے اشارے کی پروا نہ کرتے ہوئے کیوں ”احسن بھائی ہم نہیں کر سکتے ہم کبھی سنگا پور، ملائیشیا، کوریا، تھائی لینڈ اور انڈونیشیا نہیں بن سکتے کیونکہ ہماری کوچ میں ایسے لوگ سوار ہیں۔ جو ہر چند کھو میٹر بعد پیٹ پر ہاتھ رکھ کر ”روکو، رکو“ کی دہائی دے کر گاڑی رکوا لیتے ہیں اور پھر آزار بند پکڑ کر کھیتوں کی طرف دوڑ لگا دیتے ہیں، یہ لوگ جب واپس آتے ہیں تو ان کے ہاتھوں میں کبھی گنا، کبھی مولی اور کبھی گونگو ہوتا ہے، یہ ایسے لوگ ہیں جو یہ حقیقت تک نہیں جانتے کہ کمزور مثالوں والوں کی کوہیں کبھی

شاہراہ ترقی پر نہیں چڑھ سکتیں، ان کا فیصل آباد ہمیشہ میں پچیس روکو، روکو کے فاصلے پر ہی رہتا ہے، رہی بات جاپان، جرمنی اور ان کے بعد سنگاپور، کوریا، تھائی لینڈ، انڈونیشیا اور ملائیشیا کی تو وہ لوگ ہم سے زیادہ سیانے تھے، انہوں نے آغاز سفر ہی میں روکو، روکو نسل کے سارے لوگ ”آف لوڈ“ کر دیئے تھے لیکن ہم وہ بد نصیب لوگ ہیں جو ابھی تک ہاتھیوں کو فیڈر سے دودھ چلا رہے ہیں لہذا ہم لوگ ۲۱ ویں صدی کی دہلیز پر کھڑے ہو کر بھی روکو، روکو ہی کی آوازیں سن رہے ہیں۔“



Kashif Azad @ OneUrdu.com

انہیں نمک چاہیے

ذرا تصور کیجیے آپ کسی کے گھر مہمان ہوں، کھانے کی میز پر بیٹھے ہوں، آپ کو نمک کی طلب ہو، نمک دان آپ کی دسترس سے دور پڑا ہو، آپ میزبان سے نمک طلب کریں، وہ مسکرائے، نیکیں سے ہاتھ صاف کرے اور نمک دان کی بجائے آپ کو ڈونگا پکڑا دے، آپ عرض کریں ”نہیں، جتنا مجھے تو نمک چاہیے۔“ میزبان معذرت کرے، ڈونگا نیچے رکھے اور گلاس اٹھا کر آپ کو پیش کر دے، آپ عرض کریں ”نہیں حضور مجھے نمک چاہیے نمک۔“ میزبان پھر معذرت کرے، گلاس نیچے رکھے اور آپ کو چمچ پکڑا دے، اس کے بعد مطالبے اور معذرت کا طویل سلسلہ شروع ہو جائے، آپ نمک مانگتے رہیں اور وہ آپ کو ڈونگے، گلاس اور چمچ پکڑاتا رہے تو آپ کی میزبان کے بارے میں کیا رائے ہوگی، آپ بھی کہیں گے نا، لیکن نہیں ذرا غصہ یہ ابھی رائے نہ دیجئے کیونکہ میرا خیال ہے آپ کی رائے قہر کے شربان بخشو سے مختلف نہیں ہوگی جس سے میں نے صدارتی اور پارلیمانی نظام سے کسی ایک کے انتخاب کا کہا تو وہ قہقہہ لگا کر بولا ”صاحب ہمیں نظاموں سے کیا لینا دینا ہم تو بس اتنا جانتے ہیں، ہم، ہمارے باپ دادا اور پھر ان کے باپ دادا صدیوں سے ان جوہروں کا پانی پیتے آرہے ہیں جن سے ہمارے ذمہ و نمک پیتے ہیں، ہم بیٹنگزوں برس سے بکریوں کی طرح جھاڑیوں کے پتے کھا رہے ہیں۔“ میں نے جواب کے لیے اصرار کیا تو اس نے گلیل کو جھکا دے کر کہا ”صاحب قہر کا ہر باسی کسی ایسے نظام کا منتظر ہے جو اسے خندا، بیٹھا اور صاف پانی دلا دے۔“

آپ ابھی اپنی رائے محفوظ رکھئے کیونکہ مجھے اندیشہ ہے، آپ کی رائے ”الاخوان“ کے امیر مولانا اکرم اعوان کی سوچ سے مختلف نہیں ہوگی، میں نے ان سے پوچھا ”آپ لوگ کیسا امیر المؤمنین چاہتے ہیں۔“ وہ نہایت سنجیدگی سے بولے ”ہمارے لوگوں کو ایسا حکمران چاہیے جو ہماری طرح کیچڑ چھان کر پے یا پھر اس کی طرح ہمارے ہاتھوں میں بھی منزل وافر کی بوتلیں ہوں۔“ مجھے ڈر ہے آپ کی رائے اس محمود کے فلسفے سے مختلف نہیں ہوگی جس نے پانچ برس کی مسلسل بے روزگاری کے بعد خودکشی کر لی، آخری ملاقات میں اس نے مجھ سے کہا تھا ”جو نظام یونیورسٹی میں اول آنے والے طالب علم کو میرٹ پر نوکری نہیں دے سکتا اسے انسانوں پر حکمرانی کا کوئی حق نہیں۔“ آپ کی رائے راولپنڈی کی مسلمی سے مختلف نہیں ہوگی جس نے یتیم بہن بھائیوں کی

خطر اپنے ہی بدن میں کو کر خود کشی کر لی تھی، آپ کی رائے ڈاکٹر اشفاق سے مختلف نہیں ہوگی جو غربت سے تنگ آکر اپنا نومولود بچہ کسی کی دلہیز پر چھوڑ آیا تھا، آپ کی رائے آراسے بازار کے محمد ابراہیم سے مختلف نہیں ہوگی جس نے دم توڑتی مصیبت کے باعث اپنی دو بیٹیاں فوج کر دی تھیں اور آپ کی رائے چوہیاں کے ماسٹر صابر حسین سے مختلف نہیں ہوگی جسے نقل نہ کرانے کے "جرم" میں نوکری سے برخاست کر دیا گیا اور جو بچے سات برس سے بے گناہی کے ثبوت لیے در در بھٹک رہا ہے لیکن کسی منصف کے پاس اس کی بات سننے کے لیے وقت نہیں۔

مجھے خطرہ ہے آپ کی رائے ان ایک کروڑ ریاستوں، نظام دینوں اور محمد رشیدوں سے مختلف نہیں ہوگی جن کی عمریں فیصلوں کے انتظار میں پڑاویوں، گرداوروں، ریڈروں، اور مجسٹریٹوں کی عدالتوں میں ضائع ہو گئیں، آپ کی رائے ان گیارہ لاکھ مزدوروں سے مختلف نہیں ہوگی جو صدیوں سے سرداروں، بیروں اور چودھریوں کے ڈیروں پر پیدا ہوتے اور انہیں کے کھیتوں میں مرتے چلے آ رہے ہیں، آپ کی رائے ان ۵۰ لاکھ "چھوٹوں" سے مختلف نہیں ہوگی جنہوں نے حصول علم کی عمر گزریاں دھوئے، بچکر لگاتے اور برتن مانگتے گزاردی، آپ کی رائے قائد اعظم کے اس نواسے سے مختلف نہیں ہوگی جو پراٹھے لینے نکلا اور پولیس تشدد کا شکار ہو کر زندگی کی باری ہار گیا، آپ کی رائے ملتان کی اس نرادی سے مختلف نہیں ہوگی جس کا اکھوتا بچہ دوانہ ملنے کے باعث شتر ہسپتال کے گیٹ پر مر گیا، اور آپ کی رائے لاہور کے اس محمد فیاض سے مختلف نہیں ہوگی جس نے امداد کی ایک درخواست دی، کاغذ کا ایک ٹکڑا چار سال میں پانچ قائلیں بن گیا لیکن امداد نہیں ملی۔

جی ہاں میرا خیال ہے آپ کی رائے تھر کے ۳۱ لاکھ بخشوؤں ساڑھے چار لاکھ پڑھے لکھے بے روزگار محمودوں، ہزاروں لاکھوں مسلمانوں اشفاقوں، ابراہیموں، صابر حسینوں اور چھوٹوں سے مختلف نہیں ہوگی جنہیں پندرہویں ترمیم کے منظور یا مسترد ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، ان کی بلا سے نظام صدقاتی ہو یا پارلیمانی، فیصلے غامضے ہیں کر کیے جائیں یا وگ لگا کر، ملک کا سربراہ امیر المومنین کہلائے یا وزیر اعظم، اختیارات دفاتی حکومت کے پاس ہوں یا صوبائی سربراہوں کے ہاتھ میں، مل دو تہائی اکثریت سے پاس ہوں یا سادہ اکثریت سے، ہفتہ وار جمعی، اتوار کو ہو یا جمعہ کو، سود کا نام مارک اپ رکھ دیا جائے یا انٹرسٹ، خواتین برقعہ پہنیں، یا دودھ اوڑھیں، تعلیم عربی میں دی جائے یا انگریزی میں..... انہیں بلوں، ترمیموں اور پارلیمانی بخشوں سے کوئی غرض نہیں انہیں تو بس صاف ستھرا پانی چاہیے، باعزت روزگار، ضرورت کے مطابق تنخواہیں سستا اور فوری انصاف، آزادی، تعلیم، دوا، سڑکیں، بجلی، ٹیوب ویل اور ایک سیدھا سادا نظام چاہیے۔

جی ہاں ان لوگوں کو تنگ چاہیے، انہیں ترمیموں اور بلوں کے ڈونگے، گلاس اور جھجھ نہ پکڑائیں، ان کا مطالبہ، ان کی خواہش سمجھیں۔



شیدا چور

شیدا چور کسی افسانے کا کردار ہے، یہ افسانہ میں نے کہیں بچپن میں پڑھا تھا۔ کتاب اور مصنف کا نام تو ذہن سے محو ہو گیا، لیکن شیدا بری طرح دماغ سے چپک گیا۔

شیدے کی کہانی کچھ یوں تھی، شیدا غربت، بے روزگاری اور قانون سے مجبور ہو کر کسی تانہائی کی دکان سے ایک تان چرایا ہے۔ شیدا گڑا کر معافی مانگتا ہے، نہیں کرتا ہے، ظالم ”سیٹھ“ کے پاؤں پکڑتا ہے، لیکن اس کا دل نہیں سمجھتا اور یوں شیدے کو پولیس کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔ جرم ثابت تھا، مجرم اقرار ہی تھا، گواہ سارے زندہ تھے، لہذا پولیس کو چالان بنا کر عدالت میں پیش کرتے دیر نہ لگی۔ جج مقدمہ سن کر شیدے کو چھ ماہ کی قید سناتا ہے۔ شیدا جیسے جیسے قید گاہت کر باہر آتا ہے تو پتا چلتا ہے اس کا نام محمد رشید ہے شیدا چور ہو چکا ہے، سارا شہر، سارا محلہ یہاں تک کہ خود اس کے گھر والے اب اسے شیدا چور کہہ کر بلاتے ہیں۔ شیدا یہ دُغم بھی قدرت کا ”انعام“ سمجھ کر سہ گیا، لیکن کرنی خدا کی کیا ہوئی، انہی دنوں اسی تانہائی کے ”سیف“ سے ہزار روپے چوری ہو گئے۔ رات پولیس آئی اور شیدے کو شک میں پکڑ کر لے گئی، شیدے نے جرم سے انکار کیا تو پولیس کو جرم ”ثابت“ کرنے کے لیے چھتر دل کا سہارا لینا پڑا۔

اس بار شیدے کو ایک سال قید ہوئی، رہائی کے بعد شیدا واپس آیا تو سکہ بند چور مشہور ہو چکا تھا۔ اس کے بعد شہر میں کہیں بھی چوری، چکاری، رس گیری یا ڈکیتی کی واردات ہوتی، پولیس فوراً شے میں شیدے کو دھر لیتی۔ یوں پولیس اور چوروں کی مہربانی سے شیدا جلد ہی دس نمبری ہو گیا۔ تھانے میں اس کی تصویر لگ گئی۔ یہ افسانہ بہت طویل تھا، میں اکثر جزئیات بھول چکا ہوں، تاہم مجھے اس کا اختتام اچھی طرح یاد ہے۔ شیدا چور جب ”وصولیاں“ کراتے کراتے عین جوانی میں مر گیا تو پتا چلا وہ عین دن کے فاقے سے تھا اور اس نے زندگی میں ایک تان کے سوا (جس سے اس نے صرف ایک ہی لقمہ توڑا تھا) کبھی کوئی چوری نہیں کی۔

میں جناب حفیظ پاشا کی دیدہ دلیری کی داد دیتا ہوں، جنہوں نے دس ارب روپے کا بھت خسارہ پورا کرنے کے لیے عوام کا انتخاب کیا، قابل داد ہیں جناب سرتاج عزیز جنہوں نے اس تاریخی فیصلے کی بھرپور حمایت فرمائی اور قابل صد ستائش ہیں کاہنہ کے وہ بچپن میں اس ارکان جنہوں نے تالیاں بجا کر اس جرأت مندانہ

اقدام کا استقبال کیا۔

مجھے خوشی ہے یہ دس ارب روپے بھی غریب عوام ہی کی جیب سے وصول کیے جائیں گے۔ مجھے یہ بھی خوشی ہے کہ حکومت نے یہ رقم ان راشی افسروں کی استزنیوں سے نکالنے کی بجائے، جو فائل آگے چلانے، ایک دستخط کرنے، چند کاغذ نیچے دبانے، مخصوص نوٹ لکھنے اور وزیروں کو دھوکا دینے کے عوض ہر سال ۴۰ ارب روپے بریف کیسوں میں بھر کر گھر لے جاتے ہیں، عوام ہی کو یہ اعزاز بخشا۔

مجھے خوشی ہے حکومت نے ان ۲۰۰ بزنس مینوں اور صنعتکاروں کو پکڑنے کی بجائے جو ۹۸ کروڑ کا اگم ٹیکس دے بیٹھے ہیں، اس بار بھی اس عوام کی گردن پر ہی پاؤں رکھا جو وقت پر ٹیکس ادا کرتے ہیں، جو بجلی، گیس اور ٹیلی فون کے نادہندہ بھی نہیں۔

مجھے خوشی ہے حکومت نے اس مشکل دور میں بھی ان پائو لوگوں کو نہیں چھیڑا، جو ہر سال ۴۰ کروڑ روپے کے محصولات بجاتے ہیں، جو ۲۲ کروڑ روپے کی ایکسائز ڈیوٹی، ۳۱ کروڑ روپے کا ٹھہری پانی، ۱۲ کروڑ روپے کی لکڑی اور ۱۸ کروڑ روپے کی بجلی اور گیس چوری کرتے ہیں۔

مجھے خوشی ہے، جناب حفیظ پاشا کی نظر کرم سے وہ لوگ اس بار بھی محفوظ رہے جو سرکاری دفاتر سے سوا کروڑ روپے کی سیٹھری چوری کرتے ہیں، ۲ کروڑ کا سینٹ، سریا، گارڈر اور ٹی آئرن چراتے ہیں، پانچ کروڑ کی تاریں، گھبے ٹرانسفارمر غائب کر جاتے ہیں، پونے چھ کروڑ کی ادویات، انسٹرومنٹس اور سرلیٹوں کی خوراک کھا جاتے ہیں، ۸ کروڑ روپے کی سڑکیں جیب میں ڈال لیتے ہیں اور ۱۰ کروڑ روپے کی ٹھیلیاں، ٹالیاں اور پلیاں اڑالے جاتے ہیں۔

مجھے خوشی ہے اس بار بھی وفاقی حکومت کے ان دفاتر اور سرکاری افسروں کی ان رہائش گاہوں پر کوئی غور و فکر نہیں ہوا، جن کا ہر ماہ ۴ کروڑ ۴۳ لاکھ ۲ ہزار ۳۰ روپے کرایہ ادا کیا جاتا ہے، ان دفاتر کو پرائم سٹریٹ سیکرٹریٹ (مرحوم) میں منتقل کرنے کا کوئی منصوبہ زیر غور نہیں آیا، وہ ۲۰ لاکھ گیلن پٹرول بچانے کی فکر بھی نہیں کی گئی جو سرکاری ڈرائیور بسوں اور وٹیکوں کے آؤں پر بچ جاتے ہیں۔

مجھے خوشی ہے حکومت نے ۱۰ ارب کا یہ خسارہ بے نظیر مہم کے ان ۲۲ ارب ڈالر سے ایک آدھ ارب ڈالر وصول کر کے پورا نہیں کیا، جو انہوں نے اس ملک کی رگوں سے نچڑا تھا (۲۲ ارب ڈالر کی کرپشن کے ثبوت جناب سیف الرحمن کے پاس موجود ہیں) ان کروڑوں روپے سے پورا نہیں کیا جو جناب سیف الرحمن نے نوپوتا کر دلا ٹیکس دے کر بی ایم ڈبلیو گاڑیاں منگوا کر کمائے تھے (اس کرپشن کے ثبوت جناب نصیر اللہ باہر کے پاس موجود ہیں) ان ۱۴ ارب روپے سے پورا نہیں کیا جو نواز شریف فیملی نے بینکوں سے لیے تھے (اس کا دعویٰ جناب شفیقت محمود سابق سینئر کرتے ہیں) ان اربوں روپے سے پورا نہیں کیا جو فاروقی برادران نے یہاں سے سیٹے تھے (ثبوت احتساب سیل نے ٹی وی پر دکھائے تھے) ان کروڑوں روپے سے پورا نہیں کیا جو

آصف علی زرداری کے دوست تین سال تک لوٹتے رہے (ثبوت اخبارات میں شائع ہوتے رہے) ہاں محترم قارئین! میں واو دیتا ہوں حکومت کے ان اکنائک خیردوں کی جرأت اور حوصلے کی، جنہوں نے سابق تجربات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس بار بھی بے زبان لوگوں کو ہی قربان گاؤ پر لا کھڑا کیا، میں حکومت کی عقل مندی اور دانشوری کو بھی سیلوٹ پیش کرتا ہوں، جس نے اس بار بھی اپنے بھائی بندوں کو صاف بچا لیا اور میں آپ کی بے حسی اور ڈھٹائی کو بھی صد سلام پیش کرتا ہوں جو یہ حادثہ بھی بظلوں میں ہاتھ دے کر سہہ گئے۔

کبھی کبھی مجھے محسوس ہوتا ہے ”ہم“ اس ملک کے ۹۰ فیصد، ہم سب شیدے چور ہیں اور ساری حکومتیں پولیس، چوری خواہ کسی محلے میں ہو، مال کہیں سے اڑایا جائے اور ڈکیت خواہ کوئی ہو، وصولی صرف ہم سے کی جاتی ہے، الٹا صرف ہمیں ہی لٹکایا جاتا ہے، چھترول صرف ہماری ہی ہوتی ہے، سزا صرف ہمیں سنائی جاتی ہے قید صرف ہم ہی کانتے ہیں اور چور صرف ہم ہی کہلاتے ہیں، شیدے چور!



Kashif Azad @ OneUrdu.com

کنسلٹنٹ

کسی صاحب کی مرغیاں اٹھائیں وہ کسی "سیانے" سے مشورے کے لیے گئے۔ سیانے نے پوچھا: "مرغیاں کتنی ہیں؟" صاحب نے جواب دیا "۳۵" سیانے نے پوچھا "اور سرخے کتنے ہیں؟" صاحب نے فوراً جواب دیا: "کوئی نہیں۔" سیانے نے قہقہہ لگا کر کہا: "پھر مرغیاں اٹھائے کیسے دیں گی؟ بابا وہاں ڈربے میں مرغا رکھو۔"

کچھ دن گزرے تو سیانا "موقع واردات" کے معائنے کے لیے "صاحب" کے گھر پہنچ گیا۔ میزبان نے بڑے تپاک سے مہمان کا استقبال کیا، گھر کے اندر لایا، سامنے صحن میں ۳۵ مرغیاں اور دو مرتے مرغی گشت کر رہے تھے، سیانے نے حیرت سے پوچھا: "جناب میں نے آپ کو ایک مرغی دیکھنے کا مشورہ دیا تھا، لیکن آپ نے دو رکھ لیے۔" صاحب نے مرغیوں کے درمیان گردن تان کر چلتے مرغیوں پر نظر ڈالی اور فخر سے بولے: "مرغا تو ان میں ایک ہی ہے، دوسرا کنسلٹنٹ ہے۔"

پاکستان میں اس وقت دو ہزار ایک سو سترہ کنسلٹنٹ کام کر رہے ہیں، جن میں ۷۲۰ غیر ملکی ہیں جبکہ باقی غیر ملکی نما پاکستانی ہیں، ان میں ایک بھی ایسا نہیں جس کی تنخواہ دس ہزار ڈالر سے کم ہو، جس کے پاس دنیا جہاں کی تہذیب سے آراستہ سرکاری گھر نہ ہو، دو سے چار تک گاڑیاں، نصف درجن ملازمین اور اتنے ہی گارڈز نہ ہوں جبکہ یہ لوگ کر کیا رہے ہیں؟ بیٹکوں کو بیٹکاری سکھا رہے ہیں، انجینئروں کو مشینری، ڈاکٹروں کو مرہم پٹی، کسانوں کو بیج بونے اور اساتذہ کو پڑھانے کے طریقے سکھا رہے ہیں۔

حکومت نے آج سے دس برس پہلے سائنس کا سلیبس تیار کرنے کے لیے اسلام آباد میں ادارہ بنایا اور پنجاب کی ایک یونیورسٹی کے وائس چانسلر کو اس کا ڈائریکٹر جنرل لگا دیا۔ دنیا کے ایک بڑے مالیاتی ادارے نے پاکستان کی مشکل سمجھتے ہوئے اس "نیک" کام کے لیے امداد بھی دے دی، ابھی یہ ادارہ سلیبس کے لیے "تیاریاں" ہی پکڑ رہا تھا کہ "لوپر" سے نصف درجن آسٹریلین کنسلٹنٹس رکھنے کا حکم آگیا جن کے لیے ۶۰ ہزار ڈالر تنخواہ، سرکاری رہائش، بچوں کے لیے مفت تعلیم، اسے کلاس میڈیکل اور دو دو گاڑیاں ملے ہوں، کنسلٹنٹس آگئے۔ انہوں نے ڈی جی سمیت سارے عملے کو ہال میں جمع کیا اور تیسری دنیا میں سائنس کے جدید سلیبس پر

لیکچر دینا شروع کر دیا۔ جب لیکچر اختتام پذیر ہوا تو لچ شروع ہوا، کھانے کی میز پر گفتگو شروع ہوئی تو معلوم ہوا چیف کسٹنسٹ "سپل گریجویٹ" ہے اور اس نے آسٹریلیا کی جس یونیورسٹی سے گریجوایشن کی اس ادارے کے ڈی جی نے اسی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی تھی۔ مزید دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اس انکشاف کے باوجود کسٹنسٹ نہ صرف دو برس تک پاکستان میں کام کرتے رہے بلکہ تمام سرکاری مراعات سے بھی پوری طرح لطف اندوز ہوتے رہے۔

عالمی بینک نے پاکستان کو زرعی تحقیق کے لیے ۶۵ ملین روپے کی امداد دی، حکومت نے فوراً کسٹنسٹس سے رابطہ کیا جنہوں نے نہایت ہی عرق ریزی سے پاکستان کو انگریز کپڑوں پر ڈراما ۲ مرتب کر کے دیا۔ پروگرام پر عملدرآمد شروع ہوا تو چٹا چلا کاغذی کارروائی ملازمین اور کسٹنسٹس کی تنخواہوں، ہوش کے بلوں، پنشن الاؤنسز، ایئر ٹکٹنگ، رہائش اور چند دیگر "غیر نصابی سرگرمیوں" پر ۱۵۳ ملین روپے (امداد صرف ۶۵ ملین روپے تھی) خرچ ہو چکے ہیں جبکہ اصل کام شروع ہونے کا ابھی دور دور تک کوئی امکان نہیں۔

کچھ عرصہ پہلے حکومت نے جنگلوں (جنگل کا ایک علاقہ) کو "جیرس" بنانے کا فیصلہ کیا۔ سوچ بچار شروع ہوئی تو کسی نیک نیت کسٹنسٹ نے مشورہ دیا: "جناب اس وقت کھنڈروں میں ایک فرم کا چہار دانگ عالم براج چاہے، اگر انہیں جنگلوں کی صفائی کا ٹھیکہ ملے دیا جائے تو وہ چند ہی روز میں دورہ کا دورہ اور پانی کا پانی کر دے گی۔" یہ مشورہ مہنگے کسٹنسٹ کا قیمتی مشورہ سمجھ کر فوراً مان لیا گیا۔ کھنڈروں کو ٹیکس کیا گیا، بجٹ بھیجے گئے، کسٹنسٹ آئے، جنگل کا نقشہ دیکھا اور سیدھے ہو کر بولے: "یہ تو پہاڑی علاقہ ہے" جواب دیا: "ہاں جناب ایسا تو ہے۔" بولے: "ایسے علاقوں کے جائزے کے لیے تو بجلی کا پتھر چاہیے، کیا آپ انورڈ کر سکتے ہیں؟" سننے والوں کے سینے پر گھونسا سا پڑا اور انہوں نے فوراً کہا: "جناب ہم اتنے بھی غریب نہیں کہ دو چار بجلی کا پتروں کا بندوبست نہ کر سکیں۔" لہذا اسی وقت دو چار بجلی کا پتھر کسٹنسٹس کے حوالے کر دیے گئے، جنہیں وہ دونے تک جنگل کے خشک پہاڑوں میں استعمال کرتے رہے دورہ ختم ہوا تو وہ انگریسٹ کے مطابق ڈالر جیب میں ڈال کر ۷۰ صفحات کی ایک رپورٹ تھما کر چلے گئے۔

کسی کسٹنسٹ نے مشورہ دیا: "جناب ملک میں سینٹ کے پلانٹ تو بہت ہو چکے ہیں، لیکن وہ ہیں سارے بے ٹکے۔" پوچھا گیا: "کیا مطلب؟" کسٹنسٹ نے کہا: "جناب زیادہ تر پلانٹس ان علاقوں میں لگائے گئے، جہاں سینٹ کی کھپت نہ ہونے کے برابر ہے۔" پوچھا گیا: "پھر؟" کسٹنسٹ نے کہا: "پھر سینٹ کی ترسیل پر اتنے پیسے خرچ ہو جاتے ہیں جتنے اس کی تیاری پر بھی نہیں ہوتے۔" پوچھا گیا: "پھر کیا کیا جائے؟" کسٹنسٹ نے جواب دیا: "جناب فوراً غذائی کرائی جائے کہ مستقبل قریب میں کن کن علاقوں میں سینٹ کی زیادہ ضرورت ہوگی؟ پوچھا گیا: "اس کا کیا فائدہ ہوگا؟" کسٹنسٹ نے کہا: "تاکہ حکومت آئندہ صرف انہی علاقوں میں پلانٹ لگانے کی اجازت دے۔" کہا گیا: "ٹھیک ہے کرا لیں۔" تو کسٹنسٹ نے

انکشاف کیا۔ ”جناب اس کام کے لیے جتنی مہارت میکینیک کی ایک کہنی کو حاصل ہے اتنی کرۂ ارض پر کسی دوسرے ادارے کو نہیں۔“ کہا گیا: ٹھیک ہے انہیں ہی بلا لیں۔ ”یوں کنسلٹنٹ کی مہربانی سے ۲۳ اپریل ۹۸ کو میکینیک کے کنسلٹنٹس آئے، حکومت نے انہیں ہیلی کاپٹر لے کر دیا اور وہ پاکستان کا فضائی جائزہ لے کر چلتے جے۔ لاہور کے ایک نیم سرکاری ادارے نے جاپان سے ایک صنعتی یونٹ خریدا، اسے لگانے کے لیے انجینئروں کی ایک ٹیم یہاں آئی تو فیشن کے طور پر ایک کنسلٹنٹ بھی بلا لیا گیا جو سارا دن چھتری کے نیچے بیٹھ کر منرل واٹر پینا اور گردن سے پسینہ پونچھتا رہتا۔ جب کام ختم ہو گیا اور ٹیم رخصت ہونے لگی تو اس نے میزبان کو ایک رقعہ نکال کر دکھایا اور بولا: ”کیا آپ مجھے اس جگہ لے جاسکتے ہیں۔“ میزبان نے رقعہ پڑھا تو اس پر گوجرانوالہ کے کسی خرا دیے، کا پتا درج تھا، میزبان نے حیرت سے وہاں جانے کی وجہ پوچھی تو کنسلٹنٹ سرشاری سے بولا: ”یہ شخص میرا استاد ہے، میں نوکیو میں شیشری کا کام کرتا تھا، یہ وہاں غیر قانونی طور پر رہتا تھا، ہمارے فلیٹ قریب قریب تھے۔ ایک روز جھٹی کے دن ہم اکٹھے ہوئے تو اس نے کہا: ”یاد تم عجیب شخص ہو مشینوں کے زمانے میں کاپیاں فلسفیں بیچ رہے ہو، میرے والا کام میکرو کل کو چار پیسے کھاؤ گے۔“ مجھے اس کی بات میں وزن محسوس ہوا، لہذا میں نے اس سے کام لیکن شروع کر دیا۔ یہ روز ٹیکنری سے آنے کے بعد مجھے دو گھنٹے لکچر دیتا ہوں میں سال چھ ماہ کی تعلیم کے بعد اس کے ساتھ ٹیکنری میں ملازم ہو گیا وہاں بھی یہ مجھے سکھاتا رہا، پھر اس کی بھی بیکار ہو گئی تو یہ وطن واپس آ گیا۔“

Kashif Azad

مجھے کنسلٹنٹس کے کردار پر کوئی اعتراض نہیں، فقط اعتراض ہے تو یہ کہ شاید ہم دنیا کی واحد قوم ہیں جو اپنا قیمتی اثاثہ غیر ملکی ”ماہرین“ کے حوالے کر کے کہتی ہے: ”جناب آئیں اور آکر ہمیں سمجھائیں کہ کھانا کیسے کھاتے ہیں؟“ گندم بونے کا موسم کون سا ہے، بیمار کے لیے علاج کتنا ضروری ہے، بچوں کو حفاظتی ٹیکے کیوں لگانے چاہئیں اور ہمارے لیے تعلیم کتنی اہم ہے؟ ہم ہر سال ان کنسلٹنٹس پر کتنے لاکھ ڈالر خرچ کرتے ہیں، سوچا کس نے؟

محترم نواز شریف ایک بار تجربہ کر کے تو دیکھیں ہو سکتا ہے مرغا کنسلٹنٹ کے بغیر ہی مرغیوں کو انڈے دینے کے لیے قائل کر لے۔



چائے میٹھی نہیں ہوتی

ایک سردار جی کپ میں جج ہلاتے، چائے کی چسکی لیتے، ہراسمانہ بناتے، کپ نیچے رکھتے اور دوبارہ جج ہلانے لگتے، پھر کپ اٹھاتے، چسکی لیتے، ہراسمانہ بناتے اور کپ نیچے رکھ کر جج ہلانے لگتے، جب یہ عمل پانچ سات بار دوہرا چکے تو جج ٹرے میں پھینک کر بولے "تو بھئی دوستو ایک بات تو طے ہو گئی۔" دوستوں نے چونک کر پوچھا "کیا؟" سردار جی اسی یقین سے بولے "یہی ناں کہ اگر چائے میں مینہ نہ ہو تو لاکھ جج ہلا کر کیا چائے میٹھی نہیں ہو سکتی۔"

مجھے غصہ جناب سر تاج عزیز پر نہیں ان کے ان ملاقاتیوں پر ہے جو ان کے دفتر جاتے ہیں اور ان کا یہ اعلان سن کر کہ اگر ہم بحالی فی ثانی پر وسط کرویں تو ہمیں ساتھ سے پارا ایب ڈالری کی ادھو بٹے گی۔ واپس آجاتے ہیں لیکن انہیں ٹوک کر، ایک لمحے کے لیے ٹوک کر یہ نہیں پوچھتے "جناب یہ رقم خرچ کہاں ہوگی، کیا اس سے وہ ریلوے لائن زندہ ہو جائے گی جو برسوں پہلے ۷۵ء ۸۰ء کلومیٹر پر پہنچ کر دم توڑ گئی تھی۔ اس رقم سے ۸۱ء ریلوے سیشنوں میں اضافہ ہوگا، ایک لاکھ ۶ ہزار ایک سو ۶ کلومیٹر مینگی مرکز بس کی جائیں گی، ۱۳۰ ہزار سو ۱۹ پوسٹ آفسز کی تعداد بڑھا دی جائے گی یا ۲۳۱۷ ایڑیاں رگڑتے مریضوں کو ایک کی بجائے دو ڈاکٹر دیئے جائیں گے، دانت درد کے ۴۲ ہزار سو ۲۳ مریضوں کے لیے ایک کے بجائے دو ڈاکٹروں کا بندوبست کیا جائے گا، ۵ ہزار ۴ سو ۶۰ چیتھے چلاتے مریضوں کو ایک نہیں تین چار زیس فرام کی جائیں گی، زرچی کے دوران مرنے والی ۱۱ ہزار ۵ سو عورتوں کی زندگی بچانے کے لیے گولیوں اور ٹیکوں کا بندوبست کیا جائے گا، غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزارنے والے ۳ کروڑ لوگوں کے لیے ایک وقت کے کھانے کا انتظام کیا جائے گا، ہولنو، ورک شاہیں اور مرکوں پر کام کرنے والے ۳۶ لاکھ نابالغ بچوں کی تعلیم کا بندوبست کیا جائے گا اور ۳ کروڑ ۸۱ لاکھ ۸۰ ہزار مزدوروں کی تنخواہوں میں ایک ایک سو روپے کا اضافہ کر دیا جائے گا۔

انہیں نوک کر ایک لمحے کے لیے نوک کر نہیں پوچھتے ”جنتاب کیا گارنٹی ہے یہ رقم بھی ان ایک سو پچاس کروڑ کے اکاؤنٹس میں منتقل نہیں ہو جائے گی جو عوام کے ۲۱۰ ارب روپے ”ماز“ کر بیٹھے ہیں، ان ۳۵ افراد کے خزانوں میں دفن نہیں ہو جائے گی جنہوں نے سوارب ڈالر لوٹ کر غیر ملکی بینکوں میں جمع کر رکھے

ہیں، ان ۵ فیصد جاگیرداروں کا رزق نہیں بن جائے گی، جو ۷۰ فیصد قابل کاشت زمین پر قابض ہیں، ۲۷ کروڑ کی طرح یہ بھی منصوبہ ۲۰۱۰ء کے فائل ورک پر خرچ نہیں ہو جائے گی یہ بھی ۲۰ وفاقی وزراء، ۶ وزراء، مملکت ۴ مشیروں، قومی اداروں کے ۸ چیئرمینوں، اڑھائی ورجن پارلیمانی سیکرٹریوں اور سینٹ اور قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹیوں کے ۵۰ چیئرمینوں کا ساڑھے تین کروڑ روپے روزانہ خرچ پورا کرنے پر صرف نہیں ہو جائے گی، ۲۰۰ ارب روپے سالانہ کی طرح یہ بھی وزارتوں کے اخراجات، سرکاری پٹرول، ٹیلی فون، بجلی، گیس اور دفتر کے کرایوں پر خرچ نہیں کر دی جائے گی، یہ بھی تین شیڈول بینکوں کے ۲۹۷ ایڈوائزروں کی ۸ کروڑ ۹۱ لاکھ ماہانہ تنخواہوں پر خرچ نہیں ہو جائے گی۔"

انہیں نوک کر ایک لمحے کے لیے نوک کر نہیں پوچھتے "جناب آپ دعویٰ سے کہہ سکتے ہیں یہ رقم سینٹ کے ۸۷ ارکان کی ۲۳ لاکھ ۶۰ ہزار ماہانہ تنخواہوں اور ۴ کروڑ ۳ لاکھ ۳۸ ہزار کی مراعات پر خرچ نہیں ہوگی، یہ رقم بھی قومی اسمبلی کے سپیکر اور ڈپٹی سپیکر کے ۸۷ لاکھ ۷۶ ہزار روپے نہیں بن جائے گی، یہ بھی ۲۰۰ وفاقی اور صوبائی وزیروں، مشیروں اور جیش اسسٹنٹس کو صوابدیدی فنڈ، جیش الاؤنسز اور فی اے ڈی اے میں نہیں دے دی جائے گی۔"

انہیں نوک کر ایک لمحے کے لیے نوک کر نہیں پوچھتے "جناب کیا آپ یقین دہانی کر سکتے ہیں یہ رقم ارکان اسمبلی میں تقسیم نہیں ہوگی، سرکاری ٹھیکے داروں کی جیب میں نہیں جائے گی، گریٹ بیورو کریسی کے گھروں، فارموں اور پلازوں پر خرچ نہیں ہوگی، اس سے وزیر لندن میں فلیٹ نہیں خریدیں گے، اس سے "ہیئر وز، لینڈ کروزرز اور کروڈا نہیں خریدی جائیں گی، اس سے ذاتی فیکٹریاں نہیں لگائی جائیں گی، اس سے جعلی سکول، سرکس، ہل اور کانغذی شہریں خوب ویل اور ٹینکیاں نہیں بنائی جائیں گی، اس سے ڈیروں کو سکول اور احاطوں کو ہسپتال قرار نہیں دیا جائے گا، یہ پارٹی اکاؤنٹس میں جمع نہیں ہوگی، اس سے جیالوں اور پروانوں کو نوکریاں نہیں دی جائیں گی اور اسے دوروں، جلسوں، ریلیوں اور کانفرنسوں پر ضائع نہیں کیا جائے گا"

انہیں نوک کر ایک لمحے کے لیے نوک کر پوچھا جائے تو مجھے یقین ہے ان کے پاس کوئی کارروائی، کوئی دعویٰ اور کوئی یقین دہانی نہیں ہوگی، یہ سنے پر ہاتھ رکھ کر اور آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کوئی وعدہ کوئی اعلان نہیں کر سکتے کیونکہ یہ جانتے ہیں جب بھی یہ رقم پاکستان آئی اس سے ایک ڈالر بھی ان مستحق لوگوں تک نہیں پہنچے گا جن کی آزادی کے عوض یہ رقم حاصل کی گئی تھی، مزدور ان ساڑھے چار ارب ڈالروں کے بعد بھی مزدور ہی رہے گا، وہقان، وہقان، ان پڑھ، ان پڑھ اور بیمار بیمار ہی رہے گا، یہ زرد سورج اسی طرح اگے گا، یہ محروم زندگی اسی طرح محروم رہے گی۔

خدا کے لیے انہیں نوک کر ایک لمحے کے لیے نوک کر کہیے "جناب پیالی میں چھج بلا تا بندہ کر دیں کیونکہ یہ بڑے ہو چکا ہے اگر چائے میں چینی نہ ہو تو لاکھ چھج بلائے جائیں چائے میٹھی نہیں ہوا کرتی۔"

”بالٹیاں“

میرا چھوٹا بیٹا دو برس کا ہے، آج کل کے بچوں کی طرح بلا کا ضدی اور ہٹ دھرم ہے، جس بات پر اڑ گیا ساری دنیا اُدھر کی اُدھر ہو جائے اس کا ایک ہی اعلان ہوتا ہے ”ہمارے مطالبات پورے کیے جائیں، ہم نہیں مانتے، ظلم کے یہ ضابطے، ہم مطالبات پورے ہونے تک جدوجہد جاری رکھیں گے۔“ وغیرہ وغیرہ۔ ہمارا پورا گھر اس کی ضد اور ہٹ دھرمی سے تنگ ہے لیکن آج کل کے بے بس والدین کی طرح ہم کچھ بھی نہیں کر سکتے، کیونکہ بچہ آخر بچہ ہے اسے نہ مار سکتے ہیں، نہ سمجھا سکتے ہیں، بس اچھے وقت کا انتظار کر سکتے ہیں سو کر رہے ہیں۔

کچھ روز پہلے کا قصہ ہے ”محترم“ ایک ٹوٹی بالٹی اٹھا لائے، بالٹی کا پینڈا نہیں تھا، اب ”محترم“ کا اصرار تھا یہ بالٹی پانی سے بھری جائے، میری بیوی نے کوشش کی ظاہر ہے ناکام رہی، میرے بھائی نے آدھے گھنٹے تک محنت کی لیکن نتائج صاف ظاہر تھے، میں گھبرا آیا تو میں نے بالٹی بڑے پائپ کے نیچے رکھ دی لیکن بے پینڈا بالٹی میں پانی کیسے بھرتا، ہم سب تھک گئے لیکن ”محترم“ ہاتھ پیچھے باندھے کھڑے رہے ہم نے جوں ہی ناکامی کا اعلان کیا انہوں نے ہماری ”نااہلی“ پر فرش پر لیٹ کر اعلان بغاوت فرما دیا، ہم نے بہت منایا، بخش کیں، مارکیٹ لے جانے کا جھانسہ دیا، بالٹی کی ”معدوری“ کی ٹھٹکیں وجوہات بیان کیں، اس نیک کام کے لیے دوسری بالٹی کی پیشکش کی لیکن اگر بچہ مان جاتا تو بچہ تو نہ ہوتا، لہذا ہم مجبوراً بچے کے سونے تک باری باری بالٹی بھرنے کی کوشش کرتے رہے۔

حکومت نے ”چار ج“ سنبھالتے ہی تین قومی بینکوں (نیشنل بینک، یونائیٹڈ بینک اور حبیب بینک) میں اپنے صدر تعینات کر دیئے، ان میں سے ایک بینک کے صدر، پیپلز قومی اسمبلی الٹی بخش سومرو کے صاحبزادے زبیر سومرو ہیں، دوسرے بینک کے سربراہ انیس کے عزیز میاں محمد سومرو ہیں جبکہ تیسرے بینک کے صدر سٹی بینک کے امیر یا منیجر اور وزارت خزانہ کے خواہش مند شوکت ترین ہیں، ان تینوں صدور نے، جو ۱۲ سے ۱۴ لاکھ روپے ماہانہ تنخواہ پاتے ہیں، عمران اقدار سنبھالتے ہی بینکنگ سسٹم میں ”آئین ساز“ تبدیلیوں کا آغاز کر دیا، ایک صاحب نے حکومت کی ایما پر ۱۱۸ یلو انڈرز ”ملازم“ رکھ لئے، دوسرے نے پانچ ہزار ملازمین

فارغ کر کے ان کی جگہ ۲۳۰ "ایڈوائزرز" بھرتی کر لیے جب یہ خبر تیسرے صدر تک پہنچی تو انہوں نے سوچا میں کیوں پیچھے رہوں لہذا انہوں نے بھی فوراً ۳۹ ایڈوائزرز کا بندوبست کر لیا، یوں اوپر تلے قومی بینکوں میں ۲۹ ایڈوائزر بھرتی کر لیے گئے۔

جب ان ۲۹ ایڈوائزرز کی تنخواہیں طے کرنے کا وقت آیا تو ان کی کم سے کم تنخواہ تین لاکھ روپے ماہانہ طے ہوئی جبکہ انہیں تین سال کے لیے کرائے پر رہائش گاہیں اور ایک ایک زیر میٹر گاڑی بھی فراہم کر دی گئی یوں ۱۸ ایڈوائزرز والے بینک پر ۵۳ لاکھ روپے ماہانہ کا بوجھ پڑنا شروع ہو گیا، ۲۳۰ ایڈوائزرز والا بینک ۷۰ کروڑ ۲۰ لاکھ روپے ماہانہ ادا کرنے لگا اور ۳۹ ایڈوائزرز والے بینک نے ایک کروڑ ۷۰ لاکھ روپے ماہانہ کی اضافی ادائیگی شروع کر دی۔ یوں پاکستان کے مالیاتی ذخائر پر ۸ کروڑ ۹۱ لاکھ روپے ماہانہ کا ڈاکہ پڑنے لگا جبکہ ان لوگوں کو تین سال کے لیے ۳۳ کروڑ ۵۵ لاکھ روپے بطور ہاؤس ریٹ (فی ایڈوائزر تقریباً ۱۵ لاکھ روپے) اور گاڑیوں کی خریداری کے لیے بطور ایندھن ۲۳ کروڑ ۷۰ لاکھ روپے ادا کیے گئے اوسطاً ۸ لاکھ روپے فی ایڈوائزر)

ان تقرریوں کے دوران خصوصی طور پر خیال رکھا گیا کہ ان ۲۹ ایڈوائزرز میں ایک بھی ایسا شخص نہ آنے پائے جو کسی برائے کام کا نفعرہ ہو، جو اس سلسلے سے بینکنگ سسٹم کے بارے میں پنیادی علم رکھتا ہو، جس نے اکاؤنٹ کھولنے، قرضہ دینے اور وصولیاں کرنے کا کام سیکھا ہو، جو بین اور بین کا فرق جانتا ہو، جو بینک کاٹ سکتا ہو یا جسے بینکس شیٹ کی تمیز ہو، اس کھیل کا ایک اور انداز دیکھئے کہ ایک بینک کے صدر نے ایک ایسے ۳۲ سالہ نوجوان کو اسلام آباد کا ریجنل چیف بنا دیا جس کا بینکاری کا تجربہ ہی چند سال سے زیادہ نہیں۔

یہ ایڈوائزرز انٹرنیشنل پریذیڈنٹ اور سینئر ایگزیکٹو افس پریذیڈنٹ کی حیثیت سے کچھلے ایک برس سے تین سے سارے تین لاکھ روپے ماہانہ تنخواہ پا رہے ہیں لیکن بینک کا وہ سینئر ایگزیکٹو افس پریذیڈنٹ جو چالیس برس کی جہد مسلسل کے بعد اس عہدے تک پہنچتا ہے صرف ۵۰ ہزار روپے ماہانہ تنخواہ لیتا ہے تو اس حکم پر جہاں اصلی سی ای وی پی حضرات دل براشت ہو چکے ہیں وہاں انہوں نے کام بھی تقریباً بند کر دیا ہے۔

انہیں ایڈوائزرز میں سے ایک صاحب میر سے جاننے والے ہیں، مفتے میں ایک آدھ بار ان سے ملاقات ہو جاتی ہے، ایک روز جب ہم اپنے ایک مشترکہ دوست کے جنازے سے واپس آ رہے تھے تو آپاڑہ چوٹ کراس کرتے ہوئے ان کا ایمان زندہ ہو گیا اور وہ گلو میر نیچے میں بولے "جاوید میں کبھی کبھی سوچتا ہوں، یہ حرام خوری کہیں نہ کہیں تو فوت کی جاتی ہوگی، کبھی نہ کبھی تو اس کا حساب ہوگا، کسی نہ کسی جگہ تو ہمارا احتساب ہوگا۔" میں نے دوستی کے احترام میں خاموشی ہی میں عافیت جانی، مگر وہ میرے رد عمل پر غور کیے بغیر خود کھامی کے انداز میں مسلسل بولتے گئے "قوموں کو غربت نہیں حرام خوری مارتی ہے، ذمی ویلوشن نہیں، احتساب میں وٹری بر باد کیا کرتی ہے۔" میں نے انہیں اداسی کی اس را سے نکالنے کے پوچھا "آپ لوگ کرتے کیا ہیں؟"

انہوں نے چوک کر مجھے دیکھا اور زہریلے انداز میں ہنس کر بولے "بتایا نہیں حرام خوری، تنخواہیں بے شمار، کام کچھ بھی نہیں" گاڑی شاہراہ دستور پر داخل ہو رہی تھی انہوں نے فارن آفس پر ایک نظر ڈالی اور بہت ہی دیکھی لہجے میں بولے "بینک میں کام کرنے والے چیز اسی پر تو کوئی نہ کوئی ذمہ داری عائد ہوتی ہے، اسے تو کچھ نہ کچھ کر کے دکھانا پڑتا ہے لیکن ہم پر کوئی ذمہ داری نہیں، ہماری کوئی اسے سی آر نہیں، ہم نے کچھ کر کے نہیں دکھانا۔" پھر بھی آپ کچھ نہ کچھ تو کرتے ہی ہوں گے۔" میں نے نہایت بیچگانہ سوال کیا "ہاں کرتے ہیں" ان کے لہجے میں گہری سیاہ رات کا درد تھا۔ "مینٹگ کرتے ہیں، جس میں ایک دوسرے کو اپنے اپنے خاندانی پس منظر، حکومت میں اپنے اثر و رسوخ، بین الاقوامی ایجنسیوں سے اپنے رابطوں اور اپنے غیر ملکی دوروں کی روداد سناتے ہیں، اپنی اپنی پہنچ کا مقابلہ کرتے ہیں، وزیر اعظم سے اپنی بے تکلفی اور صدر سے اپنے خاندانی مراسم کی کہانیاں بیان کرتے ہیں اور واپس گھر آ جاتے ہیں۔"

میں ہچھلے چند روز سے سوچ رہا ہوں اگر حکومت یہ ۸ کروڑ ۹۱ لاکھ روپے ماہانہ (ایک ارب ۸ کروڑ سالانہ) اور ۶۸ کروڑ ۳۱ لاکھ (ہاؤس رینٹ اور کارائیڈانس) پچالٹی تو کیا جناب حفظ پاشا کو "بجٹ خسارہ" پورا کرنے کے لیے پٹرول کی قیمتوں میں ۲۵ فیصد اضافہ کرنا پڑتا؟ حکمرانوں کے خلاف ہائے ہائے کے نعرے لگتے، پتے جلائے جاتے، ہجیر روز پر نفرت سے تھوکا جاتا، ٹالیوٹ کے سامنے معذرت خواہانہ رویہ اختیار کیا جاتا تو ایک ہی جواب آتا ہے، بے وقوف یہ کار سرکار ہے اگرچہ نہیں اس کا اذراگ ہوتا تو تم بھی سازھے تین لاکھ روپے ماہانہ پانے والے ایڈوائزر نہ ہوتے۔"

ہاں محترم قارئین مجھے اس حکومت اور اپنے ضدی اور بیٹ دھرم بیٹے کی خواہش میں کوئی فرق نظر نہیں آتا، میں اپنے وزیر اعظم، کابینہ کے ارکان اور سارے اکنامک فیجروں کو پشت پر ہاتھ باندھے کھڑا دیکھ رہا ہوں جبکہ اس ملک کے ۹۰ فیصد بے بس، مجبور اور محروم لوگ مسلسل ایسی باتیاں بھرنے کی کوشش کر رہے ہیں جن کے پیندے ہی نہیں۔



مردہ فروشوں کی منڈی

ٹھیک اسی لمحے جب وزیراعظم پاکستان میاں نواز شریف شیخ حسینہ واجد کے ساتھ ڈھاکہ کے نواح "سادار" میں کئی ماہی کے "شہداء" کی یادگار پر پھول چڑھا رہے تھے تو ادھر شہید بینار کا ایک "مقتول" بھگالی دوسری بھگالی لاش سے پوچھ رہا تھا، "تمہیں یاد ہے ہمیں ۷ اومبر ۷۷ کو کیسے قتل کیا گیا تھا؟" دوسری لاش نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور بڑے کرب سے بولی: "ہاں ہمیں گھروں سے نکالا گیا، اس چوک میں جمع کیا گیا، یہاں سٹیج بنایا گیا، تماشاکی جمع ہوئے، تالیاں بجائی گئیں اور پھر ہم میں سے ڈراما گئے جوانوں کو الگ کر کے سٹیج پر بلایا گیا۔ کئی باپنی کے بریگیڈیئر عبدالقادر صدیقی نے رونال لہرایا اور پھر ان لوگوں نے ہمیں ٹھنڈوں، مکوں اور لاتوں سے مارنا شروع کر دیا۔ جب ہم اٹھ کھڑے ہو کر گھر گئے تو ان "شہیدوں" نے سگینوں سے ہمارے پیٹ چاک کیے، ہماری ایک ایک آنت باہر نکالی، ہمارے دل، ہمارے پیچھڑوں اور ہمارے گردوں کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کیے اور پھر انہیں جوڑ کر "بے ہنگم" لکھا۔"

ٹھیک اسی لمحے جب میاں نواز شریف اللہ تعالیٰ سے ملتی باپنی کے "شہیدوں" کے درجات بلند کرنے کی دعا مانگ رہے تھے تو ادھر محمد پور، گلشن کالونی اور نیو مارکیٹ کے غیر بینکالیوں کی لاشیں ایک دوسرے سے پوچھ رہی تھیں "تمہیں یاد ہے ہمیں کیسے قتل کیا گیا تھا؟" پانچ برس کا ایک بچہ اٹھا اور بولا: "ہاں یہ "شہید" بے ہنگم کے نعرے لگاتے ہوئے ہمارے گھر داخل ہوئے، میری ماں کو جیپ میں ڈال کر لے گئے، میرے باپ کو گولی مار دی اور میرے ہاتھ پاؤں باندھ کر میری نفس میں سرخ آڑوں کر چلے گئے، یوں میں اپنے ہی لہو میں ڈوب کر مر گیا۔" دوسرے بچے نے پٹ سے آنکھیں کھولیں اور تہقہ لگا کر بولا: "مجھے تو شہیدوں نے بڑے ہی انوکھے انداز سے قتل کیا۔ انہوں نے مجھے بازو سے پکڑ کر اٹھایا، میرا سر دروازے کے چوٹی فریم کے ساتھ لگایا اور پھر میرے ماتھے پر کیل فٹوئیک دی اور میری لاش ایک پتھر تک اسی دروازے سے لٹکتی رہی۔"

ٹھیک اسی لمحے جب میاں نواز شریف کئی باپنی کے "شہیدوں" کے احترام میں سر جھکائے کھڑے تھے تو ادھر عظیم پور، دھان منڈی اور فیمل خانہ کے سندھی "مقتول" ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے "تمہیں بتا ہے ہم کیسے مارے گئے تھے؟" پاک فوج کے ایک جوان کی لاش نے آنکھ کھولی اور چلا کر بولی: "ہاں میں راشن

لینے آیا تھا "شہیدوں" نے مجھے جیب سے اتارا، سر بازار میرے کپڑے اتارے اور پھر بلینڈوں سے میرے اعضاء کو گوشت کا ٹوٹھا بنا دیا۔ "دوسرا سپاہی اٹھا اور بولا: "ان "شہیدوں" نے مجھے پکڑا اور ننگ کر کے کہا پاکستان کو ماں کی گالی دے، میں نے انکار کر دیا تو ان لوگوں نے چھریوں سے میرا انک اٹک اٹک کر دیا۔" تیسرے سپاہی نے سر اٹھایا اور لاشوں کو مخاطب کر کے بولا: "مجھے میرے مرے ہوئے بھائی کا خون چاٹنے کا حکم دیا گیا، میں نے انکار کر دیا تو "شہیدوں" نے میری کٹی ہوئی انگلی میرے منہ میں ڈال کر کہا "پھر اپنا ہی لہو پیو" جو تھے سپاہی نے پیچ ماری اور چلا کر کہا "شہیدوں" نے میرے اوپر پٹرول چھڑک کر کہا "لو پھر سگریٹ ہی پیو اور میں عین بیچ بازار میں جل کر کوئلہ ہو گیا۔" پانچویں "مقتول" نے بڑی حسرت سے آنکھیں کھولیں اور بڑے ہی دکھی انداز میں بولا: "شہیدوں" نے مجھے الٹا لٹکا کر میرے سر میں کیل ٹھونک دی۔"

ٹھیک اسی لمحے جب نواز شریف کتنی ہنسی کے "شہیدوں" کو خراج تحسین پیش کر رہے تھے، ادھر میری پور کی مقتول عورتیں ایک دوسرے سے پوچھ رہی تھیں "تمہیں یاد ہے ہمیں کس طرح سسکا سسکا کر مارا گیا تھا؟" ایک نے سر اٹھایا اور غصے سے بولی "میں ایک رات میں تیس درندوں کا بوجھ برداشت نہیں کر سکی تھی۔" دوسری نے چلا کر کہا: "شہیدوں" نے چاقو سے میرا پیٹ چاک کر کے بچہ باہر نکال لیا تھا۔" تیسری نے دکھ سے کہا: "شہیدوں" نے میرا منہ کھول کر تیز آب کی پوری بوتل حلق میں اندر ڈی تھی۔" چوتھی نے سرگوٹی میں کہا: "شہیدوں" نے مجھے راتوں سے کات کات کر مار دیا تھا۔" پانچویں چچی: "شہیدوں" نے میری جھاتیاں کات کات کر تھوڑی سی دی تھیں۔" چھٹی بولی "شہیدوں" نے میرے جوان بیٹے سے کہا اپنی ماں کے ساتھ... تو میں نے دوسری منزل سے چھلانگ لگا دی۔"

ٹھیک اسی لمحے جب نواز شریف کتنی ہنسی کے "شہیدوں" کے ترانے پڑھ رہے تھے تو ادھر کوپال سنج کے قہر خانوں کی زندہ لاشوں نے ایک دوسرے سے پوچھا: "تمہیں یاد ہے ہم لوگوں نے پاکستان جانے سے انکار کیوں کیا تھا؟" پہلی بولی: "ہاں میں "شہیدوں" کے بچے کی ماں بن چکی تھی۔" دوسری بولی: "ہاں میں اگر چوئیاں چلی جاتی تو میرے لاجوں والے بھائی خودکشی کر لیتے۔" تیسری نے کہا: "ہاں اگر میں ٹوپر ایک سنگھ چلی جاتی تو میرا زندہ بیٹا لٹکے والا پ کہاں جاتا؟" چوتھی نے سرگوٹی میں کہا: "میں تیزاب سے چلا چہرہ لے کر ادھر کیوں جاتی؟" پانچویں نے کہا "اس لیے کہ میں نے "شہیدوں" کے مقابلے کے لیے "شہید" پیدا کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔"

ہاں ٹھیک اسی لمحے جب نواز شریف کتنی ہنسی کے "شہیدوں" کو آزادی کے قائد قرار دے رہے تھے تو ادھر امپروومنٹ ٹرسٹ کی ہڈنگ کے گرد بکھری لاشیں ایک دوسرے سے پوچھ رہی تھیں "تمہیں یاد ہے ہمیں کس شان سے دفن کیا گیا تھا؟" پہلی بولی "مجھے گھیسٹ کر سوسائٹی کے ٹرک میں لا دیا گیا۔" دوسری بولی: "کچرا گھروں میں گڑھے کھودے گئے۔" تیسری بولی: "ہم سب کو ان گڑھوں میں ڈال دیا گیا۔" چوتھی بولی:

”ان گزروں کو مٹی سے بھر کر پلستر کر دیا گیا۔“ پانچویں بولی: ”ان پر پھر کچرے گھر بنا دیئے گئے۔“

ہاں ٹھیک اسی لمحے جب نواز شریف کتنی ہائی کے ”شہیدوں“ کی یادگار پر لاہور کے تاجروں کے لیے نئی تاریخ لکھ رہے تھے تو اوجھر بیسور، پنجابی، دیناج پور، سیمن سنگھ، سبٹ، لکشم، زرسنگدی اور منکا نیل کے ہزاروں ”مقتول“ ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے ”اگر جی لوگ“ ”شہید“ تھے تو پھر ہم لوگ سبز ہلالی پرچم کو آگ سے بچاتے بچاتے گولی کا نشانہ کیوں بن گئے، جیپوں کے پیچھے گھسے ہوئے پاکستان زندہ باد کے نعرے کیوں لگاتے رہے، اپنے لہو میں اٹھیاں ڈبو ڈبو کر ”پاکستان زندہ باد“ کیوں لکھتے رہے، ہم بازاروں، گلیوں اور کوچوں میں اڑیاں رگڑ رگڑ کر کیوں جان دیتے رہے۔ اپنی زبانوں سے بھارتی فوجیوں کے بوٹ کیوں چائے رہے۔ ہاں لاشیں پوچھتی ہیں ”اگر کتنی ہائی کے خنڈے ہی“ ”شہید“ تھے تو ہم نے کس ملک کی حفاظت کے لیے جانیں دیں، کس ملک کے لیے دلدلوں، جنگلوں اور گھانٹوں میں مارے جاتے رہے۔“

ہاں اس ۱۳ کروڑ لوگوں کے زندہ ملک میں کوئی ایک بھی شخص ایسا نہیں، جو ان لاشوں کی آواز سن سکے، اس ملک کے حکمرانوں سے پوچھ سکے، اگر پاکستان نے بھی کتنی ہائی کے درندوں ہی کو ”شہید“ تسلیم کرنا تھا تو پھر دلدلوں، کچرا گھروں اور جنگلوں میں دفن وہ ہزاروں لاشیں کن لوگوں کی ہیں؟ کیا یہ لاشیں ۳۶ برس تک کسی ایسے ہی پاکستانی و توہم انگیز کی منتظر تھیں، جہاں خاک کو سنے اور آواز دے گھسنے میں تاریخ کا سارا دھارا ہی بدل دے۔ شہیدوں کو مقتول بنا دے اور مقتولوں کو شہید۔

لیکن شاید نہیں یہ لاشیں کوئی سوال نہیں کر رہیں، کسی سے کچھ نہیں پوچھ رہیں کیونکہ یہ جانتی ہیں جو قوم آلو پیاز اور پان کے چوں کے عوض اپنا سب کچھ بچا کتنی ہے وہ شہیدوں کی آواز کہاں سنتی ہے۔ وہ قوم، قوم کہاں ہوتی ہے، وہ تو مردہ فرشوں کی منڈی ہوتی ہے۔



زندہ عدالتوں سے ایک مردہ سوال

تقسیم ہند کے وقت جب لاکھوں خاندان واہمہ بارڈر سے ہوتے ہوئے والٹن پہنچے تو جالندھر کا یہ غریب خاندان بھی ہجرت کے ریلے میں بہتا ہوا پاکستان پہنچ گیا۔ یہ سارا علاقہ ان کے لیے اجنبی تھا، لہذا سامنے کوئی منزل، کوئی ٹھکانا نہیں تھا، بس جدھر زیادہ لوگ جاتے ہوئے دیکھے، یہ لوگ بھی اصرہری کو ہو لیے۔ بے سرو سامانی کا یہ عالم تھا کہ تن و حاشیے کے لیے کپڑے تھے اور نہ کھانے پکانے کے لیے برتن اور بارود یہ پیسہ اور سونا چاندی تو اس کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ ایک تو یہ لوگ جالندھر سے انفرادی میں نکلے تھے، دوسرا وہاں ان کے گھر میں تھا ہی کیا جو ساتھ لائے۔ خاندان بھر پر مذہب کا گہرا غلبہ تھا چنانچہ کسی کے سامنے دست سوال دراز کرنے کا سوچنا تک ممکن نہ تھا، سوا اگر دوسرے مہاجرین کے ساتھ ایکسپ سے کھانے کے لیے کچھ مل گیا تو بسم اللہ ورنہ شکر الحمد للہ کا ورد کرتے کرتے رات گزار دی۔

ایک روز جب والٹن ایکسپ سے اندرون ملک کے لیے قافلہ روانہ ہونے لگا تو اس خاندان کے بزرگ نے پونہ چلتے چلتے اہل قافلہ سے منزل پوچھ لی۔ بتانے والے نے بتایا "پشاور" تو بزرگ نے فوراً ان کے ساتھ جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اب سامان تھا ہی کتنا، بس سب نے اٹھ کے چمپل پیہرے اور جا کر قافلے میں شامل ہو گئے۔ وہاں سے لاہور ریلوے سٹیشن آئے۔ جیسے ہیے ترین میں سوار ہوئے اور پھر راوی، چناب اور جہلم کی زمین پیچھے چھوڑتے ہوئے پشاور جا پہنچے، جہاں دوسرے مہاجرین کے ساتھ انہیں بھی ایک مکان الاٹ ہو گیا۔ فوارہ چوک کا یہ کشادہ وسیع اور ہوادار مکان کسی ہندو جاگیر کا تھا جو اسے نقل مکانی کے دوران چھوڑ کر ہندوستان چلا گیا۔ بزرگ نے گھر کا قبضہ لیتے ہی اپنے بیٹے، جو انڈین آرمی (قیام پاکستان کے بعد پاکستان آرمی) میں کمیشن تھا کو خط لکھ کر باحفاظت پاکستان پہنچنے اور مکان حاصل کرنے کی اطلاع دے دی۔ اس خط کے جواب میں اگلے چند روز میں ان کا شریف انفس، دھیما اور مہذب بیٹا پشاور آ گیا۔ اپنے تمام بہن بھائیوں کو زندہ سلامت دیکھ کر نومولود پاک آرمی کے کمیشن کے جو جذبات تھے، اس کا اندازہ صرف وہی کر سکتا ہے جو ان گرب ناک حالات سے دوچار ہوا ہو۔

چند دن کی چھٹیاں گزار کر کمیشن واپس پونہ چلا گیا تو بزرگ نے گھر چلانے کے لیے کسی "حیلے" کی

جلسہ شروع کر دی جو ظاہر ہے الٹ پلٹ، افراتفری اور بے چینی کے اس دور میں ناممکن تھا چنانچہ چند ماہ کی اس ناکام کوشش کے بعد جب بزرگ نے کمپن کو خط لکھا تو سارے حالات کھول کر بیان کر دیئے۔ چند روز بعد کمپن نے جواباً خط میں یہ تجویز پیش کی کہ گھر خاندان کی ضرورت سے کہیں بڑا ہے لہذا اگر اس کے دو حصے کر کے ایک "پورشن" کرائے پر چڑھا دیا جائے تو نہ صرف آمدنی کا معقول ہندوستان ہو جائے گا بلکہ اتنے بڑے گھر کی "نگہداشت" سے بھی جان چھوٹ جائے گی۔ بیٹے کی تجویز بزرگ کے دل کو لگی، لہذا انہوں نے اگلے ہی روز ایک معقول کرایہ دار کا انتظام کر کے آدھا گھر کرائے پر چڑھا دیا۔

یہ معاملہ چند ماہ تک بخیر و خوبی چلتا رہا لیکن ۴۸ء شروع ہوتے ہی کرائے دار نے یہ کہہ کر کرایہ دینے سے انکار کر دیا کہ یہ مکان تو ہے ہی میرا۔ جب بزرگ نے اس دھناتی پر احتجاج کیا تو کرایہ دار نے حکومت کی مجاز اتھارٹیز کے دستخطوں والے چند ایسے کاغذات پیش کر دیئے جن کی رو سے نہ صرف مکان کا یہ پورشن اس کی ملکیت تھا بلکہ وہ حصہ جس میں یہ لوگ اقامت پذیر تھے، بھی اس کا تھا۔ بزرگ اس جعل سازی پر ہکا بکا رہ گئے لیکن خاندانی شرافت کے باعث محض طلب سے الجھنا گوارا نہ کیا تاہم انہوں نے یہ سب اپنے کمپن بیٹے کو لکھ بھیجا جو خط ملنے ہی پشادہ آ گیا۔ سارا معاملہ سنا "کرایہ دار" سے ملا، معاملہ گفتگو کے ذریعے حل کرنے کی کوشش کی۔ لیکن "کرایہ دار" نہ مانا تو اس نے قانونی دامت اختیار کہنے کا فیصلہ کیا اور یوں وہ اسی روز اپنے قریبی دوست کمپن فضل کو ساتھ لے کر سول کورٹ میں پیش ہو گیا۔

درخواست لکھی گئی، وکیل کیا گیا اور دعویٰ دائر کر دیا گیا۔ عدالت نے کیس وصول کر لیا، کارروائی شروع ہو گئی۔ دو تین دن کے اس عمل کے بعد کمپن مطمئن ہو کر واپس یونٹ چلا گیا، ایک ماہ بعد اس نے گھر خط لکھ کر والد سے مقدمے کے بارے میں پوچھا تو اسے یہ پڑھ کر حیرت ہوئی کہ ابھی تک عدالت نے ایک بھی پیشی نہیں دی، بہر حال کیا کیا جاسکتا تھا۔ تین ماہ بعد عدالت کی طرف سے پہلی پیشی کا حکم آیا۔ کمپن پشادہ آیا اور والد کو ساتھ لے کر عدالت میں حاضر ہو گیا۔ جج صاحب نے بزرگ کو ایک نظر دیکھا اور دو ماہ بعد کی تاریخ دے دی۔ باپ بیٹے نے حکم سنا تو گردن جھکا کر واپس آ گئے دو ماہ بعد جب دوبارہ حاضر ہوئے تو جج نے اپنا پرانا "فیصلہ" دہرا کر تین ماہ کی تاریخ دے دی۔ تین ماہ بعد نئی پیشی ڈال دی گئی۔ بہر حال قصہ مختصر دو تین برس بعد جب وہ کمپن میجر کے ریک پر پروموٹ ہوا تو کیس اسی عدالت میں اسی جگہ کھڑا تھا۔ میجر تھا بڑا مستقل مزاج لہذا بغیر گھبرائے، جھکے اور پریشان ہوئے ہر پیشی پر والد کو ساتھ لے کر عدالت میں حاضر ہو جاتا۔ جج جو آرڈر دیتا خاموشی سے سنتا اور اگلی پیشی پر حاضر ہونے کا وعدہ کر کے واپس آ جاتا۔

برسوں بعد وہ میجر، لیفٹیننٹ کرنل ہوا تو اس کیس کی بھی پروموشن ہو گئی وہ سول جج کی عدالت سے نکل کر سیشن کورٹ میں چلا گیا۔ مظلوم کرنل بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔ کچھ عرصے بعد وقت نے ایک اور کروٹ لی اور وہ کرنل بریگیڈیئر بن گیا لیکن کیس اسی طرح ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر آتا جاتا رہا۔ پھر وہ

برگینڈ نیر اردن چلا گیا، کیس پیچھے انصاف کی مندرجہ لیس طے کرتا رہا۔ عرصے بعد وہ برگینڈ نیر واپس پاکستان آیا، میجر جنرل بنا تو کیس نے بھی سیشن کورٹ سے چھٹا جگہ لگائی اور ہائی کورٹ پہنچ گیا۔ میجر جنرل بھی اس کے پیچھے عدالت کا چکر لگا تا رہا۔ حالات نے ایک اور پلٹا کھایا اور وہ میجر جنرل لیفٹیننٹ جنرل بن کر ملتان کا کور کمانڈر ہو گیا۔ اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر آنے لگا۔ اعلیٰ تقریبات میں شریک ہونے لگا لیکن کیس بدستور ہائی کورٹ کی سرد فائلوں میں دبا رہا۔ پھر کرنی خدا کی یہ ہوئی کہ وہ جنرل آرمی چیف بن گیا، تو کیس نے بھی ترقی کی ایک اور زقند بھری اور سپریم کورٹ میں آگرا۔

ابھی وکلاء کی جرح جاری تھی۔ جج مسلسل تاریخیں دے رہا تھا اور ریڈر آرڈر لکھ اور منسوخ کر رہا تھا کہ وہ آرمی چیف ایک رات کی تھکا دینے والی کارروائی کے بعد اس ملک کا بلا شرکت غیرے سربراہ بن گیا۔ سارا آئین منسوخ، سادا قانون معطل، اسمبلی ختم، وزیراعظم باؤس خالی، سارے سیاستدان اندر ہو گئے اور پاکستان کی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہو گیا لیکن فیصلہ ابھی تک عدالت کے حکم سے بہت دور تھا۔ جی ہاں اپنے مکان کے لیے سول جج کے سامنے پیش ہونے والا یہ کپتان اور ذوالفقار علی بھٹو کو جگا کر "یو آر انڈر اریسٹ" کا حکم دینے والا یہ جنرل صدر پاکستان جنرل ضیاء الحق ہی تھا۔

ابھی "نوسے" دن میں انکیشن کراؤں گا۔ کی تقریر کے سارے زخم ہرے تھے کہ ایک روز چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر کے اردلی نے انہیں آکر بتایا کہ ایک صاحب پشاور سے آپ سے ملنے آئے ہیں۔ مسلسل دو دن سے باہر بیٹھے ہیں، بہت تالا لیکن طے بغیر نکلنے کے لیے تیار نہیں۔ جنرل صاحب نے ملاقات کی اجازت دے دی تو کمرے میں ایک رعش زدہ بوڑھا اس انداز سے داخل ہوا کہ اس کے ایک ہاتھ میں مکان کی چابی اور دوسرے میں قرآن مجید تھا، اس نے جونہی جنرل ضیاء کو دیکھا وہیں گھڑا ہو کر بیٹھ گیا آواز میں چلایا "میرا اس کتاب کے تقدس کے واسطے مجھے معاف کر دیں، میں آپ کو مکان کی چابی پیش کرنے آیا ہوں۔"

جی ہاں وہ بوڑھا کیپٹن ضیاء الحق کے مکان کا کرایہ دار ہی تھا۔

اور آج جب میں نے اخبار میں سیالکوٹ کے ایڈیشنل جج سے چوری کی کارکی برآمدی اور سپریم کورٹ کے ججوں کے "سیاسی اختلافات" کی خبریں اوپر نیچے چھپی دیکھیں تو بے اختیار مجھے پاکستان کے قانون کے اس "فیصلے" کے ساتھ ساتھ وہ بوڑھا قبائلی سردار بھی یاد آ گیا جس سے جب میں نے پوچھا تھا، "باپا تم ان پڑھ ہونے کے باوجود درست فیصلے کیسے کر لیتے ہو؟" تو اس نے منہ سے حقے کی ٹلی الگ کر کے کہا تھا "بچہ انصاف آتا ہے نہیں ضمیر کرتے ہیں، ہم لوگوں کا ضمیر ابھی زندہ ہے لہذا ہمارے انصاف میں تاخیر ہے اور نہ ہی بے ایمانی اور تم لوگوں نے منصفوں کی کرسیوں پر ضمیر کی جگہ کتابیں بٹھا دی ہیں لہذا تمہارے فیصلے درست اور بروقت کیسے ہو سکتے ہیں؟"

محترم قارئین آپ سے ایک سوال ہے کیا وہ معاشرے زندہ ہوتے ہیں جن کی عدالتیں زخم مندمل

ہونے سے پہلے مظلوم کو انصاف فراہم نہ کر سکیں؟

اس ملک کی زندہ عدالتوں کے تمام زندہ ججوں میں کوئی ایک شخص ایسا ہے جو میرے اس سوال کا جواب دے سکے۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

عدالتیں یا بادبانی کشتیاں

۳ فروری ۱۹۹۸ء کی صبح پونے چھ بجے جب آدھی سے زیادہ دنیا گرم بستروں میں خواب خرگوش کے مزے لوٹ رہی تھی۔ نیکلاس کی ایک ہیل میں ۲۸ سالہ "کارلا" فیکر "کو زہریلا انجکشن لگا کر سزائے موت دے دی گئی۔ فیکر نے اطمینان کا ایک لمبا سانس لیا، ڈچہ بند پر کسی ٹانگیں ڈھیلی چھوڑیں، سینے پر پھونک ماری اور آنکھیں بند کر کے جان، جان آفریں کے حوالے کر دی۔ ڈاکٹر نے آگے بڑھ کر اس کی نبض ٹٹولی، شیشو سکوپ سے سینے میں ہنگی کچھی آوازیں سننے کی کوشش کی اور پھر جھٹکے ہوئے نمناک لہجے میں اس کی موت کا اعلان کر کے کہا "میں نے زندگی میں آج تک اتنی مطمئن موت نہیں دیکھی۔"

کارلا نے فیکر کی ماں ٹھہرائی تھی، جب وہ پیدا ہوئی تو والدیت کے خاتمے میں اس کی ماں ہی کا نام لکھا گیا۔ ماں کی گونا گوں "مصرفیات" کے باعث فیکر کی تربیت کا مناسب بندوبست نہ ہو سکا، لہذا گندے ماحول اور عدم توجہ کے باعث اس نے ۸ برس کی عمر میں سگریٹ نوشی شروع کر دی۔ ۲ برس بعد جب وہ بمشکل دس برس کی تھی اس نے چرس پینا شروع کر دی۔ ۱۳ برس کی عمر میں جب وہ ابھی جوانی کے دروازے پر ہلکی ہلکی دستک دے رہی تھی تو اس کی ماں اسے پہلی بار "ساتھ" لے کر "باہر" نکلی جس کے بعد وہ مسلسل گیارہ برس تک گھر سے نکلتی رہی، کبھی شراب کی ایک بوتل کے عوض، کبھی چرس سے بھرے دو سگریٹوں کے لالچ میں، کبھی چند ڈالروں کی ہوس میں، کبھی ایک ڈبل روٹی، بجم اور انڈوں کے بدلے اپنا بدن گردی رکھتی رہی، ان گیارہ برسوں میں اس نے اذیت کے کتنے دریا پار کیے، گناہ کی کتنی گھاٹیوں میں اترتی اور زلت کے کتنے صحراؤں میں بنگے پاؤں چلتی رہی، اسے کچھ خبر نہ تھی۔ یاد تھا تو بس اتنا کہ وہ ایک کرنسی نوٹ بن چکی ہے جو کبھی اس دکان پر کیش ہو گیا، کبھی اس تجویز میں بند ہو گیا، کبھی اس نے سٹھی میں دیا لیا، کبھی اس کے پرس میں جا گرا، کبھی اس نے ریزہ ریزہ کر کے پھینک دیا، کبھی اس نے پرزہ پرزہ جوڑ کر دو بارہ بازار میں بیچ دیا۔

اور پھر ۱۹۸۳ء کی وہ رات آگئی جب اس نے اپنے پوائے فرینڈ کے ساتھ مل کر ایک جوڑے سے موٹر سائیکل چھیننے کی کوشش کی، مزاحمت ہوئی تو دونوں ٹیش میں آ گئے اور انہوں نے گمبختوں سے جوڑے کے سینے کچل دیئے اور فرار ہو گئے لیکن پولیس نے چند ہی ہفتوں میں انہیں آلیا۔ مقدمہ چلا اور نیکلاس کی عدالت

نے دونوں کو سزائے موت سنادی، جس کے بعد اسیلوں کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اسی دوران اس کا پوائنٹ فریڈ بیمار ہو کر جیل میں انتقال کر گیا جس کے بعد وہ تنہا رہ گئی۔

جیل حکام کو اس حادثے کا کوئی علم نہیں، جس نے اس کی زندگی کا سارا رخ ہی بدل دیا لیکن انہوں نے اس کی زندگی میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کا غور سے مشاہدہ کیا، وہ لڑکی جو بات بات پر جیل انتظامیہ کو تنگی گالیاں دیا کرتی تھی وہ اچانک اپنا زیادہ تر وقت بائبل کے مطالعے میں گزارنے لگی، وہ نشئی عورت جو ہر وقت سگریٹ اور شراب کا مطالبہ کرتی رہتی تھی، اب زیادہ تر روزے سے رہنے لگی، نفسیاتی سطح پر بیمار خاتون اب اللہ اور مسیح کے سوا کسی چیز کا نام نہیں لیتی تھی۔ یہ سلسلہ ایک سال تک چلتا رہا جس کے بعد اس کا نیا جنم ہوا۔ وہ ایک طوائف زادی اور قاتلہ کی جگہ مبلغہ بن گئی، ایک ایسی مبلغہ جس کے ایک ایک لفظ میں تاثیر تھی، جس کی آنکھوں میں سریم کی پورتا اور ہونٹوں پر شہد کے ڈالنے تھے اور جس کے ہاتھ کے لمس میں شفا اور دعا عاں قبولیت تھی۔

پھر اس نے جیل ہی میں شادی کر لی اور تبلیغ کو اپنی زندگی کا نصب العین بنالیا۔ اپنا ایک ایک منٹ لوگوں کی روحانی تربیت کے لیے وقف کر دیا۔ عبادت و ریاضت اور ذکر و اذکار کو اپنا معمول بنالیا، اس کی اس تبدیلی نے پوری جیل پر حیرت انگیز اثر چھوڑا اور وہ لوگ، جنہیں قانون نے مجرم کا خطاب دے کر معاشرے کے لیے ضرر دہاں قرار دے دیا تھا، اس کی انگلی پکڑ کر تکی، پارسائی اور عبادت کے راستوں پر چلنے لگے، وہ جرائم پیشہ لوگ جن کے لیےج درہشلی، الکھڑ پن اور گالی کے سوا کسی ذائقہ سے واقف نہیں تھے اب دھیمے، رواں اور چمھے بول بولنے لگے، وہ بد معاشرے، جیب تراش اور ڈاکو، جو جرم کے نت نئے انداز سیکھنے کے لیے جیل آتے تھے اب معاشرے کے لیے امن، آشتی اور محبت کا پیغام لے کر جانے لگے۔

اس کی بدلی ہوئی شخصیت کی مہک جب باہر پہنچی تو اخبارات کے رپورٹر جیل پر لوٹ پڑے، اس کی سینکڑوں تصاویر بنائی گئیں، انٹرویوز ہوئے، جو اخبارات میں رسائل و جرائد میں "کورا سنوریز" کی شکل میں شائع ہوئے جس سے امریکہ کی معاشرتی زندگی میں بھونچال آ گیا۔ ہر شخص نے اس کی فوٹو اٹھائی اور حکومت سے اس کی سزا معاف کرنے کا مطالبہ کرنے لگا، حقوق انسانی کی تنظیمیں آگے بڑھیں اور امریکہ میں "نکر کو پھاؤ" کی تحریکیں شروع ہو گئیں۔ ایپلیس کی گئیں، درخواستیں دی گئیں، احتجاج کی دھمکیاں دی گئیں لیکن قانون کے بھرے کانوں پر جوں تک نہ رہی، یہاں تک کہ پوپ جان پال نے بھی زندگی میں پہلی بار عدالت میں کسی قاتلہ کی سزا معاف کرنے کی درخواست کر دی لیکن نتیجہ وہی انکار۔

سزائے موت سے چند روز قبل جب لیری کنگ جیل میں نکر کا انٹرویو کرنے گیا تو دنیا نے ہی این این پر ایک ٹکڑا، مطمئن اور مسرور چہرہ دیکھا جو پورے المینان سے ہر سوال کا جواب دے دیا تھا۔ لیری نے پوچھا: "تمہیں موت کا خوف محسوس نہیں ہوتا۔" نکر نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور اپنی چستی چستی نظریں کبھرے پر گاڑ کر بولی: "نہیں! اب مجھے صرف اور صرف موت کا انتظار ہے، میں جلد اپنے رب سے ملنا چاہتی

ہوں، اپنی کھلی آنکھوں سے اس ہستی کا دیدار کرتا چاہتی ہوں جس نے میری ساری شخصیت ہی بدل دی۔“
 انٹرویو نشر ہونے کے دوسرے روز پورے امریکہ نے کہا: ”نہیں یہ وہ فکر نہیں جس نے گینتی سے دو
 معصوم شہریوں کے سینے کچلے تھے، یہ تو ایک ایسا فرشتہ ہے، جو صدیوں بعد پیدا ہوتا ہے اور فرشتوں کو سزائے
 موت دینا انصاف نہیں ظلم ہے۔“ رحم کی اچیل ”ٹیکساس بورڈ آف پارٹن اینڈ بیروول“ کے سامنے پیش ہوئی۔
 ۱۸ رکنی بورڈ نے کیس سننے کی تاریخ دی تو دو ممبروں نے چھٹی کی درخواست دیدی جبکہ باقی ۱۶ ممبران نے سزا
 معاف کرنے سے انکار کر دیا۔ بورڈ کا فیصلہ سن کر عوام سڑکوں پر آگئے اور ٹکری درخواست لے کر ٹیکساس کے
 گورنر جارج بش کے پاس پہنچ گئے۔ امریکہ کے معزز ترین پادری جیسی جیکسن نے بھی ٹکری حمایت کر دی۔
 گورنر نے درخواست سنی، جیسی جیکسن اور ہجوم سے اظہار ہمدردی کیا، لیکن آخر میں یہ کہہ کر معذرت کر لی: ”مجھے
 قانون پر عملدرآمد کراتے کے لیے گورنر بنایا گیا ہے، مجرموں کو معاف کرنے کے لیے نہیں، اگر یہ جرم اصلی
 فرشتے سے بھی سرزد ہوتا تو میں اسے کبھی معاف نہ کرتا۔“

موت سے دو روز قبل جب ٹکری رحم کی اچیل سپریم کورٹ پہنچی تو چیف جسٹس نے یہ فقرے لکھ کر
 درخواست واپس کر دی: ”اگر آج پوری دنیا کہے یہ عورت کارلا نے ٹکری نہیں، ایک مقدس ہستی ہے تو بھی امریکن
 قانون میں اس کے لیے ریلیف نہیں کہ جس عورت سے قتل کرتے ہوئے وہ بے گناہ شہریوں کو کوئی رعایت نہیں
 دی، اسے دنیا کا کوئی منصف رعایت نہیں دے سکتا، ہم خدا سے پہلے ان دولاٹوں کے سامنے جواب دہ ہیں،
 جنہیں اس عورت نے ناحق مار دیا۔“

۴ فروری کو جب سی این این سے کارلا نے ٹکری موت کی خبر نشر ہو رہی تھی تو میں نے اپنے ضمیر سے
 پوچھا، وہ کیا معجزہ ہے جو امریکہ جیسے سڑے ہوئے بیمار معاشرے کو زندہ رکھے ہوئے ہے تو میرے حافضے میں
 حضرت علیؑ کا یہ قول زریں چمکنے لگا: ”معاشرے کفر کے ساتھ زندہ رہ سکتے ہیں لیکن نا انصافی کے ساتھ نہیں۔“
 ہاں میں نے اپنے آپ سے کہا جو عدالتیں عوامی احتجاج سے متاثر ہو کر فیصلے بدل دیں، وہ عدالتیں
 نہیں باؤبانی کشیاں ہوتی ہیں، جن کی منزلوں کا تعین طالع نہیں ہوا انہیں کیا کرتی ہیں۔



زمین چاٹ جائے گی

آپ ڈنمارک ہی کی مثال لیں۔

دنیا کی بہترین جیلیس ڈنمارک میں ہیں، کمرے ہوا دار، روشن اور کشادہ، کھڑکیوں پر پردے، دیواروں پر وال پیپر، فرش صاف ستھرے اور چمکنے، ہاتھ روم میں نہانے کے ٹب، کموڈ، گرم اور ٹھنڈے پانی کے کنکشن، خوشبودار ہاتھ جل، شیمپو اور جھاگ دار صابن، ہر کمرے میں لکھنے کی میز، ٹیبل لیمپ، پوری جیل میں کئی ٹیلی ویژن، لائبریریاں، چھوٹے بڑے تمام اخبارات، رسائل اور تازہ کتابوں کے ڈھیر، ان ڈور گیمز کے لیے ہال، ورزش کے کمرے، کینے میریاز، بارز اور قیدیوں کی نفسیاتی ضروریات پوری کرنے کے لیے پڑھی لکھی خوبصورت خواتین، کھانا نہایت ہی شاندار اور صاف ستھرا، پینے کے لیے استری شدہ ٹیفیس سوٹ، صحت کے لیے طبی معائنے کی سہولت، قیمتی ادویات، کھلی کھلی ڈاکٹر و نرسیں ان تمام سہولیات اور آسائشوں کے باوجود ڈنمارک میں بچھلے پچاس برسوں میں صرف ایک قتل ہوا اور وہ بھی ایک ایشیائی باشندے نے کیا، آبروریزی، دست درازی اور جنسی حملے اس قدر کم ہیں کہ ڈنمارک کی لغت میں ریپ اور گینگ ریپ کے لفظ ہی نہیں، رتی چوری، ڈاکہ زنی اور لوٹ مار تو اس کا تو وہاں تصور تک نہیں، دکانیں کھلی ہیں، بیٹکوں میں کوئی گارڈ نہیں، شاپنگ سنٹروں میں چند کاؤنٹر بوائے کے سوا حملے کا کوئی رکن نہیں۔

آپ پوچھیں گے صاحب اتنی بہترین جیلوں، اتنے نرم قوانین اور واردات کے اتنے شاندار مصنفوں کے باوجود وہاں اتنے کم جرائم کیوں؟ اس کا بڑا ہی سیدھا اور واضح جواب ہے، ڈنمارک کے لوگوں نے جب جیلوں کو جدید ترین سہولیات سے آراستہ کیا تو ساتھ ہی انہوں نے اپنے عدالتی نظام کو بھی لوہے کی طرح سخت اور چٹان کی طرح اٹل بنا دیا، لہذا اب وہاں جرم بادشاہ سے سرزد ہو یا بے روزگار شہرالی سے، مجرم کو گرفتار ہوتے، تھانے پہنچتے، اس کے خلاف تحقیقات مکمل ہوتے، اسے عدالت پہنچاتے، اس کے کیس کا فیصلہ ہوتے اور پھر اسے جیل میں بند کرتے اس سے بھی کم وقت لگتا ہے جتنا قیسری دنیا میں ایک شہر سے دوسرے شہر تک خط پہنچنے میں صرف ہوتا ہے چنانچہ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ڈنمارک حکومت کو اتنی شاندار جیلوں، اتنی آسائشوں اور اتنے رد مان پرورد ماحول سے استفادہ کرنے کے لیے برسوں سے مناسب تعداد میں مجرم نہیں مل رہے۔ اس کے برعکس آپ اپنے ملک کی طرف دیکھیے، ہماری پولیس کو وہ اختیارات بھی حاصل ہیں جن کا

چنگیز خان کے دور میں بھی تصور نہیں تھا، ہماری حوالات جانوروں کے بازوؤں سے زیادہ بدتر اور غلیظ ہیں، ہماری جیلوں کا ماحول اسی قدر غیر انسانی اور خالمانہ ہے جتنا صدیوں پہلے افریقی غلاموں سے بھرے بحری جہاز کا ہوتا تھا لیکن مجرموں کے ساتھ اس عبرتناک سلوک کے باوجود پاکستان کا شمار دنیا کے ان ممالک میں ہوتا ہے جہاں نہ صرف آبدور بڑی جیسے وحشتانہ فعل سے لے کر قتل، فحشاء اور ذہنی تنگ کے ہزاروں جرائم ہوتے ہیں بلکہ یہ دنیا کے ان ممالک کی فہرست میں شامل ہے جن میں وقت گزرنے کے ساتھ جرائم میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

آپ پوچھیں گے صاحب اتنی خوفناک جیلوں، اتنے سخت قوانین اور وارداتوں کے اتنے لرزہ خیز نتائج (جن میں پولیس مقابلے میں مرنے کے امکانات بھی ہوتے ہیں) کے باوجود جرائم کے تناسب میں اتنا اضافہ کیوں؟ اس کا جواب بھی بڑا ہی سیدھا اور واضح ہے دراصل پاکستان میں شروع دن سے قوانین تو انتہائی سخت بنائے گئے لیکن انصاف کا عمل اتنا نرم، ڈھیلا اور طویل رکھا گیا کہ مدعیوں کی تین تین فیصلے سننے کی آس میں قبروں تک پہنچ جاتی ہیں لیکن ساتیس، پیشیاں، گواہیاں، تاریخیں، ثبوت، بیانات، شہادیں، ہجر اور شہادتیں مکمل نہیں ہوتیں لہذا مجرموں کو معلوم ہو گیا، اگر ان کے پاس چند پیسے ہیں تو قانون کی آنکھوں میں دھول مچھوکتا، سنے آڈر ر لینا، پیرول پر رہا ہونا اور ضمانت قبل از گرفتاری کا بندوبست کرنا کوئی مشکل کام نہیں چنانچہ اس ملک میں جرائم ہوتے رہے، مجرم رہا ہوتے رہے، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کراچی میں امن قائم کرنے کے لیے بے نظیر کو کچھ اور ملکی سے اثاثہ دار کا فارمولا اپنانا پڑا اور نواز شریف کو بددست گردوں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے ملٹری کورس بنانا پڑا، جس کے بعد ملک میں انصاف کے تین الگ الگ حصارے بنے گئے، مجرم کو پولیس مقابلے میں فارغ کر دیں، ملٹری کورس سے سات روز کے اندر فیصلہ کرالیں یا پھر کیس عدالت کے سپرد کر کے سات آٹھ برس کے لیے فارغ ہو جائیں۔

ملٹری کورس کے بارے میں کوئی حتمی رائے دینا اس وقت قبل از وقت ہوگا، ہو سکتا ہے فروری ۹۹ء کے پہلے دوسرے ہفتے میں ان کے فیصلے بحال ہو جائیں، یہ بھی ہو سکتا ہے آنے والے دنوں میں حکومت اور عدلیہ کے مابین ایک اور آئینی جنگ چھیڑ جائے، تاہم فیصلہ کچھ بھی ہو یہ طے ہے ہمارے نظام عدل میں عدل کے سوا سب کچھ ہے اور یہ بھی طے ہے اگر ہم نے یہ ملک چلانا ہے، ہم نے اسی سبز پرچم تلے زندگی گزارنی ہے، اس شناختی کارڈ، اس پاسپورٹ کے ساتھ ہی رہنا ہے تو پھر ہمیں اس نظام کو بدلنا ہوگا، اس کی جگہ ایک ایسا نظام لانا ہوگا جس کے فیصلے آزاد بھی ہوں اور فوری بھی، اگر خداخواستہ ہم نے ایک آدھ برس میں ایسا نظام عدل وضع نہ کیا تو پھر شاید یہ ملک قائم نہ رہے، اور اگر یہ ملک نہ رہا تو پھر میاں نواز شریف بھیجیں گے اور نہ ہی اجمل میاں، بے نظیر رہیں گی اور نہ ہی طاہر القادری۔

قدرت کا قانون ہے جن معاشروں میں مظلوم کو فوراً انصاف نہیں ملتا انہیں زمین چاٹ جایا کرتی ہے، وہ بڑے بن جاتے ہیں، وہ نیکیا بن جاتے ہیں، وہ موجودہ دوزخ بن جاتے ہیں۔

ہتھکڑیاں

میں نے جب بھی انسانی ایسوں کے بارے میں سوچا، مونالیزا کا خالق لیونارڈو ڈوونچی کتابوں سے نکل کر سامنے کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک عجیب انسان تھا، قہری ان دن، مصور تھا، موسیقار تھا، سائنس دان تھا۔ دن رات گیلری میں کام کرتا رہتا، جب برش بے قابو ہو جاتا اور رنگ پھینکے پڑنے لگتے تو ایزل سے منہ موڑ کر سٹوڈیو کی طرف نکل جاتا، جہاں گٹار، ہارمونیم اور ڈرم اس کے منتظر ہوتے، پھر تاروں سے رنگ نکلنے، جذبوں کے چھیننے اڑتے اور سارا گھر آوازوں سے مہلک اُلٹتا، یہ سلسلہ ہفتوں جاری رہتا، یہاں تک کہ آوازیں مدمم پڑ جاتیں، سرگوتکے ہو جاتے اور اٹھکیوں کا کانوں سے رشتہ کمزور پڑ جاتا، وہ گٹار دور پھینکتا اور اٹھ کر لیبارٹری چلا جاتا، جہاں شینڈلوں پر جڑے میٹھے اس کا انتظار کر رہی ہوتیں۔ وہ اپنی آنکھیں نیچے اور سرخ نس چبے زہ اوزان کے جھوٹے بڑے آلات اور کیمیائی مادوں کے خواص کی شیٹ پر مرکوز کر دیتا، نوٹس لیتا رہتا، تجنیے لگاتا رہتا، مادوں کے استعمال سے جنم لینے والے نتائج رقم کرتا رہتا، یہاں تک کہ یہ عمل بھی اپنی دلچسپی کھو بیٹھتا۔ اس کی چٹکیں بو جھل ہو جاتیں، جسم تھکاوٹ کا شکار ہو جاتا اور وہ بوریت کے ایک گہرے احساس کے ساتھ واپس گیلری لوٹ جاتا۔

قدرت نے اسے تین مختلف شعبوں میں یکساں مہارت کے علاوہ بھی ایک صلاحیت دے رکھی تھی، دونوں ہاتھوں سے بیک وقت کام کرنے کی صلاحیت۔ وہ یکساں خوبی کے ساتھ دائیں بائیں ہاتھ سے چنٹ کر سکتا تھا۔ اگلے اور سیدھے ہاتھ سے گٹار بجا سکتا تھا، دونوں ہاتھوں سے لکھ سکتا تھا۔

لیکن اس میں اس سے بھی بڑی خوبی تھی، وہ دنیا کا واحد شخص تھا جو ایک ہی وقت میں ایک ہاتھ سے تصویر اور دوسرے سے گھڑی ٹھیک کر سکتا تھا، جو ایک سے گھڑی ٹھیک کر سکتا تھا اور دوسرے سے کوئی بھی آلہ موسیقی بجا سکتا تھا، لیکن اس طرح کہ گھڑی کے پڑوں کا توازن بگڑے، نہ رنگوں کی انفراریٹ مجروح ہو اور نہ ہی سروں کا حسن متاثر ہو اور کبھی کبھار تو ایسا مرحلہ بھی آ جاتا کہ ڈوونچی نے اپنے سامنے دو ایزل لگائے، ایک پر ایک ہاتھ سے کسی کی پورٹریٹ شروع کی اور دوسرے پر دوسرے ہاتھ سے کوئی لینڈ سکیپ چنٹ کرنے لگا، جب تصویریں مکمل ہوئیں تو دونوں شہکار تھیں۔

ایک روز یہی ڈونچی بیدار ہوا تو اس کے دونوں بازو کندھوں سے اٹھیوں تک مفلوج ہو چکے تھے اور ایک مہرت آگیز سستی ہوئی زندگی اس کے دروازے پر کھڑی تھی۔ وہ گھنٹوں گیلری میں بیٹھا رہتا، ایزل پر چڑھی اور دھوری تصویریں دیکھتا رہتا، رنگوں میں لتھڑے خشک برش ہکتا رہتا، کیسوں کے پچھے ٹکڑوں اور نامکمل سیکچرز پر نظر میں جمائے بیٹھا رہتا، جب دکھ برداشت کے بند تو ذکر چلوں تک آجاتا تو وہ اٹھ کر سنوڈیو آجاتا، جہاں اس کا گتار ہوتا، ڈرم، پیانو اور وائس ہوتا، وہ انہیں نظروں سے چھو کر دیکھتا جب چھین نہ پاتا تو مزید دیکھی ہو کر لیبارٹری میں چلا جاتا، جہاں سینڈوز پر چڑھی نہ تھیں اس کا مذاق اڑاتیں، اوزان کے آلات اس کی بے وزنی کا نوحہ کتے اور نتائج کی ڈائری اس کے ایلے پر مسکراتی، یہاں پہنچ کر اس کی بہت جواب دے جاتی اور وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رو پڑتا، اتار دتا، اتار دتا کہ اس کی گھنی سیاہ داڑھی کیلے کی طرح بھاری ہو جاتی۔

کسی نے پوچھا: ”ڈونچی اگر ایک لمحے کے لیے تمہارے بازو زندہ ہو جائیں تو...؟“ اس نے فوراً جواب دیا ”میں اپنے آپ کو چھو کر دیکھوں۔“ آخری ساعتوں میں کسی نے سرگوشی کی: ”ڈونچی تمہاری کوئی خواہش؟“ اس نے پوچھنے والے کو حیرت سے دیکھا، مسکرایا اور پھر آنکھیں موند کر نقاہت سے بولا: ”کاش ڈونچی اپنے ہاتھ سے ناک پر چٹکی کھسی اڑا سکتا۔ کاش اے کاش!“

میں نے جب بھی انسانی الیوں کے بارے میں سوچا، مجھے دمشق کی گلیوں میں ایک سایہ چلتا ہوا نظر آتا، سایہ جس کی روشن پیشانی پر ٹیکر در ٹیکر سوال درج تھے۔

دو حمام بے سرسریں چوڑے پر لٹ جاتے، جب غسل کھروڑے کپڑے سے ان کا جسم مل کر فارغ ہو جاتا تو وہ غسل سے فرمائش کرتے ”عبداللہ میرے جسم پر کہیں بھی دو اٹھیاں رکھو۔“ غسل فوراً حکم کی تعمیل کرتا آپ پھر پوچھتے: ”عبداللہ دیکھو کیا ان کے نیچے زخم کا نشان ہے۔“ غسل اٹھیاں اٹھا کر دیکھتا اور فوراً ٹکوار کے گھرے گھاؤ کی تصدیق کر دیتا۔ آپ حسرت سے بھری سانس کھینچتے اور کہتے: ”الفسوس وہ خالد بن ولید جو زندگی بھر شہادت کی آرزو لے کر میدان میں اترا آج اس بے مہر شہر میں یوں موت کا منتظر ہے، جیسے پاگل اونٹ صحرا میں قضا کا انتظار کرتا ہے۔“

میں نے جب بھی انسانی الیوں کے بارے میں سوچا، مجھے لندن کا میک یاد آگیا۔ عقل کو حیران کر دینے والا میک۔

میک دوسری جنگ عظیم میں برما کے محاذ پر لڑ رہا تھا، اچانک سامنے سے ایک گولی اڑتی ہوئی آئی اور میک کی پیشانی میں اتر گئی۔ اسے ہسپتال پہنچایا گیا، آپریشن ہوا، گولی نکال لی گئی تو میک پیشانی پر آدھ لٹچ کے سوراخ کے ساتھ بچ گیا، جنگ ختم ہوئی تو وہ پائشن لے کر لندن چلا گیا، جہاں وہ کسی معروف سڑک پر کھڑا ہوتا، سگریٹ سٹاک کر پیشانی کے سوراخ میں لگاتا اور منہ سے دھواں نکال کر لوگوں کو حیران کرتا، تالیاں پینے پر مجبور کرتا، لوگوں کی جیبیں اپنے بیٹھ میں اٹھنے کے لیے قائل کرتا، میک مسلسل بیس تک یہ ”شو کرتا رہا،

لیکن ایک روز بلب بدلتے ہوئے ایک معمولی سا کرنٹ لگا، وہ تپائی سے نیچے گرا اور مر گیا۔
میں نے جب بھی انسانی المیوں کے بارے میں سوچا، مجھے برادرِ خالد مسجد کا سنایا ہوا کریمشیر یاد آ گیا۔
ملتان شہر میں مذہب پرستوں کا مالک تھا، بلا کی قوت برداشت کا مالک تھا، وہ پیٹ پر پتھر رکھ کر ہتھکڑوں سے تڑواتا،
اوپر سے ٹرک گزرتا، بالوں سے ٹریکٹر کھینچتا، کپڑوں کو آگ لگا کر ڈیڑھ سو فٹ کی بلندی سے چھلانگ لگاتا، اپنا جسم
سلاخوں سے داغتا، لیکن اسے درد، اذیت اور تکلیف نہ ہوتی، یہ سینڈ و ایک روز سائیکل سے گرا اور مر گیا۔

ہاں میں نے جب بھی انسانی المیوں کے بارے میں سوچا، تاریخ کے تمام نامور کردار کتابوں سے
نگل کر میرے سامنے کھڑے ہو گئے۔ میں نے دیکھا ہر وہ صاحب کمال جس نے اپنے آرت، اپنی ذہانت،
اپنی جرأت، اپنی فراست اور اپنی حکمت عملی سے زندگی کا دھارا بدلا، جو کبیر کی طرح وقت کے پتھر پر ہمیشہ ہمیش
کے لیے ثبت ہو گیا اسے موت بڑی الیہ نصیب ہوئی۔ عقل جواب دے جاتی ہے وہ مرد جو چھ ماہ کا تھا تو سمندر
میں ڈوب کر نہ مرا، جب نو ماہ کا تھا تو اسے جزیرے پر درندے پالنے رہے، جب جوان ہوا تو زمین کی ساری
قومیں اس کے ہاتھ پر بیعت ہو گئیں اور جو بادشاہ بنا تو خدا بن گیا، وہی مرد و حقیر سے مجھ کے ہاتھوں ذلیل ہو کر
مرا۔ کیا عقل کے پاس جواب ہے وہ سکندر اعظم جسے لاکھوں سپاہیوں کے سینکڑوں لشکر شکست نہ دے سکے،
بھالے کے ایک معمولی زخم سے ہلاک ہو گیا۔ کیا عقل کے دامن میں جواب ہے منظر چہا شخص خود کشی پر کیوں
مجبور ہوا، ہونا پادشہ کیوں بے بسی کے عالم میں کیوں مرا، لیکن کا قاتل کہاں کا سپہ سالار تھا، وہ الفقار علی بھٹو نے کس
جنگ میں جان گنوائی، اندرا گاندھی کو مارنے والے پورس کون تھے اور جنرل ضیا کو کس کی موت نے آتھیرا۔

ہاں، جتنا بڑا کمال شخص ہوتا ہے وہ اتنی ہی حقیر موت پاتا ہے۔ یہی قدرت کا اصول ہے، اس
قدرت کا اصول، جو لوگوں کے لیے اپنے فیصلے نہیں بدلا کرتی۔

ہاں، میں انسانی المیوں کے بارے میں سوچتا ہوں تو مجھے ناہید خان کی سوچ سے غرور کی ہوتی ہے،
اس ناہید خان کی سوچ سے، جس نے کہا، بے نظیر کے لیے ابھی کوئی جھٹکڑی نہیں بنی۔

ہاں یہ محترمہ سچ کہتی ہیں کہ قدرت ”بڑے“ لوگوں کے لیے جھٹکڑیاں نہیں بنایا کرتی، انہیں کچے
دھماگوں سے باندھا کرتی ہے، خدائی لہجوں کا جواب پٹ من کے باریک ریشوں اور چھوٹے حقیر دھموں سے دیا
کرتی ہے۔

جو قدرت مجھروں سے عزرائیل کا کام لے سکتی ہے اسے کیا پڑی کہ جھٹکڑیاں بنواتی پھرے،
بینظیروں کے لیے زنجیریں تلاش کرتی پھرے۔



کاسٹ انوار میں

ہات اس کی نیلی آنکھوں اور سیاہ بالوں سے شروع ہوئی۔ اس نے سب کی کاشوں جیسے باریک ہونٹ کھولے، بالوں کو جھٹکا دیا اور چشمہ چنگی میں گھماتے ہوئے بولی۔ "میں نے آنکھیں اپنی جرمین ماں کی چرائیں اور بال مجھے میرا ایشین باپ دے گیا اور خود میں امریکن ہوں؟ پاؤلا"

میں نے ایک ڈرا سا ہاسا قبضہ لگایا اور پھر جھٹک کر آہستہ سے کہا: "پاؤلا جوز" "اوہ، تو، تو" اس نے ہنسیائی انداز سے دونوں ہاتھ ہوا میں لہرائے اور اپنی پٹائی دار آواز میں بولی: "اوہ، تو، پاؤلا جوز نہیں مار تھر، پاؤلا مار تھر۔ پاؤلا جوز تو صدر کلنٹن کو ڈبو کر چھوڑے گی۔" تم لوگ بھی عجیب ہو، میں نے سانسے امریکی سلیپر کے گرد جمع صحافیوں پر نظر پڑا بھا کر کہا۔ "کیا مطلب؟" اس کی نیلی آنکھوں کی پھل مگہری ہو گئی۔

میں نے اپنا الٹا ہاتھ گردن پر پھیرا اور پھر مجمع بازوں کی طرح تقریر شروع کر دی۔ "وہ امریکہ جس میں ۹۹ فیصد لڑکیاں بلوغت سے قبل جنسی عمل سے گزر جاتی ہیں، جہاں صرف معذور عورتیں ہی پورا لباس پہنتی ہیں، جہاں ۸۳ فیصد جوزے ناجائز تعلقات کو شادی پر فوقیت دیتے ہیں، جہاں صرف ۷ فیصد نو جوان والدین سے پوچھ کر شادی کرتے ہیں اور جہاں سب سے بڑی بچہ پرمانہ حلوں کے لاکھوں کیس درج ہوتے ہیں۔ وہ امریکہ اپنے صدر کی ایک جنسی بھول معاف کرنے کے لیے تیار نہیں؟"

اس نے اپنی منحنی سی ناک پر چشمہ لگایا اور پھر بڑی سنجیدگی سے بولی: "اس لیے کہ وہ ہمارا لیڈر ہوتا ہے۔ ایک امریکی گردن تک جرم، گناہ اور بد عنوانی میں کیوں نہ ڈوبا ہو لیکن جب اپنے لیے لیڈر بننے کا تو ایک صاف ستھرے اور ایماندار شخص کا انتخاب کرے گا۔"

شام جب میں نے سی این این پر کلنٹن کا اتر اہوا چہرہ اور کپیر کو بار بار دیکھا کہ جیسف فلاور کے ساتھ جنسی تعلقات کے اعتراف کے بعد کلنٹن کی صدارت بجتی نظر نہیں آتی تو مجھے چھ ماہ پہلے کی وہ شام یاد آگئی جب پاؤلا مار تھر گردن جھٹک جھٹک کر کہہ رہی تھی "امریکہ میں کسی بد ریانت، بد اخلاق اور جنسی گمراہی کے شکار سیاستدان کے لیے کوئی منجائش نہیں، ہم نے کس کو برداشت نہیں کیا، یہ تو چھوٹا سا کلنٹن ہے۔" میں نے

فی وی بند کیا اور جی بجا کر سوچنے لگا اگر کئین امریکہ کے بجائے پاکستان کا سربراہ ہوتا تو کیا اس انکشاف کے بعد بھی اس کا مستقبل تاریک ہوتا تو میرے شعور نے جواب دیا نہیں کیونکہ ہم وہ لوگ ہیں جو انتہائی بدکردار حکمران کے ساتھ بھی بردبار و رغبت زندگی گزار سکتے ہیں۔

ہاں، میں نے سوچا وہ ہندو عورت بھی پاکستان ہی کی خاتونِ اول تھی، جس کے چہرے کی رعنائی سے وزیرِ اعظم ہاؤس کا ہر مرد گھبراتا تھا، کثرتِ شراب نوشی سے جس کا جگر جواب دے گیا تو وہ شراپیوں کو جمع کرتی، ان کے سامنے سامان سے نوشی سجاتی اور پھر انہیں شراب نوشی کرتے دیکھ کر خوش ہوتی رہتی۔

ہاں وہ مرزا بھی اسی سلطنت کا سکندر تھا، جو نشے کی حالت میں اجنبی عورتوں کے پلو پکڑا آنکھوں سے لگاتا اور پھر لہک لہک کر ان کے حسن کی تعریف کرتا اور اس کی بیوی ساری شام اس کے پیچھے پھرتی رہتی کہ کہیں کسی کمزور لہجے میں کوئی دوسری عورت فرست لیڈی نہ بن جائے۔

آغا جی بھی اس ملک میں پورے گردن سے حکومت کرتے رہے، جن کی "پاؤلا" کو لوگوں نے جزل کا رینگ لگا دیا، جن کے حرم میں جب "لود" کی بارش ہوتی تھی یا محبت کے ترانے دستک دیتے تھے تو فوراً تحلیل کر دیا جاتا تھا، جو جب دشمن پر حملے کا حکم دینے کے لیے نکلے تو دو جوانوں نے انہیں دائیں بائیں سے اٹھا رکھا تھا اور وہ ایک کانفر لگا کر پیچھے گر گئے تھے، جو پشاور میں جنگ دھڑنگ بھر آگئے تھے، جنہوں نے درجنوں سربراہان کی موجودگی میں مافیِ کار لو کی شہزادی کے بازو پر ہاتھ پھیرنا شروع کر دیا تھا اور جنہوں نے ہزاروں لوگوں کے سامنے کیلے کو بیت الخلا کا درجہ دے دیا تھا۔

وہ یکتا روزِ شخص بھی اسی ملک کا حکمران تھا، جس کی شاہیں حسد کے بالوں سے کھینچے گزرتی تھیں۔ جی ہاں وہی حسد جس کی "بیٹی" آج بھی اپنا ناک نقشہ ملک کے سب سے بڑے سیاسی خاندان سے ملائے نہیں ٹھکتی۔

وہ بزرگ زادہ بھی زندہ ہے، جس نے اقتدار میں زنانہ کالج کی استاد سے جنگیں بوجھائیں، جب معاملہ چل پڑا تو وہ اسے پورے پردہ کوئل کے ساتھ اسلام آباد کی سیر کراتا رہا، پھر اس خاتون نے ایک روز یہ کہہ کر اس سے علیحدگی اختیار کر لی: "اگر میں نے زندگی وزیرِ اعظم ہاؤس میں ہی گزارنی ہے تو پھر مجھے تمہاری کیا ضرورت ہے؟ ہائے ہائے۔"

اس جاگیردار نے بھی عرصے عہد سے استعفیٰ نہیں دیا، جس کے قبضے سے کنیرہ کالج کی انوا شدہ لڑکیاں برآمد ہوئی تھیں، جس نے اپنی بیوی سے کہا: "میں علماء کرام سے مذاکرات کے لیے جا رہا ہوں، تم نیچے نہ آنا اور پھر رات بھر۔" اس سے "مذاکرات" کرتا رہا۔

اس حیات کی جی کو ابھی تک جائز حق نہیں ملا، جسے وزیرِ اعلیٰ کی موت کے بعد اس کی ایئر ہوئس ماں چھپائے چھپائے پھرتی تھی۔

وہ کلب ڈانسر بھی آج ایک سیاسی پارٹی کی سربراہ ہے جو ایک مچھونی سی بیٹی کو رقص کی تعلیم دینے آئی

اور گھر کی مالکین بن بیٹھی اور آج وہ نہ صرف ایک بڑے سیاسی خاندان کی جائیداد کی وارث ہے بلکہ اس کی سیاسی سادھ میں بھی حصہ دار ہے۔

وہ قومی ہیرو بھی آج تیسری سیاسی قوت بن کر ابھر رہا ہے جس کی سابق محبوبہ اس کی بچی کی انگلی پکڑے دنیا کی عدالتوں میں دھکے کھا رہی ہے اور جس کے بارے میں لاہور کی "کلی" نے انہماک بھری مسکراہٹ کے ساتھ پریس کانفرنس میں کہا تھا: "وہ لڑکیاں لے کر میرے بندروم میں آ جاتے تھے۔"

وہ پریز گار "شاہ جی" بھی آج تک لیڈر ہیں، جن کی تصویروں آخری وقت تک ٹی وی کی ایک اداکارہ کے بندروم میں لگی رہیں اور جو اپنے بچوں کو "شاہ جی" کی اولاد کہہ کر پکارتی تھی۔

وہ یوسف بھی اسی کھان کا شہزادہ ہے جس کا نام سن کر آج بھی غیرت ماہیدی ہر تان دیکھ ہو جاتی ہے، جس نے اپنے دوستوں کی محفل میں بڑے دعوے سے کہا تھا: "وہ زندگی میں کبھی نہیں گائے گی، تم شرط لگا لو۔" وہ مروت بھی اسی مملکت خداداد میں عرفان کی طرف پھیل رہا ہے، جس کے بارے میں ایک بوڑھے سیاستدان نے پوری قوم کو مخاطب کر کے کہا تھا: "یہی میری بیٹی سے اجتماعی زیادتی کا مجرم ہے۔"

وہ زردار بھی اسی ملک کا رہنما ہے جس کے بریگیڈیئر کی لڑکی سے تعلقات کا ڈھونڈورا دنیا بھر کے اخبارات نے پیٹا، جس نے اپنی "زیب النساء" کے لیے محل تک خرید لیا اور جو آج تک اس تعلق پر شرمندہ نہیں۔ وہ گوہر نایاب بھی آج تک حکمران ہے، جسے جب ڈاکوؤں نے اونچے مقام پر دوکاٹو اس کے ساتھ ۲۰ ویں گریڈ کی "پاؤلا جونز" تھی۔

ہاں سینے پر ہاتھ رکھ کر بتائیں اس ملک کے اہم لوگوں میں کوئی ایسا شخص ہے جس کے نام اعمال سے کسی پاؤلا جونز کی بو نہیں آتی، جس کا ماضی "یاد ماضی عذاب ہے یارب" کی تفسیر پیش نہیں کرتا، جس کے من سے شراب کے بھیکے نہیں اُختے اور جو فخر سے اپنی راتوں کے قصے بیان نہیں کرتا۔

ہاں اس طارق چودھری سے پوچھئے جس نے ہاسٹل سے روتی ہوئی لڑکیاں رہا کروائی تھیں۔ اس اقبال خاکوانی سے پوچھئے جو طوائفوں کا راستہ روکنے کے لیے ڈنڈا لے کر ایم پی اے ہاسٹل کے سامنے کھڑا ہو گیا تھا۔ سرکاری ہاسٹل کے بیروں اور سوچروں سے پوچھئے جو کوروں سے چوروں کے خون آلود کھڑے جمع کرتے رہتے ہیں، جو خالی بوتلیں اور زنانہ کپڑے پھیلاتے رہتے ہیں۔

ہاں کردواض پر صرف یہی جہاد ہے جہاں کسی پاؤلا کے الزام کے، کسی مونیٹک اور کسی جیوسفر کے اعتراض پر اقتدار کا کوئی بت پھلتا ہے نہ کسی دامن پر چھینٹا پڑتا ہے اور نہ ہی کسی گجڑی کا بل کھلتا ہے کہ یہی ہے وہ مقام، جہاں اقتدار اور اخلاقی گراؤ کا چوٹی دامن کا ساتھ ہے۔

مجھ سے ایک دوست نے پوچھا آخر ہمارے ہاں صالح قیادت کا اتنا فقدان کیوں ہے؟ میں نے آہستہ سے کہا: "اس لیے کہ ہمارا معاشرہ گھنے کی "رہو" ہے اسے جتنا گرم کرو گے اس پر اتنا ہی میل آئے گا، بالائی نہیں۔"

چار دن اور پانچ راتیں

یہی چار دن اور پانچ راتیں تھیں، یہی ۳۸ گھنٹے اور ۳۶۰۰ منٹ تھے جن میں جن زیب نے عمر بھر کا سکھ، اطمینان اور آسودگی دیکھی۔

یہی چار دن تھے جن میں جن زیب نے کسی نواز شریف، کسی شہباز شریف، کسی خواجہ ریاض کا انتظار نہیں کیا جن میں جن زیب نے کوئی خواب نہیں بنا، امیر ہونے کا کوئی پستا نہیں دیکھا، باعزت روزگاری کوئی آس نہیں باندھی، کسی بڑے شخص سے ملاقات کی امید نہیں رکھی، جن میں جن زیب نے کسی مختصر شخص، کسی غیبی ہاتھ کا انتظار نہیں کیا، کسی دستک، کسی برا بھلا، کسی لارمی، کسی خطا، کسی کار کا راستہ نہیں دیکھا۔

یہی پانچ راتیں تھیں جن میں جن زیب نے اپنے چھ بچوں کے نکلے پاؤں، ناف سے اوپر سر کی قمیصیں اور گھٹنوں کو چھوتی شلواریں نہیں دیکھیں، اسے بوڑھے باپ کی ہضم میں خون کے چھینٹے نظر نہیں آئے، اسے جو لمبے پر چڑھی خالی ہانڈی کے گرد لینے لاشے دکھائی نہیں دیں، اسے خالی کسٹر وں اور لوٹے گھروں کی آواز سنائی نہیں دی، اسے زمر جان کے گھولتے آنسو اپنے دل پر گرتے محسوس نہیں ہوئے، یہی پانچ راتیں تھیں جن میں اس کے بچوں نے اس سے کوئی فرمائش نہیں کی، اس کی گزیا نے اس سے گزیا نہیں مانگی، اس کے بچے نے اس سے سائیکل کا مطالبہ نہیں کیا، اس کے نینکو نے نئی کتابیں، نئی یونیفارم اور نئے جوتے نہیں مانگے، اس کی بیمار بیوی نے دوائیاں، اس کی شادی شدہ بیٹی نے سلائی مشین اور اس کے بوڑھے باپ نے گرم چادر نہیں مانگی، مالک مکان نے اس کے دروازے پر دستک نہیں دی، دودھ والے نے ادھار چکانے کا مطالبہ نہیں کیا، ترکاری والے نے کریانے والے نے "آخر کب تک انتظار کروں" کا برچھا نہیں چلایا۔

یہی ۳۸ گھنٹے تھے جن میں جن زیب نے کسی سوزوکی کے پیچھے ٹنک کر سوار یوں کے لیے آوازیں نہیں لگائیں، "چنے لے لو" کی صدا نہیں دی، برف کے گولے نہیں بیچے، سبزی کی ریڑھی نہیں کھینچی، جن میں جن زیب نے کسی سے ادھار نہیں مانگا، جن میں اس نے جیب میں پڑے چند نوٹوں کو بار بار نہیں منا، اس نے دکانوں کے سامنے رک رک کر حسرت سے چمکتی دہکتی چیزیں نہیں دیکھیں، جن میں اس نے سائیکل چھ کر لاہور پہنچنے، اپنے محبوب وزیر اعظم سے ملاقات کرنے، ان سے ہاتھ ملانے، ان کے گلے لگنے ان کے ساتھ

چائے پینے اور ان سے چپک وصول کرنے کا کوئی منصوبہ نہیں بنایا، جن میں اس نے باعزت کاروبار کرنے، خوب دل لگا کر محنت کرنے، ایک دکان سے دو دکانیں اور دو دکانوں سے کئی کئی پلازے بنانے کا پلان نہیں بنایا، جن میں اس نے جن زریب گروپ آف کمپنیز، سینٹھ جن زریب، جن زریب اینڈ برادرز کے خواب نہیں دیکھے، جن میں اس نے بیسیوں یتیم خانے بنائے، سینکڑوں تعلیمی ادارے کھولے اور ہزاروں فلاحی مراکز قائم کرنے کے سہنے نہیں دیکھے۔

یہی ۳۶۰۰ منٹ تھے جن میں جن زریب نے اپنی پرانی سائیکل نہیں بیچی، جن میں اس نے لاہور تک کا ٹکٹ نہیں خریدا، جن میں اس نے سرپنٹ بھاگی ترین کی ست رفتاری کاشتو نہیں کیا، جن میں اس نے ماڈل ٹاؤن کا پتہ نہیں پوچھا، جن میں اس نے پوری رات اتفاق پارک میں ٹھہرتے نہیں گزار دی، جن میں اس نے خود کو وزیراعظم ہاؤس کے سامنے کھڑا ہوا نہیں پایا، جن میں اس نے کسی سے "وزیراعظم اندر ہی ہیں نا" نہیں پوچھا، جن میں اس کو کسی نے دھمکارہ نہیں، کسی نے اس کی کمر پر جا لگے آگ کا کوڑا نہیں برسایا، جن میں اس نے اپنے اوپر مٹی کا تیل نہیں گرایا، جن میں اس نے دیا سلائی نہیں جلائی، جن میں اس نے چٹخ نہیں ماری جن میں اس نے ہمیں، ہمارے اس نظام اور ہماری اس اجتماعی بے حس کو گالی نہیں دی۔

یہی چار دن اور پانچ راتیں تھیں، یہی ۳۸ گھنٹے اور ۳۶۰۰ منٹ تھے جن میں جن زریب نے عمر بھر کا سکھ، اطمینان اور آسودگی دیکھی، جن میں اسے نرم اور گرم بستر ملا، جن میں اسے پوری خوراک اور قیمتی دوائیں ملیں، جن میں اسے سات براعظموں پر پھیلی دنیا سے ہمدردی، رحم اور افسوس ملا، جن میں اسے پونے دو سو ممالک کے اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژنوں سے اہمیت ملی، جن میں اسے نواز شریف، شہباز شریف اور خواجہ ریاض کی تسلی ملی، جن میں اسے بے نظیر، قاضی حسین احمد، طاہر القادری، فاروق لغاری اور عمران خان نے توجہ کے قابل سمجھا، جن میں حکومت نے اس کے مالی حالات کو غور کے قابل جانا، جن میں اسے وزیراعظم کی طرف سے چپک موصول ہوا، جن میں اسے چیزمین بیت المال نے ماہانہ امداد پیش کی، جن میں اسے تین تین ہسپتالوں کے ماہر ڈاکٹروں کی توجہ ملی، جن میں اسے حرف تمنا سے لے کر کنکریاں تک اور چوراہے سے لے کر گرہان تک ہمدردیاں ہی ہمدردیاں، افسوس ہی افسوس ملا۔

یہی چار دن اور پانچ راتیں تھیں، یہی ۳۸ گھنٹے اور ۳۶۰۰ منٹ تھے جو مردہ جن زریب کو سو لاکھ کا باجی بنا گئے، یہی لمحے، یہی پل، یہی ساتیس تھیں جو اس جن زریب اور اس جیسے سینکڑوں ہزاروں جن زریبوں کو یہ حقیقت سمجھا گئے کہ "بے وقوف! اس معاشرے میں زندگی کی کوئی قدر نہیں، کوئی قیمت نہیں، اگر اپنے بچوں کو اچھی خوراک، اچھی تعلیم اور اچھی رہائش دینا چاہتے ہو، اگر نواز شریف سے طاہر القادری تک ہر سیاستدان کی ہمدردی محبت اور توجہ سنبھالنا چاہتے ہو تو اپنے اپنے گھروں سے نکل کر خود کو آگ لگا لو۔"

ہاں یہی چار دن اور پانچ راتیں تھیں۔ یہی ۳۸ گھنٹے اور ۳۶۰۰ منٹ تھے جو پوری دنیا کو آواز دے

گئے، جو ساڑھے پانچ ارب لوگوں کو مخاطب کر گئے کہ آئیے دیکھئے یہ ہے وہ معاشرہ اور یہ ہیں وہ لوگ جو زندوں کو تو ان کا حق نہیں دیتے لیکن مردوں کے لیے ان کے پاس وقت بھی ہے ہمدردی بھی اور خیرات بھی۔

(نوٹ: یہ کالم دزیرا معشم کی مکمل پچھری میں خود سوزی کرنے والے جن زریب کی موت پر لکھا گیا۔)



Kashif Azad @ OneUrdu.com

تم امتحان پر پورے نہیں اترے

آئیے ہم سب مل کر کوئی ایسی کتاب دریافت کریں، کوئی آیت، کوئی حدیث، کوئی فتویٰ کوئی حوالہ تلاش کریں جس سے جو ہر ناؤن لاہور کی سیونہ اختر اور اس کے معذور خاندان کے لیے اپنے دو سالہ علی یسین کو زہر پلائے، چھت سے دھکا دینا، راوی میں پھینکنا، ریل کی بڑی پر لٹنا یا تیل چھڑک کر آگ لگانا آسان ہو جائے، آئیے کوئی ایسا قانون، کوئی ایسا آئین، کوئی ایسا دستور کوئی ایسا آرڈیننس، کوئی ایسی دفعہ، کوئی ایسی ترمیم وضع کریں جو ننھے علی یسین کے بعد دو ہزار پانچ سو روپے ماہوار لینے والی اس استانی کو بے گناہ قرار دے دے، جو بے کار، نڈے باپ کو باعزت بری کر دے، آئیے کوئی ایسی گمانی، کوئی ایسا غار، کوئی ایسا گڑھا، کوئی ایسی ندی، کوئی ایسی قبر چار کریں جہاں ہم علی یسین کی موت کے بعد اپنا ضمیر، اپنا احساس، اپنی شرم، اپنے سوال، اپنے جواب دفن کر سکیں، آئیے ہم سب مل کر کوئی ایسا گوث، کوئی ایسا کونہ، کوئی ایسا تہہ خانہ، کوئی ایسی کوٹھری تلاش کریں جہاں ہم علی یسین کی آنکھیں بند ہونے کے بعد چھپ کر خدا کے قہر سے رب کے عتاب سے اور اللہ کے انصاف سے بچ سکیں۔

آئیے ہم سب مل کر اپنی آنکھیں پھوڑ ڈالیں، اپنے کانوں میں سیسہ بھر لیں اور اپنے محسوسات جلا ڈالیں کہ اس دو سال کے ننھے علی یسین کے بعد یہ آسمان، یہ زمین، یہ ندی، یہ نالے، یہ رنگ، یہ ڈانٹے اور یہ ہریالی ہم سے ضرور پوچھے گی، ہمارے بچے، ہماری بیویاں، ہماری بہنیں ہمارے دامن ضرور جھٹکیں گی، ہماری جھینیں، ہمارے اکاؤنٹس، ہمارے سیف، ہمارے لوٹ، ہمیں ضرور چیں گے، آسمان پر اگر خدا موجود ہے اور اس کا ستر ماؤں کے برابر مستکا دعویٰ بھی قائم ہے تو وہ بھی ہم سے ضرور کہے گا "ہم نے اس علی یسین کو تم چودہ کروڑ لوگوں کا امتحان بنا کر بھیجا تھا، ہم ہی نے اس کے جسم میں اللہ دل لگایا تھا، ہم ہی نے اس کے دل میں بنے جتنا سوراخ بنایا تھا، ہم ہی نے اس کی دل کی ساری شریانیں میڑھی لگائی تھیں، ہم ہی نے اس کے دل کا ایک والو بند کر دیا تھا، ہم ہی نے اس کا جسم دو سال تک نیلا رکھا تھا، ہم ہی نے اسے اتنا لاغر رکھا تھا کہ دو دو سال کی عمر تک بیٹھ سکتا تھا نہ کھڑا ہو سکتا تھا، ہمارے حکم ہی سے علی یسین مسلسل بخار میں رہتا تھا، اسے روزانہ پانچ دو سے پڑتے تھے، اس کا جسم اکڑ جاتا تھا، سانس اکھڑ جاتی تھی، آنکھیں چڑھ جاتی تھیں، ہاتھ پاؤں

لیجھے ہو جاتے تھے، اس کے حلق سے ذبح ہونے والے بکرے جیسی چیخ نکلتی تھی، اس کا منہ خشک ہو جاتا تھا، اس کا چہرہ تن جاتا تھا، وہ ایڑھیاں رگڑتا تھا، کروٹیں بدلتا تھا اور درد سے بے ہوش ہو جاتا تھا، کیوں؟ صرف اس لیے کہ ہم دیکھ سکیں اس بچے کی تکلیف سے کس نواز شریف کا دل تڑپتا ہے، کون شہباز شریف بے چین ہو کر گھر سے نکل پڑتا ہے، کس بے نظیر کو اپنا بلاول یاد آتا ہے، کون عمران خان اپنے ہسپتال کے دروازے اس پر کھولتا ہے، ۱۴ کروڑ لوگوں کے اس ملک سے کون کون سے صاحب دل باہر آتے ہیں لیکن انہیں وہ درد سے پتہ کھتا رہا، اس کی ماں دن میں پانچ بار دامن پھیلا کر خدا سے اس کی موت کی بھیک مانگتی رہی، اور اس کا باپ دیوار سے ٹکریں مارتا رہا لیکن نواز شریف کو خبر نہ ہوئی، شہباز شریف کو میڈیکل کالجوں کے انٹری ٹیسٹوں سے فرصت نہ ملی، صاحبان دل کو دکا نوں، کارخانوں اور یہی کھاتوں نے سہاٹھانے کی اجازت نہ دی۔“

آئیے ہم سب مل کر ۱۵ برس سے شوگر کی مریض اسی میمونہ اختر کا گلہ دیا دیں، دو ہزار پانچ سو روپے ماہوار تنخواہ لینے والی اس استانی کا گلہ دیا دیں جو اپنے درد سے ترپتے علیٰ یسین کے لیے زہر کی ایک پڑیا نہیں خرید سکتی، جو اپنے پیٹ میں پروان چڑھتے دوسرے بچے کے دل کا سوراخ بند کرنے کے لیے اچھی خوراک نہیں کھا سکتی، جو اپنے لیے، اپنے بچوں کے لیے، اپنے بیمار خاوند کے لیے دوا نہیں خرید سکتی، پھل، دودھ اور انڈے نہیں لاسکتی، اپنے گھر کی مندر پر بیٹھی قاتلوں کی چیلیں نہیں اڑا سکتی، جو ابھی تک دھاؤں پر یقین رکھتی ہے، جو ابھی تک مایوس نہیں ہوئی، جو ابھی تک نواز شریف، بے نظیر اور عمران خان کا راستہ دیکھ رہی ہے، جو ابھی تک کسی نجات و بندہ کی منتظر ہے جو ابھی تک اس قوم کے مردہ ضمیر کی بو نہیں سونگھ پائی۔

آئیے ہم سب مل کر کوئی ایسی کتاب دریافت کریں، کوئی آیت، کوئی حدیث، کوئی فتویٰ، کوئی حوالہ تلاش کریں، کوئی ایسا قانون، کوئی ایسا آئین، کوئی ایسا دستور، کوئی ایسا آرڈیننس، کوئی ایسی دفعہ اور کوئی ایسی ترمیم وضع کریں جو میمونہ، اس کے معذور خاوند، دل کے خوفناک عارضے کے شکار علیٰ یسین اور اس کے پیٹ میں پلٹے ایک نئے ”علیٰ یسین“ کو باعزت موت دے دے، انہیں مرنے کا حق تفویض کر دے۔

آئیے ہم سب مل کر کوئی ایسی کھائی، کوئی ایسا غار، کوئی ایسا گڑھا، کوئی ایسی ندی، کوئی ایسی قبر تیار کریں جہاں ہم اپنا ضمیر، اپنا احساس، اپنی شرم اور اپنے سوال اور اپنے جواب دفن کر دیں کہ مجھے خدشہ ہے وہ خدا جو ہم جیسے ظالموں، فرعونوں، عمروں کو برسوں سے رزق، صحت اور مہلت دے رہا ہے کہیں ہم سے یہ نہ پوچھ لے ”تم لوگ کن کن ذہنی، روحانی اور اخلاقی بیماریوں کا شکار تھے پر ہم نے تم پر اپنی نعمتوں کا نزول بند نہیں کیا لیکن انہیں تم ہمارے ہی دیئے ہوئے رزق سے ایک دو سالہ بچے کی حفاظت نہ کر سکے، ایک دہی عورت اور ایک بے بس مرد کو سہارا نہ دے سکے، انہیں تم لوگ ہمارے امتحان پر پورے نہیں اترے۔“

دوستو! بچے بیمار ہی کیوں نہ ہوں زمین پر خدا کا انعام ہوتے ہیں یہ اگر واپس پلٹ جائیں تو پھر آسمان سے انعام نہیں اترتا اگر تے قبر تازل ہوا کرتے ہیں۔

شریا کا کیا بنتا

اگر ۲۸ نومبر، ہفتے کے دن، صبح نو بجے، کلکٹن کا فون آ جاتا، اگر ورلڈ بینک، آئی ایم ایف کا کوئی وفد، ماڈل ٹاؤن لاہور کے وزیر اعظم ہاؤس تشریف لے آتا، اگر شریعت مل پر اختلافات شدت اختیار کر جاتے، اگر بلوچستان میں بغاوت پھوٹ پڑتی، اگر کراچی میں ایک اور بم دھماکہ ہو جاتا، اگر بے نظیر بھونینار پاکستان کی بجائے فیروز پور روڈ کی طرف نکل آتیں، اگر واجپائی "اعلان جنگ" کر دیتے، اگر اسامہ بن لادن کے اسلام آباد پینچے کی خبر پھیل جاتی، اگر مارگریٹ البرامیٹ اچانک پاکستان لینڈ کر جاتی تو پلی ڈبلیو ڈی کے اس ڈرائیور کی تیرہ سالہ شریا کا کیا بنتا، اس کے دل کا سوراخ کون بند کرتا، اسے آپریشن اور دوائیوں کے پیسے کون دیتا؟

اگر ۲۸ نومبر ہفتے کے دن، صبح نو بجے لاہور کا ٹیلی فون نظام دورہم بزم ہو جاتا، اگر ماڈل ٹاؤن کی کیبل میں پانی چلا جاتا، اگر وزیر اعظم ہاؤس کے باکس کی تاریں چوہا کتر جاتا، اگر اکیچھنج کا سرکٹ شارت ہو جاتا، اگر آپریٹر کے ہونٹوں سے پچکے ایسیسی فلٹرز کے "نوتے" کا دھواں کیپسوز کا دماغ خراب کر دیتا، اگر وفاقی کالونی میں ہونے والی کھدائی ٹیلی فونک رابیطے کاٹ دیتی، اگر ریسور خراب ہو جاتا، اگر فون ڈیڈ ہو جاتا، اگر ڈائل ٹوٹ جاتا، اگر کریڈل کی کھسکی ہوئی تاریں موقع پر دھوکہ دے جاتی، اگر "ڈبی" سے "شو" نکل جاتا تو چھٹی جماعت کی اس منہی سی شریا کا کیا بنتا، ۲۵ سو روپے ماہوار تنخواہ پانے والے ڈرائیور کی بیٹی کا علاج کون کراتا، اس کے دل سے اچھلتی مہوکی دھار کون رکواتا، اسے آپریشن اور دوائیوں کے پیسے کون دیتا؟

اگر ۲۸ نومبر، ہفتے کے دن، صبح نو بجے ہا کر ہمایوں کے گھر اخبار پھینک کر نہ جاتا، اگر اخبار کا نمبرز ایڈیٹر کسی کو نے کھد رے میں "وزیر اعظم آج صبح ماڈل ٹاؤن میں ۳۵ منٹ تک عوامی کارٹینس میں" کی سنگل کالی خبر نہ لکھتا، اگر ہمایوں کی بچی کی نظر اس خبر پر نہ پڑتی، اگر ہمایوں کا "بابو" کنڈی کھٹکتا کر یہ خوشخبری نہ سناتا، اگر وہ وہ پٹہ سنبھال کر سیکلی کے گھر نہ جاتی، اگر ڈائل اور ری ڈائل کرتے کرتے اس کی کنزورجیف انگلیوں کا حوصلہ ٹوٹنے سے بچا نہ رہتا، اگر نو بج کر ۳۱ منٹ تک اس کی امید کا رشتہ قائم نہ رہتا تو مسروں جیسے چہرے اور "کانے" جیسے جسم کی اس شریا کا کیا بنتا، اس کی سیدھی سادی ماں کب تک تھی، چینی اور آنے سے پیسے بچا بچا کر دوائیں خریدتی رہتی، اس کی لرزتی کانچی امید اسے کب تک زندہ رکھتی، یہ کب تک زبان پر وائٹ گاڑہ کر

درد کا گھاگھوٹتی رہتی، اسے آپریشن اور دوائیوں کے پیسے کون دیتا؟

اگر ۲۸ نومبر، ہفتے کے دن، صبح نو بجے، نہیں بلکہ نہیں نونج کر ۳۱ منٹ پر ڈاکٹر کا سفر مکمل نہ ہوتا، اگر دوسری طرف "میں نواز شریف بول رہا ہوں" کی آواز نہ گونجتی، اگر کریڈل پر معصوم ہاتھ کی گرفت مضبوط نہ ہوتی، اگر اس کے کڑوے کیلے منہ سے دہائی نہ نکلتی، اگر وہ چلی زرد آنکھوں سے پچکتے آنسو گلے میں گرنے سے نہ روکتی، اگر وہ دمٹ پورے ہونے سے پہلے اپنا دکھ نہ سنا سکتی، اگر وزیراعظم "اس بیٹی کو فوراً لائیں" کا حکم جاری نہ فرماتے تو موت کی دلیز پر کھڑی اس شریا کا کیا بنتا، اس کا مسکین باپ کب تک الٹے سرے قہام کر ایک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے ہسپتال کا فاصلہ مانتا رہتا، خیرات کی دواؤں پر وہ کب تک زندہ رہتی، دعائیں پھونکنیں اور تعویذ کب تک اس کی آس تھامے رکھتے، اسے آپریشن اور دوائیوں کے پیسے کون دیتا؟

اگر ۲۸ نومبر، ہفتے کے دن، صبح نو بجے قسمت اس پر مہربان نہ ہوتی، اگر اتفاقات کے سارے راستے اس کے گھر کی طرف نہ جاتے، اگر اس کی ساری ملتیں، صدتے، دعائیں آسمانوں سے پلٹ کر نیچے نہ اترتیں، اگر اس کی خواہشیں، تمنائیں، آرزوئیں ساحل مراد سے نہ ٹکراتیں تو اس ننھی شریا کا کیا بنتا، اس شریا کا جس کا ملک کے ۶۵ سو ۸ ہسپتالوں کے پاس کوئی علاج نہیں تھا، جس کے لیے ۴ ہزار ۵ سو ۲۳ ڈھنریوں، ۵ ہزار ایک سو ۲۱ بنیادی مراکز صحت اور ۵ سو ۱۳ رورل میڈیسن سنٹروں میں کوئی گولی، کوئی انجکشن، کوئی سپرپ نہیں تھا، جس کے لیے ۸ ہزار ۳ سو ۷۰ رجسٹرڈ ڈاکٹروں اور امراض قلب کے ایک ہزار ۴ سو ۱۰ ماہرین کے پاس کوئی وقت نہیں تھا، جس کے لیے صحت کے ۶۳ ارب ۶۶ کروڑ ۴۰ لاکھ روپے کے بجٹ سے ڈیڑھ لاکھ روپے نہیں تھے۔

جلا دینا چاہیے اس نظام کو، پھاڑ کر پھینک دینا چاہیے اس دستور کو اور دریا برد کر دینا چاہیے ان ضابطوں کو، جن کے ہوتے ہوئے ایک مریض کو دوا کے لیے وزیراعظم سے رابطہ کرنا پڑے، جن کی موجودگی میں ۱۳ سال کی بچی کو سانس لینے کے لیے دس سال تک امید و بیم کے ہلے صراط پر چلنا پڑے، جس میں حقدار اپنے حق کے لیے ۲۸ نومبر، ہفتے کے دن، صبح نو بجے سے نونج کر ۳۵ منٹ تک ٹیلی فون کا محتاج ہو۔ اگر وزیراعظم فارغ ہوئے، ٹیلی فون بحال رہا، بروقت اطلاع مل گئی، رابطہ ہو گیا، "السلام۔۔۔ میں" کی آواز آگئی تو بیڑے پار، آواز نہ آئی، رابطہ نہ ہوا، اطلاع نہ ملی، نظام درست نہ رہا، اور ٹیلی فون دستیاب نہ ہوا تو پھر وہی اندھیری رات، وہی ذلت، وہی بیماری، وہی اذیت۔

یہ شریا، وفاقی کالونی لاہور کی یہ ۱۳ سالہ شریا، دو ہزار پانچ سو روپے ماہوار تنخواہ لینے والے پی ڈی ایو ڈی کے ڈرائیور کی یہ بیمار شریا، تعویذوں اور پھونگوں سے دل کا سوراخ بھرنے والی یہ شریا، اس نظام سے سوال کرتی ہے، ۲۸ نومبر، ہفتے کے دن، صبح نو بجے ماڈل ٹاؤن سے جن شریاؤں کے رابطے نہ ہو سکے، ان کے دکھوں کا علاج کون کرے گا، انہیں آپریشن اور دوائیوں کے پیسے کون دے گا، ان کا نواز شریف کب آئے گا؟



بندر آنکھیں مانگتا ہے

میں بہت سونے والا شخص ہوں، اگر کوئی پریشانی، اندیشہ یا ضروری کام نہ ہو تو میں مسلسل چودہ پندرہ گھنٹے سو سکتا ہوں، اس دائمی عادت کے باعث میرے احباب مجھے ”بحرالکامل“ کہتے ہیں لیکن پچھلے دو ہفتوں سے میری نیند اچانک کم ہو گئی، میں گھنٹوں کروٹیں بدلتا ہوں، بستر تبدیل کرتا ہوں، خینڈ آور گولیاں کھاتا ہوں، آٹو کھشن کے ذریعے خود کو نیند کی افادیت سمجھاتا ہوں لیکن ان تمام کوششوں کے باوجود بمشکل دو گھنٹے سو پاتا ہوں، اس جنگی یکم نیند میں بھی ہر دس منٹ بعد میری آنکھ کھل جاتی ہے، میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا ہوں، سر ہانے کے نیچے ہاتھ مارتا ہوں، منہ کھول کر اخباری کاغذ کا وہ ٹکڑا نکالتا ہوں، آنکھیں مل مل کر اسے دیکھتا ہوں، ذرا پیسے بدل بدل کر گدے کی سیالے کاغذ پر چھپی بندر کی تصویر دیکھتا ہوں مجھے یہ تصویر ہر بار اپنی آنکھیں داپس مانتی محسوس ہوتی ہے، اس کے پیلوں کی خراشیں، اس کے چہرے کا کرب اور اس کی لٹھکی گردن کا دکھ اس طرح چختا چلاتا اور سوال کرتا دکھائی دیتا ہے۔

یہ تصویر دو ہفتے قبل ایک انگریزی روزنامے میں چھپی تھی میرے بیٹے نے اسے کات کر میری رائیٹنگ ٹیبل پر رکھ دیا تھا، میں اسے ایک مذاق سمجھا۔ میرا بیٹا اکثر اخبارات سے جانوروں کی تصویریں کات کر ان کے اوپر ”یہ آپ ہیں“ لکھ کر میری ٹیبل پر رکھ دیتا ہے، میں کاغذ کے اس ٹکڑے کو مسکرا کر نوکری میں پھینکنے لگا لیکن پھر اچانک میری نظر کپشن پر پڑی، لکھا تھا ”فیصل آباد سے ۵۳ کلومیٹر دور آباد قصبہ سندری میں ایک دوکاندار نے بیسیوں لوگوں کی موجودگی میں برف توڑنے والے سوئے سے اپنے اس پالتو بندر کی دونوں آنکھیں نکال دیں، بندر نے دوکاندار کے چھوٹے بیٹے کو لاڈ میں پنچہ مار دیا تھا“ میں نے اخبار کا تراش نوکری میں پھینکنے کی بجائے سر ہانے کے نیچے رکھ لیا بس یہی میری غلطی تھی کیونکہ اس کے بعد میری آنکھیں خینڈ، میرا دماغ جھین اور میرا جسم آرام کو ترس گیا، میں کھانا کھانے بیٹھتا ہوں تو مجھے گوشت، ترکاری، آبلٹ سے تازہ خون کی بو آنے لگتی ہے، میں اخبار کھولتا ہوں تو ہر لفظ آنکھ بن جاتا ہے، میں کتاب اٹھاتا ہوں تو ہر ورق پر ڈھیلے بچے نظر آتے ہیں، میں باہر جاتا ہوں تو مجھے ہر گزرنے والا شخص آنکھیں مانگتا دکھائی دیتا ہے، میں سونے لگتا ہوں تو ایک چھوٹا بندر سر ہانے کے نیچے سے ٹھسک کر باہر آ جاتا ہے، میرے چہرے سے کبل سر کاٹا ہے، میری ناک نوچتا

ہے، میری گال تھپتھپاتا ہے، میں ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھتا ہوں، آنکھیں مل کر دیکھتا ہوں، بندر میری اکھڑی سانس اور بے جھن، بے ترتیب کروٹیں محسوس کرتا ہے اور اپنے دیکھتے ہوئے سبلا کر بھکاریوں کی طرح دونوں ہاتھ میرے سامنے پھیلا دیتا ہے مجھے اس کی چھوٹی سی ہتھیلیوں پر خون کے چند قطرے اور سینکڑوں چیختے چلاتے سوال رکھے نظر آتے ہیں۔

مجھ سے بندر پوچھتا ہے، میرا جرم کیا تھا، مجھے زنجیر میں باندھ کر دوکان کے تھڑے پر کیوں بٹھا دیا گیا، آواز دے کر لوگ کیوں جمع کیے گئے، برف توڑنے والا سوا میرے سامنے کیوں لہرایا گیا، میری گردن جکڑ کر اپنی سوا میری آنکھوں میں کیوں اتار دیا گیا، میری آنکھ سے لہو کے اچلتے فوارے پر قبضہ کیوں لگایا گیا، سوا کھینچ کر باہر کیوں نکالا گیا، دوبارہ کیوں لہرایا گیا، میری دوسری آنکھ میں کیوں پرویا گیا، مجھ سے بندر پوچھتا ہے انسانوں کے اس جنگل میں میرا فیصلہ کون کرے گا، میرا منصف کون ہوگا، میری عدالت کہاں لگے گی، میرا جج، میرا وکیل، میری مسل، میرا مقدمہ، میرا ہر کارہ، میرا ریزر کہاں ہے، میرا احتجاج کہاں ریکارڈ ہوگا، میری آواز کون سنے گا، میری زنجیر عدل کہاں نصب ہے، میرا جہانگیر، میرا نواز شریف کہاں ہے، مجھ سے بندر پوچھتا ہے، مجھے میری آنکھیں کون لوٹائے گا، میری خاموشی، میری بے زبانی کو زبان کون دے گا، انسانوں کے اس جنگل میں میری ترجمانی کون کرے گا۔

رات کے آخری پہر، کمر میں لمبی رات کے آخری پہر، میں نے لمبی بارسوجا میں ہاتھ آگے بڑھا کر بندر کے پیٹوں پر انگلیاں پھیریں، اس کے زخم سہلاؤں، اس کی ٹھوڑی ذرا سی اوپر اٹھاؤں، چٹکی بجا کر اسے اپنی طرف متوجہ کروں، جب اس کا چہرہ احساسات کی گرمی سے پگھلنے لگے تو میں اسے مخاطب کر کے کہوں، ”دوست افسوس میں تمہارا مقدمہ نہیں لڑ سکتا کیونکہ تمہاری آنکھیں اس معاشرے نے چھینی ہیں جو برسوں پہلے خود اپنی آنکھیں، اپنی سماعت، اپنا ضمیر دوسروں کے ہاتھ گردی رکھ چکا تھا جواب صرف ڈال کی چٹک دیکھتا اور پاؤنڈ کی آواز سنتا ہے، جہاں اب صرف اندھے اور بہرے لوگ بیٹے ہیں، ہاں دوست یہ لوگ تمہیں کچھ نہیں دے سکتے ان میں ایک بھی ایسا اہل نظر اور صاحب زبان نہیں جو تمہارا دکھ دیکھ سکے، جو تمہارا درد سن سکے، جاؤ چلے جاؤ، اس ہستی کے حضور چلے جاؤ جہاں کسی بے زبان کی بدعا ہے زبان نہیں رہتی، جہاں ہر مظلوم، مظلوم اور ہر ظالم، ظالم ہوتا ہے، جہاں سارے زخم بولتے اور ساری چیخیں گواہی دیتی ہیں، چلے جاؤ یہاں سے چلے جاؤ یہاں تمہیں کچھ نہیں ملے گا، یہ اندھوں کا شہر ہے، یہاں تمہیں آئینوں کا کوئی خریدار نہیں ملے گا، یہ بہروں کا ملک ہے یہاں تمہارے دروکی وٹلی کوئی نہیں سنے گا۔“



یزید کے دور میں حسینؑ کی ضرورت

موت سے ایک لمحہ پہلے جب اس کی نبلی، خشک اور سوچی ہوئی زبان منہ سے باہر نکل رہی تھی، گردن کی ساری رگیں پھول کر رسیاں بن چکی تھیں، چہرے پر خون کے سانپ دھبے تھے اور وحشی دیر سے اہل کر پیٹوں سے باہر جھانک رہے تھے تو سانس کا ایک قطرہ پھٹے ہوئے پیٹ سے اٹھا اور مردہ رگوں میں بجلی کی طرح دوڑتا ہوا لہو سے بھری ناک میں آکر ٹھہر گیا، اس نے دکھ میں تھکڑی ہوئی ہچکی لی اور جشیدہ کوارٹر کا وہ تھانہ اس کی بے نور پتلیوں پر ہمیشہ ہمیش کے لیے ثبت ہو گیا۔

روح نے ایک لمبی انگڑائی لی اور کچلے ہوئے وجود سے باہر آکر اپنا آپ ٹٹولنے لگی، سامنے مخری کی کرسی کے بالکل اوپر بالائی پاکستان کی تصویر آویزاں تھی۔ روح نے ہاتھ اٹھایا اور قائد کا نام پکڑ کر بولی: "نانا جی میرا کیا تصور تھا، میں تو گھر سے پراخے خریدنے نکلا تھا، مجھے کیا معلوم تھا آپ کی پولیس کے نزدیک پراخے خریدنے کی سزا موت ہوتی ہے۔ نانا جی انہوں نے مجھے بہت مارا، میری ٹانگیں ٹوٹ گئیں، میرے گردے ناکارہ ہو گئے، میری بینائی چلی گئی، میرا پیٹ پھٹ گیا اور میری ریزہ کی ہڈی ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی، نانا جی میں نے انہیں بار بار آپ کا واسطہ دیا، درود کر گزرا کر ان سے کہا، میں قائد اعظم کا پڑ لو اسے ہوں، مجھ پر رحم کرو، لیکن نانا جی ان کے نزدیک تو آپ سے نسبت پراخے خریدنے سے بھی بڑا جرم تھا۔"

اور جب یہ کئی پمپی اور بجلی لاش جھانگیر روڈ کی کچی آبادی کے مکان میں پہنچی تو قائد اعظم کی نواسی نے اس کا ہاتھ چوم کر کہا: "میرا اسکندر تو نانا جی کی ہو بہو نقل تھا، ایک کو لگا تو دوسرے کو چھپا لو، رات کو جب پورا شیر سو جاتا تھا تو میرا بیٹا بلب پر لفافہ چڑھا کر پڑھنے لگتا تھا، میں اس سے کہتی تھی سکندر بیٹا، سو جاؤ رات بہت گزر چکی ہے تو وہ کہتا اماں اگر میں بھی سو گیا تو قوم کو کون چکائے گا، ہائے میرا بچہ قوم کو چکاتے چکاتے خود ہی سو گیا۔"

اور جب لاش کے بوڑھے باپ نے اس کی سوچی ہوئی خشک زبان دیکھی تو وہ رگوں کی رسیوں میں جکڑی گردن پر ہاتھ پھیر کر بولا: "میں اپنے بیٹے کو عظیم انسان بنانا چاہتا تھا، میں چاہتا تھا جب یہ گھر سے نکلے تو لوگ رک رک کر کہیں: "دیکھو یہ نوجوان جس کی آنکھوں میں ذہانت بجلی بن کر دوڑتی ہے اور جس کے باریک ہونٹوں پر پولیس اشارے کی منتظر رہتی ہیں اور جو قد کاٹھ میں رنگ روپ میں، چال و حال میں قائد اعظم جیسا

ہے، محمد علی جناح کا پڑاوس ہے، ان کے بھائی کی بیٹی کی بیٹی کا بیٹا ہے، ہاں میں چاہتا تھا میرا یہ بیٹا میری بجائے جناح خاندان کی نسبت سے پہچانا جائے لہذا میں سردیوں کے ٹیگ سویروں اور آگ برساتی گرم دوپہروں میں بیوند لگے کپڑوں میں، پاؤں میں گھسی ہوئی ہوائی چپل پہن کر اس نامراد شہر میں پلاسٹک کے شاپنگ بیگ چیتا رہا، لیکن اپنے اکلوتے بیٹے کو تعلیم دلاتا رہا کہ میں اس فراموش کردہ خاندان میں ایک اور قائد چاہتا تھا۔“

اور جب لوگ لاش کے بکڑے ہوئے چہرے پر خون کے جسے ہوئے سانپ دیکھنے کے لیے جمع ہوئے تو ایک ہمسائے نے چیخ کر کہا: ”جب اس گھر میں محمود علی آئے تھے تو قائد اعظم کی اس نواسی نے ان کے سامنے ہاتھ باندھ کر کہا تھا، میں کچھ نہیں چاہیے، نہ مکان، نہ نوکری اور نہ ہی وظیفہ، بس ہمارے بچے کی تعلیم کا بندوبست کر دیں، بس ہمیں ہمارے خواب کی تعبیر کے راستے پر کھڑا کر دیں۔“ تو محمود علی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، انہوں نے بچے کو قریب بلایا، اس کے ماتھے پر بوسہ دیا اور پھر خورشید بہن کو مخاطب کر کے بولے: ”بہن بد قسمتی دیکھیں، ہم آج جس عظیم شخص کی دی ہوئی زمین پر سینہ بھلا کر کھڑے ہیں، اسی کی نواسی اپنے بچے کی تعلیم کے لیے میرے جیسے گنہگار کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑی ہے، نہیں بہن ہم لوگ اگر آپ لوگوں کے پاؤں دھو دھو کر پیتے رہیں تو بھی آپ کے خاندان کے احسانات کا بدلہ نہیں اتار سکتے..... یہ بچہ ضرور پڑھے گا، برقیہت پر پڑھے گا کہ اس ملک پر اگر کسی بچے کا حق بنتا ہے، تو وہ صرف یہی بچہ ہے۔“

اور لاش کے بہنوں سے باہر نکلے ہوئے دیدوں پر نظر گری تو دوسرے ہمسائے نے سسک کر کہا: ”ابھی پچھلے ہی مینے کی بات ہے، سکندر علی جناح، قائد اعظم کی سالگرہ منانے مزار قائد پر گیا تو واپسی پر مرجھائی ہوئی چٹاں سینٹ لایا، میں نے پوچھا: ”سکندر یہ کیا ہے؟“ نہیں کر بولا: ”چچا یہ نانا جی کی قبر کی چٹاں ہیں، دیکھو مرجھا کر بھی خوشبو دے رہی ہیں۔“ میں نے قہقہہ لگایا اور پوچھا: ”پر تم ان کا کرو گے کیا؟“ تو بڑی سنجیدگی سے بولا: ”میں انہیں اپنی کتابوں میں رکھوں گا، سنا ہے بزرگوں کی قبروں کی چٹاں کتابوں میں رکھنے سے علم سے لگن بڑھتی ہے، آنکھوں کی روشنی تیز ہوتی ہے، انگلیوں سے خوشبو آتی ہے۔“

اور جب لاش کے چہنے ہوئے چہیت پر نظر پڑی تو ایک ہمسائی سے چیخ ضبط نہ ہو سکی اور وہ بین نرتی ہوئی بولی: ”آہ! خالوں نے میرے قائد کی آخری نشانی بھی مٹا ڈالی، لوگ تو نسبتوں کے احترام میں دلیوں کے بدکردار نواسوں تک کے ہاتھ چوستے رہتے ہیں لیکن ان بد بختوں نے نیک انسان کے نیک نواسے ہی کو مٹا ڈالا۔“

اور جب یہ لاش ایک کمرے کے بوسیدہ مکان سے نکل کر قبرستان پہنچی تو لوگوں نے گورکن سے کہا: ”اس لاش کی پانچھی میں ایک قبر اور کھودنا کہ ہم اس میں ایک نعرہ، ایک جھنڈا اور ایک ترانہ دفن کرنا چاہتے ہیں، اپنے خواب، آرزو مند زندگی کی خواہش اور عزت نفس سے بھر پور مستقل سے ارمان دفن کرنا چاہتے ہیں۔ آخر ہم کب تک اپنے نظریوں کی نشیں اٹھائے اٹھائے پھریں گے، گورکن نے گینتی اور بیٹلے پرے بیچنا اور پھر

آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر بولا: "تم لوگوں کا خیال ہے ابھی ترانہ جھنڈا اور نعرہ زندہ ہے، نہیں ہرگز نہیں، اس قبرستان کی ہر قبر کی پائنتی میں ایک اور قبر ہے جس میں سارے سنہرے خواب، ساری کھکتی خواہشیں اور سارے چمکتے ارمان دفن ہیں، یہ قبریں انسانوں کی نہیں خوابوں اور نظریوں کی ہیں..... خدا کی قسم اگر نظریے اور خواب زندہ ہوتے تو کیا سکندر علی جناح کی یہ لاش ہر ایک سے اپنا جرم پوچھتی پھرتی۔"

اور گمان یہ کہتا ہے جب یہ چمکتی، دکتی اور مسکتی لاش بارگاہ رسالت ﷺ میں پہنچی ہوگی تو محبوب خدا نے انہد کر اس کا استقبال کیا ہوگا، اسے سینے سے لگایا ہوگا، اس کا ماتھا چوما ہوگا، اس کی سوجی ہوئی زبان پر انگشت مبارک پھیری ہوگی، اپنے دست مبارک سے اس کی گردن کی ساری سلونیں صاف کی ہوں گی، آنکھوں پر پھونک مار کر اذیت کے سارے نشان مٹائے ہوں گے اور پھر اپنی نظر مبارک سے لاش کے سارے چہرے چلاتے شکوے دھو کر آگے پیچھے دیکھا ہوگا اور پھر جہنم سے پوچھا ہوگا: "محمد علی کہاں ہے؟" قائد اعظم فوراً لوگوں کو حیر کر سامنے آکھڑے ہوئے ہوں گے، آپ ﷺ انہیں دیکھ کر مسکرائے ہوں گے اور پھر کندھے پر ہاتھ رکھ کر مہکتے لہجے میں فرمایا ہوگا: "محمد علی تم اپنے حسین سے نہیں ملو گے، دیکھو آج اس پر کتنا روپ ہے۔" قائد نے ادب سے سر جھکا یا ہوگا، آنکھیں نیچی کی ہوں گی اور پھر عرض کیا ہوگا "یا رسول اللہ ﷺ میرا حسین مجھ سے پوچھتا تھا، تانا جی آخر مجھے کیوں قتل کیا گیا؟" حضور ﷺ نے یہ سن کر جسم کیا ہوگا اور پھر قائد سے مخاطب ہو کر فرمایا ہوگا:

Kashif Azad @ OneUrdu.com

"محمد علی تم اس سے کیوں نہیں کہہ دیتے یزیدوں کے دور میں حسینوں کی ضرورت نہیں رہا کرتی۔"



موت، خود ارڈو میں زندگی کی تلاش

ملاقاتیوں کی فہرست میں ایک نام دیکھ کر جنرل ضیاء الحق کا رنگ سرخ ہو جاتا تھا، چہرے پر پسینہ آ جاتا تھا اور وہ غصے اور نفرت سے اس نام پر اتنی بار قلم پھیرتے تھے کہ کاغذ پھٹ جاتا تھا اور اگر کبھی کسی میٹنگ، کسی اجتماع یا کسی تقریب میں ان کا سامنا اس "ذات شریف" سے ہو جاتا تو مرحوم صدر ملاقات سے پرہیز کرتے تھے اور یہ بھی دیکھا گیا کہ اگر کبھی انتہائی مجبوری میں جنرل کو "ان" سے ہاتھ ملانا پڑ جاتا تو انہوں نے خلاف معمول ہاتھ فوراً واپس کھینچ لیا، یہ طرز عمل صدر کے مزاج شناس ساتھیوں کے لیے پریشان کن تھا، لہذا وہ معاملے کی نوہ میں لگ گئے، لیکن انہیں بری طرح ناکامی ہوئی کیونکہ اس شخص کا نام سننے ہی صدر کے چہرے کا رنگ بدل جاتا تھا، مخاطب کو غصے سے دیکھتے تھے اور فائل سیز پر قلم کر کے کہتے تھے "کیا آپ کوئی اچھی بات نہیں کر سکتے؟" اور مخاطب سہم کر فوراً باہر نکل جاتا۔

ایک روز جب مرحوم انتہائی خوشگوار موڈ میں ٹہل رہے تھے تو جنرل رفاقت نے محتاط انداز سے بلوچستان کی سیاست کا ذکر چھیڑ دیا، صدر مسکرائے اور اپنے مخصوص انداز میں قبائلی سرداروں کے چٹکے ستانے لگے، جب گفتگو خوب رواں ہو گئی تو جنرل رفاقت نے ڈرتے ڈرتے پوچھا "آپ جام صاحب سے اتنا تاثیر پذیر کیوں ہیں؟" یہ سننے ہی مرحوم کا رنگ سرخ ہو گیا، غصے سے سانس چڑھ گیا اور قدم واپس رک گئے۔ انہوں نے جنرل رفاقت کو گھور کر دیکھا اور پھر کانپتی ہوئی آواز میں بولے: "رفاقت مجھے معلوم ہے، آپ لوگوں کو میرا بدلا ہوا رویہ اچھا نہیں لگ رہا لیکن میں کیا کروں، جب بھی یہ شخص میرے سامنے آتا ہے میرا جی چاہتا ہے میں اس کا خون پی جاؤں، اس کی بوٹی بوٹی انگ کر دوں لیکن میں مجبور ہوں۔" جنرل ر کے ایک لمبا سانس لیا اور بھاری قدموں سے چلتے ہوئے لان چیئر پر ڈھیر ہو گئے۔ جنرل رفاقت مغصوم سے ہو کر سامنے کھڑے ہو گئے، جنرل ضیاء نے ان کی طرف دیکھا اور چہرے پر تاسف، دکھ اور اذیت میں ڈوبی مسکراہٹ سجا کر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ جنرل رفاقت فوراً جھکے اور کرسی کھینچ کر بیٹھ گئے۔ مرحوم صدر چند لمحوں تک اپنی پھولی ہوئی کپڑی شہادت کی انگلی سے سہلاتے رہے، جب سانس کچھ خفنی ہوئی اور چہرے کی حدت میں کچھ کمی واقع ہوئی تو وہ جھکی جھکی آواز میں بولے:

”رفاقت ایک روز جب میں آفس سے گھر لوٹا تو آپریٹر نے سامنے ٹیلیفون پیغامات رکھ کر کہا ”سر کوئی لڑکی صبح سے فون کر رہی ہے، آواز سے بہت پریشان محسوس ہوتی ہے۔“ میں نے لڑکی کا نمبر پوچھا تو آپریٹر نے بتایا، وہ کسی پلی سی او سے بات کر رہی تھی، میں نے پیغامات کی شیٹ واپس کی اور آپریٹر کو ہدایت کی اب اگر اس لڑکی کا فون آئے تو میں جہاں بھی ہوں میری اس سے فوراً بات کرائی جائے، آپریٹر سلیوٹ کر کے چلا گیا۔ خوش قسمتی سے آدھ گھنٹے بعد ہی اس بچی کا فون آگیا، میری آواز سنتے ہی لڑکی نے دھاڑیں مار کر رونا شروع کر دیا، میں پریشان ہو گیا، میں نے اسے چپ کرانے کی کوشش کی لیکن اس کے منہ سے بات ہی نہیں نکل رہی تھی۔ آخر میں نے اس لڑکی سے کہا: ”بیٹا آپ ایک منٹ کے لیے پلی سی او کے مالک کو فون دیں۔“ لڑکی نے اضطرابی کیفیت میں ریسیور قریب کھڑے شخص کو پکڑا دیا، میں نے اس سے پلی سی او کی لوکیشن پوچھی اور اسی وقت ڈرائیور بھیج کر لڑکی کو ایوان صدر بلا لیا، رفاقت تم اندازہ نہیں کر سکتے اس بچی کی کہانی کتنی تھنی بولناک تھی۔ وہ لڑکی بہت ہی غریب تھی لیکن دن رات کی محنت سے ایف ایس سی کر گئی۔ میڈیکل کالج میں داخلے کے لیے اپلائی کیا تو دو نمبروں سے رو گئی۔ پھر کسی نے بتایا وزیر اعلیٰ کے پاس چند نشستیں ہیں اگر وہ چاہے تو اسے اپنے کونے سے داخلہ دلا سکتا ہے۔ بچی نے وزیر اعلیٰ تک اپروچ کی کوشش کی تو پتا چلا کہ میں اس سے ملاقات ناممکن ہے۔ جہاں البتہ حسبِ وجوہ اسے پر اسلام آباد جانے تو بلوچستان ہاؤس میں ملاقات پہنچا آسان ہوتی ہے۔ اب یہ لڑکی وزیر اعلیٰ کے دورہ اسلام آباد کا انتظار کرنے لگی، بد قسمتی سے ایک ہی ہفتے بعد وزیر اعلیٰ ”صاحب“ اسلام آباد آگئے۔ یہ لڑکی بھی ادھار پکڑ کر اس کے پیچھے پیچھے یہاں پہنچ گئی۔ تھوڑی بہت کوشش سے بلوچستان ہاؤس میں اس کی ملاقات ”ان“ سے ہو گئی۔ وزیر اعلیٰ صاحب نے عرض سنی تو مسکرا کر بولے ”ہاں یہ تو کوئی کام ہی نہیں لیئر پیڑ اور مہر اندر ہے، آؤ میرے ساتھ ابھی لکھ دیتا ہوں اور بچی اس بزرگ کے ساتھ اندر چلی گئی۔ اور رفاقت اگر تم میری جگہ ہوتے، تم نے بھی خود اپنے ہاتھوں سے اس مظلوم بچی کے زخم دھوئے ہوتے، اس پر پٹیاں باندھی ہوتیں، اس بچی کو پہننے کے لیے اپنی بچی کے کپڑے دیئے ہوتے اگر میری ہی طرح تم نے بھی اس کے آنسو پونچھ کر کہا ہوتا ”بیٹے اپنے یہ پھٹے ہوئے کپڑے ہمیں چھوڑ جانا کہ جب بھی وہ شخص تمہارے اس بوڑھے باپ کے سامنے آئے تو غصے سے اس کی آنکھیں سرخ ہو جائیں، ہاں رفاقت اگر تم بھی اس تجربے سے گزر رہے ہوتے تو اس شخص کو دیکھ کر تمہارا خون بھی کبھی خشکانہ رہتا، اسے دیکھ کر تم بھی اطمینان سے کافی نہ پئی سکتے! تم بھی اس سے گپ نہ لگا سکتے!“

اس واقعے سے ٹھیک چودہ برس بعد ملتان کی ایک اور بچی پلو میں چند خواب باندھ کر اپنے محروم، پریشان اور بیمار و زکار بھائی کے لیے نوکری لینے اسلام آباد آئی تو راہبر اسے ایک وفاقی وزیر کے دفتر لے گئی، اسے نرم گداز اور خوشبو دار صوفے پر بٹھایا اور ”میں وزیر صاحب کا چاچا کرتی ہوں“ کا کہہ کر چلی گئی اور پھر چند لمحوں بعد جب ابھی بہا، الدین ذکر یا یونیورسٹی کی اس سیدھی سادی طالبہ نے پوری طرح ڈیڑھ لاکھ روپے کا

فالوس بھی نہیں دیکھا تھا، انگلیوں سے لاکھوں روپے کے اسپورٹس وال پیپر کا گداز بھی محسوس نہیں کیا تھا اور اپنے پاؤں تلے بچھے نرم و ملائم قالین کی حدت بھی جذب نہیں کی تھی کہ نوکری دینے والے آگئے "لیٹر پیڈ اور میر تو اندر ہے" والے دریا دل حکمران آگئے اور پھر شاید ہی کسی کان نے اس بچی کی چیخیں سنی ہوں، اس کی آہوں، اس کی سسکیوں اور اس کی بد دعاؤں پر کسی نے پلٹ کر دیکھا ہو؟ اور شاید ہی کسی کے دل نے ایک لمحے کے لیے رک کر سوچا ہو "سنو یہ ایک گلے سڑے، بدبودار سانچ کی آخری چیخ ہے" شاید ہی کسی کے ضمیر نے دستک دے کر کہا ہو "اس بستی میں ایک بھی شخص زندہ ہے تو آئے کہ کوئی میں نوب اکلی کمزری ہے۔" لیکن نہیں وہاں کوئی زنجیر عدل نہیں تھی، کسی کان میں حس سماعت نہیں تھی، کسی سینے میں دل نہیں تھا اور کسی وجود میں ضمیر نہیں تھا۔

جب یہ بچی اپنی خراشیں لیے اس شہر میں در بدر پھر رہی تھی، اپنی تکی کزور اگلیوں سے اپنا ریزہ ریزہ وجود چن رہی تھی، اپنے کھٹے دانتوں سے اپنے خوابوں کی گانگھیں کھول رہی تھی تو کاش میری اس سے ملاقات ہو جاتی تو میں اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہتا "میری بہن تم سو آجوداؤں میں زندگی تلاش کر رہی ہو، چھاننیوں سے پانی مانگ رہی ہو، دکانداروں کے ترازو کو انصاف کا پیمانہ سمجھ رہی ہو کہ اس ملک میں اب ہر وہ لڑکی فقط عورت ہے، جس کے خاندان میں کوئی ایمر ہیں انے نہیں، کوئی ایم بی اے اور کوئی وی آئی بی نہیں۔" Ka
ہاں اس بستی میں اب کوئی ایسا شخص نہیں جو اس بچی کو اپنے سامنے بٹھائے، اس کے زخم دھوئے، اس کی رستی ہوئی کلاسیوں اور اس کی کٹی ہوئی جلد پر پٹیاں باندھے، اس کے آنسو پونچھے اور اسے اپنی بیٹی کے کپڑے دے کر کہے "بیٹی اپنے پھنے ہوئے کپڑے یہیں چھوڑ جانا" ہاں ہاں اس شہر میں، اس ملک میں، اس ایوان صدر، اس وزیر اعظم ہاؤس اور اس پارلیمنٹ میں ایک بھی ایسا شخص نہیں جس کی بیٹی کے کپڑے اس بیٹی کو پورے آتے ہیں۔

ہاں جس کوئی کا ہر باسی بے حس، بے شرمی اور بے غیرتی کے ہاتھ پر بیعت ہو چکا ہوا، وہاں حسین کی نعش کو کفن نہیں ملا کرتا، وہاں نوب کی چیخوں کو آواز نہیں ملا کرتی۔



بچے روٹی مانگتے تھے

اس ماں کو شہباز پور سے پنڈی گھیب تک ایک بھی ایسا شخص نہیں ملا جو اس کے پانچ بچوں کی آنکھیں میں رہی بھوک پڑھ سکتا، تین دن کے خالی پیٹ کی آواز میں سن سکتا، احتجاج کرتی ہوئی نیلی نہیں دیکھ سکتا، چہروں پر پھیلی زردی محسوس کر سکتا۔۔۔۔۔ ہاں! ان بے حس لوگوں میں اسے ایک بھی ایسا شخص نہیں ملا جو بارہ دن کے اس بچے کی اکٹری سانسیں گن سکتا، جس کے لیے ماں کی چھاتیوں میں دودھ کا ایک بھی قطرہ نہیں تھا۔

ہاں! اس اینٹ اور گارے کے شہر کے بھری سے بنے لوگ کیسے اندازہ کر سکتے ہیں غربت میں تسخیری اس ماں نے چھریاں کیسے تلاش کی ہوں گی! انہیں روٹی سے کیسے تیز کیا ہوگا، جب پرانے لوہے کی دھار تلوار بنی ہوگی تو وہ کتنی دیر تک اسے اپنے آنسو پلاتی رہی ہوگی! اس نے اپنے لرزتے کانپتے فیصلے کو کولاہ کیسے بنایا ہوگا؟ اس نے صحن میں روٹی کے انتھار میں بیٹھی نو سالہ بیٹی کو کس زبان سے کہا ہوگا، ”آؤ میں تمہیں روٹی کھلاتی ہوں۔“ اس نے بیٹی کو اندھیرے کمرے میں لٹا کر اس کے منہ پر کیسے ہاتھ رکھا ہوگا، ہاں! اس نے اس معصوم بچی کے حلق پر چھری چلاتے ہوئے منٹا کا کلیجہ نکال کر کہاں رکھا ہوگا، پھر وہ گھر کے کسی کونے میں بھوک سے غم حال پڑے دوسرے بچے کو کیسے اٹھا کر اندر لائی ہوگی اس نے اس کے حلق پر بھی چھری کیسے چلائی ہوگی، پھر تیسرا اور چوتھا بچہ۔۔۔۔۔ اور ہاں آخر میں جب بارہ دن کا وہ بچہ جو ابھی روٹی اور اندھیرے میں قیصر نہیں کر سکتا، اسے خون میں تر گرم چھری کا لہس کیسا محسوس ہوا ہوگا اور پھر وہ نصیبوں کی ماری ماں کیسے ویرانے میں گھنٹوں خشک آنکھوں سے اپنے شہید بچوں کا ماتم کرتی رہی ہوگی، کہ خالی پیٹ آنکھوں کو آنسوؤں کی اجازت بھی نہیں دیا کرتے اور جب اس ظالم اے ایس آئی نے اپنے فرعونی لہجے میں اس سے پوچھا ہوگا۔

”او بد بخت عورت تم نے اپنے پانچ بچے کیوں ذبح کئے؟“ تو وہ خنڈے ٹھار لہجے میں کیسے بولی ہو گی۔ ”کیا کرتی وہ مسلسل تین دن سے روٹی مانگ رہے تھے“ اور پھر چھروں کی آنکھوں سے آنسوؤں کے جشے کیسے پھولے ہوں گے۔۔۔۔۔ ہاں پنڈی گھیب کے بے حس لوگو!۔۔۔۔۔ اور شہباز پور کی بھڑ ماؤں کیا تم نے زندگی میں اتنی خوفناک بھوک دیکھی ہے کہ پڑوسن کے باورچی خانے سے اڑ کر آنے والی خوشبو تمہارے بچوں کے معدوں میں آگ لگا کر گزرتی ہو اور جنیوں سے اٹھتا ہوا دھواں تمہارے بچوں کی آنکھوں میں اسی بچھا جاتا ہو

نہیں کبھی نہیں در نہ پانچ بچے تمہارے اس کربلا میں یوں جان سے گزرتے؟

ہاں یہ وہی شہر ہے جس کے ہاں نے اپنے بیٹے کی شادی پر دس لاکھ روپے کا کھانا کھلایا تھا۔ اسی شہر میں وہ حاجی صاحب رہتے ہیں جو حجازِ حرم میں خود بصورت محل کے لیے ہر سال مسجد کو ہزاروں روپے چندہ دیتے ہیں۔ اسی شہر میں ایک بچے کے حقیقی پر ۲۰ دہوں کی قربانی دی گئی تھی اسی شہر کے ایک سردار کے پاس کروڑوں روپے کے اثاثے ہیں۔ اسی شہر کے شیخ روزانہ لاکھوں کابزس کرتے ہیں۔ اسی شہر کے بیوپاری لاکھوں ٹن غلہ خریدتے اور بیچتے ہیں اسی شہر کی دکانوں پر روزانہ تازہ مہزیاں دس وار پھل اور پلے ہوئے صحت مند جانوروں کا گوشت آتا ہے اور شام سے پہلے بک جاتا ہے اسی شہر کے کتے اتنے موٹے صحت مند اور پلے ہوئے ہیں کہ ان کی ٹانگیں اپنے ہی بوجھ تلے کانچتی ہیں اسی شہر کی گلیوں سے بھکاری روزانہ تھیلے بھر بھر کر نکلتے ہیں فراوانی رزق کے باعث اسی شہر کی فضا میں چٹیلں اڑتی اور کوئے منڈیوں پر بیٹھے رہتے ہیں اسی شہر کے بامیوں کے منہ پر ”چوہے اور بلیاں چین نہیں لینے دیتے۔“ کی شکایتیں رہتی ہیں۔ یہی ہیں وہ لوگ جو روز سنے استری شدہ کپڑے پہن کر باہر نکلتے ہیں اور لوٹ جن کی جیبوں سے جھانک جھانک کر اللہ کے فضل و کرم کی گواہی دیتے ہیں لیکن یہی ہیں وہ لوگ جن کی تمام تر دولت دریا دلی اور فیاضی پانچ بھوکے بچے تک ان کی رانہائی نہ کر سکی۔

Kashif Azad @ OneUrdu.com

ہاں مجھے یاد ہے کہ جب ایک درویش بستی گاتی بستی میں بھوکا سویا تو رزاق کائنات نے اس ساری بستی کا رزق ساکت کر دیا، فصلیں اجڑ گئیں، پھلوں کو کیڑا کھا گیا، درخت پودے فنا ہو گئے، تھیلوں میں بند اناج بھر بھری مٹی بن گیا۔ ان دیکھی بیماری سارے جانور چاٹ گئی پانی کھا رہا ہو گیا، ماؤں کی چھاتیاں سوکھ گئیں۔ پھر وہ بستی مٹی کا نیلہ بن کر محفوظ ہو گئی جہاں سے گزرنے والا ہر بھونکا اپنے ساتھ عبرت کی تھوڑی سی راکھ اڑالے جاتا ہے کہ شاید راستے میں پڑتی بستی گاتی بستیوں کو اس کی ضرورت پڑ جائے۔

اور مجھے یقین ہے شہباز پور کے کربلا میں بھوک کے شمر کے ہاتھوں مرنے والے یہ پانچ بچے اللہ کی نظر میں شہید ہیں اور خدا انہیں ایسے قبروں میں رزق پہنچا کر زندہ رکھے گا کہ جب شہباز پور کے حاجی شیخ اور سردار صاحب کی پکڑ ہو اور وہ خالق کائنات کا دامن تمام کر اپنا گناہ پوچھیں تو یہ شہید کمزے ہو کر گواہی دے سکیں ”ہاں یہی ہیں وہ لوگ جن کے باورچی خانے سے اڑتی خوشبو نے ماں کو ہمارے گلے پر چھری چلانے پر مجبور کر دیا تھا۔“

اور مجھے یہ بھی یقین ہے جب فرشتوں نے خالق کائنات سے پوچھا ہو گا یا باری تعالیٰ اتنا بڑا علم ہوا لیکن آپ نے اس بستی پر کوئی عذاب نازل نہیں فرمایا تو محسن انسانیت ﷺ کے رب نے کہا ہو گا۔

”جہاں بے حسی ہو وہاں کسی دوسرے عذاب کی ضرورت نہیں ہوتی۔“



گدھوں کے شہر میں انسان کی موت

موت سے ڈرا دیر پہلے اس نے آنکھیں جھما کر دیکھا، سامنے ہسپتال کی کینٹین کے بالکل سامنے پانی کا ڈرم دھراتھا جس کی نوئی کی تاب سے پانی کی باریک لکیر اڑ کر دور گر رہی تھی اور اس سے پرے کینٹین کا حبشی نما موٹا بھدا مالک سالن کے بڑے حج سے دھجیوں پر بیٹھی کھیاں اڑا رہا تھا اور وہاں بیسیوں لوگ تھے سب کھا رہے تھے سب پی رہے تھے اور سب قہقہے لگا رہے تھے لیکن وہ..... ہاں اس نے اپنے شک ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیری اور سوچا کیا میں بھی علی اصغر کی طرح فرات کے کنارے پیاسا ہی مر جاؤں گا اور جب حساب کے فرشتے آکر میری دھندلائی آنکھوں میں جھانکیں گے تو انہیں پانی کی لکیر کے سوا کچھ نہیں ملے گا..... اور پھر اس نے اپنے اوپر جھکی بوڑھی نانی کو دیکھا جس کے چہرے پر شام غریباں کا دھواں اور آنکھوں میں کونے کی ویرانیاں تھیں تو اس نے اپنے آپ سے پوچھا "کیا میں جیسی بارمر رہا ہوں۔"

نہیں، ایک آواز اندر سے اٹل کر باہر آئی، دس بار پندرہ بار یا نہیں بار میں تو کئی بار مرا ہوں۔ ہاں اس نے سوچا وہ ہر عید پر مرتا رہا جب اس کے سارے دوست نئے کپڑے پہن کر ہاتھوں میں "نئے کپڑے" لوٹ لے کر گھروں سے نکلتے تھے تو ان کے قہقہے اس کے دل میں چھید کر جاتے تھے اور موت تو اسے کئی بار کھلونوں کی دکانوں پر بھی آئی تھی جب شوکیسوں میں سبے ہاتھی گینڈے اور بھالو دیکھ کر وہ رک جاتا تھا تو اس کی ماں کے بے چین قدم تیز ہو جاتے تھے اور وہ ٹھیلوں والوں کی ان آوازوں پر بھی تو مرتا رہا جو روزانہ کی گلی میں آکر صد اگاتے تھے اور وہ خیال ہی خیال میں کبھی ٹھنڈے میٹھے گوشتے چوستا، کبھی کرچ کرچ خستہ مروٹا کھاتا اور کبھی نرم ملائم برنی کی ڈلیاں اس کے حلق میں کھل جاتیں..... ہاں اس نے سوچا یہ موت ان موتوں سے زیادہ سفاک تو نہیں۔

اور پھر وہاں صفائی کا وقت ہو گیا، ہسپتال کے سارے خاکروب جھاڑو اور ٹاکیاں لے کر نکل آئے۔ ایک جمعدار نے مور کی دم جیسا جھاڑو ہوا میں لہرایا اور پاس کھڑے ٹاکی بردار سوچے سے بولا "یہ پتھر مارتا ہے اور تہی مائی یہاں سے جاتی ہے دیکھو خون سے سارا فرش گندا کر دیا۔ اگر صاحب راؤ انڈر پر آگئے تو بے عزتی تو ہماری ہی ہوگی تا۔" ٹاکی بردار نے اثبات میں سر ہلایا اور بولا "چلو اس مائی کی جھنپی کرائیں۔"

دونوں چلتے ہوئے آخری سانس لیتے بچے کے قریب آئے اور بوڑھی نانی سے مخاطب ہو کر بولے "بڑی اماں تمہیں کتنی بار سمجھایا ڈاکٹر صاحب میٹنگ میں ہیں تم اسے کسی پرائیوٹ ہسپتال میں کیوں نہیں لے

جاتی اس کی جان کی دشمن کیوں بنی ہو۔

اس نے خالی آنکھوں سے اوپر کھڑے خاکروبوں کو دیکھا اور سوچا کیا موت کے فرشتے ایسے ہوتے ہیں بھدے بند بودار اور گندے۔ نہیں اس کے اندر سے آواز آتی فرشتے تو نور ہی نور ہوتے ہیں ان کے پروں سے بھینی بھینی خوشبوئیں نکلتی ہیں اور ان کے لبادوں سے نرم اور ٹھنڈی روشنیاں پھوکتی ہیں تو پھر وہ کہاں ہیں اس نے تھک کر آنکھیں بند کر لیں اور ساتھ ہی کانوں میں آوازوں کا جھوم ٹھک کر رک گیا اس نے ایک لمبی ہنگامی اور ہسپتال کے کوریڈور میں گونجتی ہوئی چیخ کے ساتھ ساری روشنیاں بجھ گئیں اب اس ہی اس تھا سکون ہی سکون اور باہر پرائیویٹ ایمریٹنس کے ڈرائیو نے اپنے ساتھی سے پوچھا ”بڑھیا کے کھیسے میں کچھ ہے بھی یا نہیں۔“

چھوٹے نے ٹاکی سے ہاتھ صاف کئے اور بولا ”استاد اگر اس کے پاس پیسے ہوتے تو وہ بچہ کسی ڈاکٹر کو نہ دکھالیتی۔ بچہ رہیوں ہسپتال کے فرش پر تو نہ مرنے۔“ استاد نے نفرت سے گردن کو جھٹکا دیا اور گاڑی سٹارٹ کر کے وہاں سے فرار ہو گیا۔

اور وہاں لاش پر جمع کھانا دار غریب اور بے بس لوگوں کا مجمع سب تاسف سے ہاتھ مل رہے تھے سب قاتل ڈرائیوروں کو گالیاں دے رہے تھے۔ سب دے دے لفظوں میں ہسپتال کی انتظامیہ کو کوس رہے تھے لیکن وہاں لاش کو گھر پہنچانے والا کوئی تھا نہ بوڑھی مائی کے بازو میں اتنی طاقت کہ وہ حسین کو اٹھا کر ملتان کی تنگ گلیوں میں راستہ تلاش کر سکتی۔ کھیسوں نے سوچا ہم ہی اس شخص کی لاش کو کفن دیں مگر کفن کے بغیر لاشیں ہر جگہ ہوتی ہیں۔

اور ڈرا دور سنور میں درجنوں نے سڑک پر پڑے تھے لیکن سنور کیپر کو انہیں باہر نکالنے کی اجازت نہیں تھی ایمر جنسی میں نصف درجن بیڈ خالی تھے لیکن آلات کرنے والا کلرک کھانا کھانے گیا تھا۔ فریج میں خون کی بوتلیں اور زندگی بچانے والے سینکڑوں انجکشن تھے لیکن ڈاکٹر صاحب میٹنگ میں تھے۔ اور وہاں کینٹین کے ڈرم کی ٹونٹی سے پانی کی لیکر اڑ کر ڈرا دور گر رہی تھی موت کھلونوں کا طواف کر رہی تھی اور سڑکوں پر ڈرائیوروں کی ریس ابھی تک جاری تھی۔

لیکن کھیسوں کے کفن میں جمی لاش چیخ چیخ کر کہہ رہی تھی جہاں احساس نہیں ہوتا وہاں انسان نہیں گدہ بنتے ہیں اور گدھوں کے شہر میں انسانوں کو مری جاتا ہے۔

مجھے یقین ہے حساب کے فرشتے جب یہ ننھی سی لاش اللہ تعالیٰ کے حضور پیش کریں گے تو خالق کائنات کا دامن تمام کمزور کہیں گے ”یا باری تعالیٰ آپ اجازت دیں تو مردہ ضمیروں کے اس شہر کو قبرستان بنادیں۔“

تو باری تعالیٰ مسکرا کر کہیں گے ”نہیں شہروں کو قبرستان بنانا فرشتوں کا نہیں انسانوں کا کام ہے۔“

(یہ کالم ملتان کے ایک اخبار میں شائع ہونے والی اس تصویر سے متاثر ہو کر لکھا گیا جس میں ایک بوڑھی خاتون ہسپتال کے فرش پر پڑی دس سال بچہ کی لاش کے قریب جمی ہے۔)



خودکشی

میں نے اپنے دوست کی گاڑی میں ایک عورت کو دیکھا اور میری کنپٹیوں میں آگ لگ گئی۔ ایک سال پہلے تک جب یہ عورت اپنے دو بچوں کے ساتھ ہمارے گھر آتی تھی تو اس کی مٹھا طبعی آنکھوں میں محرومی اور آرزو کی کاشوں جیسے ہونٹوں پر مہنگائی کے شکوے ہوتے تھے وہ چائے پیتے ہوئے اکثر میری بیوی سے پوچھتی تھی "بائی آپ نے یہ کپ کتنے میں خریدا ہے؟" اور میری بیوی اکثر اس کی بات سنی ان سنی کر دیتی تھی اس کے بچوں کی آنکھیں مھلوانے اور کپڑے دیکھ کر مدہم پڑ جاتی تھیں وہ جب کبھی اکیلے ہمارے گھر آتے تو مجھے مخاطب کر کے کہتے "انگل جب ہمارے پاس ایک ہزار روپے جمع ہو جائیں گے تو آپ ہمیں سائیکل لادیں گے" تو "امارات" کے ایک گھبرے (حساس) کے ساتھ میرا سید پھول جاتا اور میں لہجے میں ایک معنوی جذبہ ترحم لا کر ان سے پوچھتا "آپ لوگوں کے پاس اب کتنے پیسے ہیں؟" وہ گہرے دکھ سے جواب دیتے "اڑھائی سو روپے۔" اور میں انہیں ایک کھوکھلی سی تسکینی دیتے ہوئے کہتا "چلو کوئی بات نہیں ہزار روپے جمع ہوتے ہوئے دیر ہی کتنی لگتی ہے؟" اور ہر صبح جب میں دفتر کے لیے نکلنے لگتا تو میری بیوی مجھے روک کر کہتی "....." اگر ہم ان بچوں کو سائیکل لے دیں تو کیا حرج ہے؟" تو میں موٹر سائیکل پر ٹانگی مارتے ہوئے کہتا "بے وقوف عورت تم ان بچوں کو بھکاری بنانا چاہتی ہو آج یہ ہم سے سائیکل لیں گے تو کل کوئی خواہش انہیں کسی دوسرے کے سامنے ہاتھ پھیلانے پر مجبور کر دے گی۔" اور "بے وقوف" عورت قائل سی ہو کر گردن ہلا دیتی لیکن یہ نہیں یہ دلیل دیتے وقت میں اپنی بیوی سے آنکھیں کیوں چراتا تھا؟

اور اس عورت کا خاندان..... وقت بہت پہلے جس کی کپٹی پر چمکتا تھا اور دکھ جس کی آنکھوں میں بچھا رہتا تھا کسی پرائیویٹ فرم میں ساڑھے تین ہزار پر ملازم تھا اس کی آدمی تنخواہ مکان کے کرائے پر اٹھ جاتی تھی اور باقی چار افراد کے پیٹ کا ایندھن بن جاتی تھی لہذا کبھی سرنگا اور کبھی پاؤں..... اور جب کبھی میری بیوی نے مجھے اسے کوئی پارٹ ٹائم کام دلانے کا کہا میں "اچھا کچھ کرتے ہیں" کا گمز چلا کر کروٹ بدل کر سو گیا۔ میں اب سوچتا ہوں تو یاد پڑتا ہے میں اگر اس شخص کے لیے کچھ کرتا چاہتا تو با آسانی کر سکتا تھا میرے اپنے دفتر میں بڑی گنجائش تھی۔ میرا ایک دزیر دوست میرے اشارے کا منتظر تھا ایک ملٹی نیشنل کمپنی کا کنٹری منیجر میرا جاننے

والا تھا اور اگر میں چاہتا تو اپنے پاس روزانہ آنے والے لوگوں میں سے بھی کسی کو کہہ سکتا تھا..... لیکن میں نے کچھ نہیں کیا!..... یہ نہیں کیوں نہیں کیا؟.....

میری بیوی نے مجھے ان بچوں کو کسی اچھے سرکاری سکول میں داخل کرانے کے لیے بھی تو کہا تھا لیکن سیکرٹری تعلیم اور ڈائریکٹر سکولز سے روز ملاقات کے باوجود میں نے ذہانت سے لبریز ان بچوں کے لیے پھونے منہ سے سفارش کا ایک لفظ نہیں کہا یہ جانتے ہوئے بھی کہ میرے ایک فخرے سے ان بچوں کا مقدر بدل سکتا ہے روز جب دفتر سے واپسی پر میری بیوی مجھے دروازے پر روک کر پوچھتی "ان بچوں کے لئے کچھ ہوا؟" تو میں بڑے آرام سے کندھے اچکا کر کہتا "سیکرٹری کوئٹہ سے ہی واپس نہیں آیا" اور میری بیوی کی آنکھوں میں شک کی جھلپاں ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر دوڑتے نکلتیں اور میں خود کو سچا ثابت کرنے کے لیے معمولی باتوں پر تلخ ہو جاتا اور وہ "بے وقوف" عورت پرانے بچوں کو بھول کر میری تازہ برداری میں لگ جاتی اور میں نہایت مکاری سے دیواروں کو آنکھیں مارتا رہتا۔

لیکن آج جب میں نے اسے ایک "اوباش" دوست کی گاڑی میں بدن کے تیشے سے زندگی کی نہر کھودتے دیکھا تو تبا جانے کیوں مجھے یقین ہو گیا یہ عورت اب بیالیوں کی قیمت نہیں پوچھے گی اب اسے مہنگائی کا شکوہ نہیں ہوگا۔ اب اس نے کسی کا قرض نہیں دینا ہوگا اب مالک مکان اس کے دروازے پر کھڑے ہو کر "نکلو باہر" کا نعرہ نہیں لگائے گا۔ اب گلی کی کھڑکا کا انداز اس کا رمانہ نہیں روکتا ہوگا اب وہ ترکاری والے سے نہیں اچھے گی اب اس کا خاوند کھی پتی اور چینی ختم ہونے پر اسے نہیں مارے گا اب اسے خاوند کی "پارٹ ٹائم" ملازمت کے لیے کسی کی منت نہیں کرنا پڑے گی اب اسے بچوں کو سرکاری سکول میں داخل کرانے کی ضرورت بھی نہیں ہوگی۔

اس کی خواب گاہ میں اب اسے سی لگ جائے گا اس کی ڈریسنگ ٹیبل پر درجنوں خوشبویات ہوں گی اس کی دارلاروب کپڑوں اور جوتوں سے بھر جائے گی اب اس کے پاس نت نئے زیورات ہوں گے..... اور ہاں اب اس کا خاوند سائیکل پر دفتر نہیں جائے گا اب لوگ اسے "اوتے" کی بجائے ملک صاحب سردار صاحب یا شیخ صاحب پکاریں گے یہ لوگ اب کسی اچھی جگہ گھر لے لیں گے ان کے پورچ میں گاڑی کھڑی ہو جائے گی گھر میں ملازم رکھ لیں گے..... اور یہ امر بھی قیاس کی حدوں سے دور نہیں کہ اب یہ لوگ کسی شاپنگ سنٹر میں کھڑے ہو کر یہ نکال دیں یہ بھی پیک کر دیں میرے لیے کوئی چیز لائے ہیں نہیں یہ سائل تو بہت پرانا ہے یہ رنگ اچھا ہے دے دیں کتنا ملتا ہاں یہ پانچ سو روپے اس سلازین کو دے دیں قسم کی گفتگو کریں گے اور یہ بھی ہو سکتا ہے اب یہ عورت درباروں پر حاضری دے فقیروں میں سو دو روپے تقسیم کر کے درازی عمر اور وسعت رزق کی دعا کرائے مسجد کو یا قاعدگی سے چندہ دے فلاحی اداروں کی خدمت کرے غریبوں اور مسکینوں کی مدد کرے۔

یہ بات اچھی نہیں

”میں نے ایک عجیب و غریب منظر دیکھا لوگوں نے ایک شخص کا منہ کالا کر کے اسے گدھے پر سوار کر رکھا تھا اور شہر کے بچے اس کے پیچھے پیچھے شور مچاتے جا رہے تھے گدھے پر سوار شخص خاصا پریشان تھا میں نے معاملہ پوچھا تو پتہ چلا کہ شخص چند روز قبل ایک لڑکی اغوا کر کے لے گیا تھا آج محلے والوں کے قابو آ گیا تو انہوں نے اسے سزا دینے کے لیے منہ کالا کر کے گدھے پر بٹھا دیا اور اب اسے تھانے لے جا رہے ہیں اگلے ہی روز میں نے پھر یہی منظر دیکھا لیکن اس بار ایک شخص گھوڑے پر سوار تھا اس نے اپنا منہ ریشمی تاروں سے ڈھانپا ہوا تھا اور بہت سے بچے شور مچاتے ہوئے اس کے آگے چل رہے تھے میں نے اندازہ لگایا یہ شخص معاشرے میں قدم سے برتر مقام کا حامل ہو گا تبھی اسے گدھے کی بجائے گھوڑے پر سوار کیا گیا نیز اسے یہ سہولت بھی دی گئی کہ وہ اپنا منہ ریشمی تاروں سے ڈھانپ لے مجھے یہ بات اچھی نہیں لگی کیونکہ ایک جیسے جرم پر دو طرح کی سزائیں دینا تو عدل کے اصولوں کے منافی ہے۔“

یہ عطاء الحق قاسمی کی ایک ”نغمی“ سی تخلیق ”ایک غیر ملکی سیاح کا سفر نامہ لاہور“ کا ایک ”نوٹا“ ہے جس کے بارے میں میرا خیال ہے اگر عطاء الحق قاسمی آج سے دس پندرہ برس پہلے ہی لکھنے لکھانے سے تائب ہو جاتے تو بھی یہ سفر نامہ انہیں اردو ادب میں دو چار صدیوں تک زندہ رکھنے کے لیے کافی تھا آج سے ڈیڑھ دو برس پہلے جب میں نے ان سے اس سفر نامے کی ”وجہ تخلیق“ پوچھی تھی تو قاسمی صاحب نے اپنے سدا کے ترو تازہ لہجے میں جواب دیا ”جن دنوں پاکستان کا ہر ادیب شاعر اور دانشور یورپ کے جھونے سچے سفر نامے لکھ رہا تھا تو میں نے سوچا کہ اگر کوئی غیر ملکی سیاح لاہور آئے چند روز یہاں رہے اور واپسی پر اسے سفر نامہ لکھنے کی شہوت ہو تو وہ ہمارے بارے میں کیا لکھے گا میں یہ سوچنے کی دیر تھی پورا لاہور میری نظروں میں گھوم گیا اور میں نے عطاء الحق قاسمی کی جگہ نام بن کر یہ سفر نامہ لکھ مارا“ بہر حال ایک غیر ملکی سیاح کا سفر نامہ لاہور کی وجہ تخلیق کچھ بھی ہوئے عطاء الحق قاسمی نے قاسمی بن کر لکھا ہو یا نام ڈاک یا ہیری بن کر بیٹے کے پاکستانی معاشرے پر اس سے خوبصورت طنز ہماری غیر فطری روایات پر اس سے بڑی پھٹی اور ہماری اجتماعی بیمار سوچ کا اس سے بڑا آپریشن آج تک ادب میں نہیں ہوا اور نہ ہی کبھی ہوگا۔

آج صبح جب میں نے اخبار پڑھنے شروع کئے تو میں نے بھی "ایک غیر ملکی سیاح کے سفر نامہ لاہور" کے "مصنف" کی طرح ایک عجیب و غریب منظر دیکھا ایک معاصر اخبار کے صفحہ اول پر ایک گدھا گاڑی کی تصویر چھپی تھی گاڑی کا مالک گدھے کی پشت پر ہاتھ رکھے پیدل چل رہا تھا گاڑی کے پیچھے مختلف عمروں کے لوگ کھڑے تھے جبکہ گاڑی پر تین نشیں لدی تھیں مرنے والے چہروں مہروں سے نوجوان دکھائی دیتے تھے ان کی چند لیاں نگلی تھیں ان کے پیروں سے جوتے غائب تھے ان کے کپڑے اپنے ہی لبو سے تر تھے اور ان کی گردنیں ایک طرف کوڑھلکی ہوئی تھیں میں نے گھبرا کر تصویر کے کپشیں پر نظر ڈالی لکھا تھا "موجر انوال پولیس مقابلے میں مارے جانے والے ڈاکوؤں کی نشیں گدھا گاڑی پر مردہ خانے جاری ہیں۔" میں نے تصویر سے متعلقہ خبر کی تلاش میں صفحے پر نظر دوڑائی قریب ہی ایک دو کالمی خبر چیخ رہی تھی خبر کے مطالعے سے پتہ چلا یہ تینوں ڈاکو حملہ باغیانہ طورہ کے ایک گھر میں داخل ہوئے اہل خانہ سے پستول کی ٹوک پر چھ ہزار آٹھ سو روپے لائے فرار ہونے سے قبل انہوں نے خاتون سے بیرونی دروازے کی چابی مانگی تلخ کلامی ہوئی تو خاتون نے ایک ڈاکو کی انگلی چبا ڈالی ڈاکو نے چیخ ماری مسائے جاگ گئے اور انہوں نے پولیس کو اطلاع کر دی پولیس فوراً پانچ گلی پولیس مقابلہ ہوا اور تینوں ڈاکو "پار" ہو گئے بعد ازاں ان ڈاکوؤں کی نشیں گدھا گاڑی پر لاد کر مردہ خانے لے جائی گئیں خبر ختم ہوئی تو میں نے قاسمی صاحب کا نام ڈک اور ہیری بن کر دو بارہ تصویر پر نظر ڈالی تو تصویر چیخ کر کہہ رہی تھی گدھا گاڑی پر پڑی یہ نشیں جن کی پند لیاں نگلی اور پاؤں سے جوتے غائب ہیں جن کے کپڑوں پر خون کے بڑے بڑے دھبے ہیں اور جن کی گردنیں ایک طرف کوڑھلکی ہوئی ہیں کا جرم رات کے تین بجے کسی کے گھر کو نہائیں تھا ان کا قصور پستول کی ٹوک پر دم لوٹا نہیں تھا ان کی غلطی وارننگ پر خود کو پولیس کے حوالے نہ کرنا بھی نہیں تھی ان کا جرم تو فقط اتنا تھا کہ انہوں نے چھ ہزار آٹھ سو کی بجائے چھارہ سو روپے نہیں لائے تھے ان میں سے کوئی بینک ڈیفالٹر نہیں تھا ان لوگوں کا نام "ای سی ایل" پر نہیں تھا انہوں نے کوئی سرے گل نہیں خریدا تھا انہوں نے ایک رات میں پچیس تیس کروڑ ڈالر ملک سے باہر منتقل نہیں کئے تھے یہ کسی سیاسی جماعت کے ٹکٹ ہولڈر نہیں تھے ان کا کوئی چاچا ماما کن اسبلی نہیں تھا ان کا کوئی تعلق کسی جاگیر دار سیاستدان اور بیوروکریٹ گھرانے سے نہیں تھا انہوں نے کوئی کوآپریٹو سوسائٹی نہیں بنائی تھی کوئی حمید اعظمی نہ وہی ان کا دوست نہیں تھا ان کا گھر کسی مہران بینک کے راستے میں نہیں پڑتا تھا ان کی جھیر و سے کبھی ہیروئن برآمد نہیں ہوئی تھی تصویر کہہ رہی تھی ان کا جرم واقعی عکسین تھا خدا کی پناہ ڈاکوؤں کی مملکت میں صرف چھ ہزار آٹھ سو کا ڈاکہ اور وہ بھی "نسبت" کے بغیر ان کی نشیں تو واقعی گدھا گاڑی پر ہونی چاہیے تھیں۔

میرا خیال ہے اگر عطاء الحق قاسمی کا مسٹر نام گدھا گاڑی پر لدی یہ نشیں بھی دیکھ لے اور پھر اس کے قریب سے ہو کر بجائی ہوئی گاڑیوں کا ایک قافلہ گزرے جس کے آگے اور پیچھے پولیس کے مستعد کمانڈوز کی درجنوں جیسٹیں ہوں اور ہر چوک ہر موڑ پر ایک سمارٹ مارجنٹ انکس سفید دستانوں کا سمارٹ سیلورٹ پیش

کرتا ہو تو وہ بڑے دکھ سے کہے یہ بات اچھی نہیں ایک ہی جرم پر دو طرح کی سزائیں ایک کو پولیس نعش بنا کر
گدھا گاڑی پر ڈال لے جارتی ہے اور دوسرے کو بلٹ پروف سرسینڈیز میں ہوٹر بجاتے ہوئے سلیوٹ پیش
کرتے ہوئے یہ تو بڑی زیادتی ہے یہ تو کوئی انصاف نہیں۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

مرنے کا حق

الطاف گوہر پاکستان میں وہی حیثیت رکھتے ہیں جو امریکہ میں ہنری کسنجر کو حاصل تھی، جو ان تھے تو مولوی فضل حق، حسین شہید سہروردی، سکندر مرزا، ملک فیروز خان، نون اور ایوب خان کے بیکر بنی رہے۔ پاکستان کے بیوروکریٹک سسٹم کے بنیادی ستون رہے۔ پاکستان کا پہلا کرنسی نوٹ چھپوایا، پاکستان کی ایکسپورٹ اینڈ امپورٹ پالیسیاں بنائیں، تیس چالیس رائلٹوں کے لائسنس جاری نہ کر کے بھنوک دشنی مول لی۔ جنگ جبر میں ایوب خان کی مشہور تقریر لکھی، ایوب خان کی بائو گرافی ”فریڈز ناٹ ماسٹرز“ لکھی، بجٹی خان کے قاتل کا شکار ہوئے ۲۰۳ سرکاری انٹرویو کے ساتھ نوکری سے فارغ کر دیئے گئے، قید جہاں میں رکھے گئے، تقسیم القرآن کا انگریزی میں تراجم کیا۔ ”اڈمن“ کے ایڈیٹر بنے، لندن کے مشہور اخبار ”الٹوین“ کے ایڈیٹر مل بورڈ کے ممبر رہے، بین الاقوامی جریدے ”سائٹھ“ کے ایڈیٹر رہے اور جب ”مسلم اخبار چڑھے دریا کی طرح کناروں سے باہر اٹل رہا تھا تو اس کے ایڈیٹر بنے۔ بوڑھے ہوئے تو ان ساری بیکار سرگرمیوں سے فارغ ہو گئے طبیعت مضمون نویسی کی طرف مبذول ہو گئی پھر وہ ”کیا خوب مضامین لکھے“ کوثر و نسیم سے دہلی زبان احساسات سے سبکے خیالات اور دلوں میں اتر جانے والے الفاظ۔ واؤ واہ کیا کہنے

جب الطاف گوہر ”سائٹھ“ کے ایڈیٹر تھے تو انہوں نے تھراڈ ورلڈ کے اہم رہنماؤں کے انٹرویو شروع کئے۔ افریقی رہنما ان کا بنیادی ”ہدف“ تھے۔ انہی دنوں کا واقعہ ہے ان کی ملاقات کالوں کے حریت پسند لیڈر ریورنڈ الین بوساک (Reverend alan boesak) سے ہوئی اس دور میں افریقی بوساک کی اسی طرح پوجا کیا کرتے تھے جس طرح ہندو مائتا گاندھی کی۔ متحمل مزاج الطاف گوہر نے بوساک سے پوچھا: ”سیاہ فام قوم انسانی حقوق حاصل کر لے گی؟“ بوساک نے سکار کاش لے کر پورے اطمینان سے جواب دیا: ”مسٹر گوہر! سو فیصد“ ”لیکن کب تک؟“ یہ الطاف گوہر کا دوسرا سوال تھا۔ ”بہت ہی جلد“ بوساک نے اسی اطمینان سے جواب دیا۔ ”کیا آپ کے پاس اس پیشین گوئی کی کوئی مضبوط دلیل ہے؟“ الین بوساک نے سکار کا گل جھانک کر کہا ”ہاں ہے۔“ گوہر صاحب اسے استفہامیہ نظروں سے دیکھ کر رہ گئے بوساک نے آنکھیں بند کیں اور جیسے ہوئے ٹھوس لہجے میں بولا ”موت“ میرے عزیز موت! اس پیشین گوئی کی مضبوط ترین وجہ ہے۔ ہم لوگ

ہمارے ماں باپ ہمارے بیوی بچے یہ جان چکے ہیں کہ ہمیں صرف ایک ہی حق حاصل ہے اور وہ ہے مر جانے کا حق۔ لہذا ہم نے یہ حق طے کر لیا ہے ہم اب یہ حق کسی دوسرے کو استعمال نہیں کرنے دیں گے۔ ہم خود استعمال کریں گے جب چاہیں گے جس طرح چاہیں گے۔“

آر اسے بازارِ راولپنڈی کا محمد ابراہیم بھی بڑا بے وقوف تھا اگر اس میں رتی بھر عقل ہوتی تو وہ جعل سازی، فراڈ اور دُکیتوں کی بجائے یوں پھیری لگا کر خیاری کا سامان بیچتا۔ دوزخ دو پہریں اور برف صحس یوں در بدر جھکتے گزرتا۔ اس میں رتی بھر عقل ہوتی تو وہ کسی بینک سے دو چار کروڑ لون لینے کے بجائے یوں دودھ والے کریانہ مرچنٹ اور سود پر رقم دینے والوں سے پچتا بھرتا اپنے کپڑے کٹوا کر بیٹے کے لیے شلوار قمیص سلواتا، روز بیوی کو مارتا، برتن توڑتا، خود کو گالیاں دے کر سختی بھانے کی سلی کرتا، یوں خواہشوں کے ہنر دل سے اپنا جسم داغتا۔

محمد ابراہیم بے وقوف تھا۔ چار بچوں کو جنازے کی طرح اٹھائے اٹھائے پھرتا رہا۔ اس میں رتی بھر عقل ہوتی تو صائغہ افشاں، فوزیہ اور ندیم کی خواہشوں کے لیے ڈاکے ڈالتا، لوگوں کو باہر بھگانے کا جھانسہ دے کر نوٹ، ہونٹ، سرکاری پٹرول، پچتا، فائلوں کی کٹائی کھاتا، سرکاری املاک پر قبضہ کرتا، سڑکیں، کھاپی، جاتا، تاریں اتار کر کچھ ڈالتا، سبکل شدہ گاڑیوں کے جعلی کاغذات تیار کرتا، کسی رکن اسمبلی کا دست و بازو بن جاتا اور کسی وزیر کا کاروباری ساتھی ہو جاتا۔

محمد ابراہیم بیوقوف تھا، کریپشن، لوٹ کھسوٹ اور ہیرا پھیری کی اس زمین پر بھی افلاس اس کی رگوں کا لمبو چوتی رہی، غربت اس کا حوصلہ چاٹتی رہی، فاقے اس کی برداشت کی بنیادیں ہلاتے رہے، محرومی اس کی آنکھوں کی چمک اور بیماری اس کے لہجے کی شوخی چراتی رہی وہ اندر سے خیر اور باہر سے ویران ہوتا رہا، اس کے خون کا ابال اپنی ہی رگوں سے ابلھتا رہا، اس کا غصہ بیوی کے چہرے کے زخموں اور بچیوں کے بدن کے نیل میں ڈھلتا رہا۔

محمد ابراہیم واقعی بیوقوف تھا۔ تین روز کے فاقے بھی اس میں جرأت نہ پیدا کر سکے۔ برسوں کی بے روزگاری بھی اسے انتقام پر نہ ابھار سکی، بیوی کی آنکھوں کی وحشت اور بچیوں کے معصوم چہروں کی ویرانی بھی اسے وقت سے لڑنے کا حوصلہ نہ دے سکی۔ وہ واقعی بیوقوف تھا، چوہے کی بھی راکھ بچوں کے خشک ہونٹ اور بیوی کی بھوک نظریں دیکھ کر بھر گیا، اپنے کل اٹائے چار لٹاف، تین چار پانیوں، دو دروہوں، ایک کرسی اور نوٹے چمک کو آگ لگا دی۔ مٹی کے نوٹے بڑتوں کی نوکری سے کند چھری نکالی اور ۱۲ سالہ صائغہ کو دکھا کر بولا، ”میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں۔“ بھوک سے منہ حال بچی میں تو اٹنے کا بھی حوصلہ نہیں تھا، چنانچہ بزدل باپ نے جب چھری چلائی تو پانی سے بھری استویوں کو باہر آتے دیر ہی کتنی لگی۔ افلاس کے مارے دل کو آخری جھٹکا کھاتے لمحے ہی کتنے لگے اور روٹی کی منتظر آنکھوں کو بجھتے وقت ہی کتنا لگا۔ بزدل باپ خون سے بیٹھی چھری

لے کر پلٹا اور ننھی افشاں اٹھ کر بھاگی، لیکن نقاہت کی مادی ٹانگیں کہاں تک جا سکتی تھیں۔ تین ٹانگوں والی میز سے ٹکرا کر گر گئی۔ باپ اس پر چڑھ کر بیٹھ گیا تو آٹھ سال کی بچی نے گڑغڑا کر کہا "ابا! میں جینا چاہتی ہوں" خدا کے لیے مجھے نہ مارو مجھے بڑا درد ہوگا۔" لیکن بزدل باپ نے چیخ کر کہا "روز روز مرنے سے ایک بار کا مرنا ہی ٹھیک ہے۔" اور ننھی افشاں کی انٹریاں بھی اچھل کر باہر آ گئیں۔ سکتے کی فکار ماں اور خوف سے کانپتے بیٹے نے جب باپ کو اپنی طرف پلٹتے دیکھا تو چیختے چیختے گلی میں آ گئے، محمد ابراہیم ان کے پیچھے بھاگا لیکن صائبر اور افشاں کی چیخوں سے کمال آباد کے لوگ گھروں سے باہر آ چکے تھے، لہذا مجبوراً ابراہیم نے چھری پھینکی اور مرنے کے لیے بھاگ کھڑا ہوا۔

ہاں محمد ابراہیم واقعی بیوقوف انسان تھا۔ اسے یہ تک معلوم نہیں تھا جب موت مقدر ہی بن گئی تو پھر کیوں نہ اسے ہتھیار بنا کر جیا جائے، صائبر اور افشاں کو مارنے کے بجائے ان لوگوں کے بچے مارے جائیں جو صائبر اور افشاں کی موت کے اصل ذمہ دار ہیں، جن کی وجہ سے اس ملک کی لاکھوں صائبر اور افشاں مبینوں فاقے کا قحط ہیں، اپنی ننھی ننھی خواہشیں پلوؤں میں باندھے پھرتی ہیں، جن کی آنکھوں میں ستارے نہیں رونمیاں چمکتی ہیں اور جن کے ہونٹوں سے ترانے نہیں جھرتی ہیں۔

ہاں محمد ابراہیم واقعی بے وقوف تھا۔ موت کو ہتھیار نہ بنا سکا، اس نے سیاستدانوں کا انتقام اپنے ہی اہل خانہ سے لیا، بے وقوف نہ ہو پاگل نہ ہو۔

لیکن شاید یہ ابراہیم اس وقت تک ایسی حاکمیتیں کرتے رہیں، ایسی ہی بیوقوفیوں کے مرکب ہوتے رہیں، جب تک انہیں کوئی ایسا ریویوڈ ایلن بوساک نہیں مل جاتا جو انہیں جمع کر کے بتا سکے "میرے بھائیو اور میری بہنوا! ہم لوگ ہمارے ماں باپ ہمارے بیوی بچے یہ جان چکے ہیں ہمیں صرف ایک ہی حق حاصل ہے اور وہ ہے مرجانے کا حق اور اب ہم نے طے کرنا ہے کہ آج سے یہ حق ہم خود استعمال کریں گے، جب چاہیں گے، جس طرح چاہیں گے اور میرا یہ اعلان ہے، ہم میں سے کوئی شخص اس وقت تک نہیں مر سکتا جب تک وہ دس پندرہ خالوں کو کیغز کر دے تک نہیں پہنچا دیتا۔"



معافی..... یا رسول اللہ ﷺ..... معافی

موت سے چند لمحے پہلے

ہاں موت سے چند لمحے پہلے انہوں نے یقیناً سوچا ہوگا اگر وہ اس راستے کا انتخاب نہ کرتے تو آج قاہرہ میں ان کا بھی شاندار بزنس ہوتا 'کاک نیل پارٹیاں ہوتیں' 'فرانس کی خوشبوئیں اور جاپانی سوٹ ہوتے پہلو میں مصر کا چادو ساری ساری مات چمکتا رہتا اور ہر صبح خمار کا پیغام لے کر طلوع ہوتی اور ان میں ایک ایسا بھی تو تھا جو جب یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا میں بولتا تھا تو لفظ کانوں میں نہیں دلوں میں اترتے تھے اور سامعین کے ہاتھوں میں کافی کے کپ حدت بھول جاتے تھے اور رات کو جب وہ گرلز ہاسٹل کے قریب سے گزرتا تھا تو کتنی ہی سرگوشیاں اس کے لمبا کے سے اٹھتی تھیں لیکن وہ ان پر توجہ دینے بغیر گزر جاتا تھا کہ حسن، جنس اور آرام وہ زندگی اس کا سطح نظر نہیں تھا۔ اور ہاں ان میں سے ایک نے سوچا اس بار بھی جب برف پگھلے گی تاہم گچھروں پر سوار ہو کر پہاڑوں کی طرف چل پڑیں گے اور پھر اس کا شہر آوازوں سے پہاڑی گیتوں سے اور براق جھرنوں جیسی عورتوں سے خالی ہو جائے گا ایسی عورتیں جن کے سرخ گال اور سیلے ہونٹوں کے نظاروں کے لئے سیاحوں کے ہنسنے لگ جایا کرتے تھے۔ اور ان میں جو سب سے چھوٹا تھا اس کی آنکھوں میں ماں کا چہرہ لہرایا جس نے چلتے وقت اس کا دامن پکڑ کر کہا تھا جیسا جب تم شہید کی وردی پہن کر خدا کی بارگاہ میں جاؤ تو اپنے آجاء اجداد کی بخشش کی دعا کرنا کہ وہ تراق تھے اور جہالت نے ان کے ہاتھوں سے بڑے ظلم کرائے تھے۔ اور ان میں جو نہایت زیادہ بزرگ تھا اس نے راتھل میں میٹرزین چڑھاتے ہوئے یقیناً سوچا ہوگا افسوس آج ہمیں انہی لوگوں پر گولی چلانا پڑی جن کی حفاظت کے لیے ہم گھروں سے نکلے تھے۔

اور پھر جب ان کی آنکھیں روشنی سے خالی ہو گئیں 'دھڑکنیں مردہ وجود میں جذب ہو گئیں' اعضاء سے حرکت اڑ گئی اور نہیں قطرہ خون سے خالی ہو گئیں تو ان کی نعشیں لوٹی دیواروں گرتی چھتوں اور کئے پھنے دروازوں سے کھچ کر باہر لائی گئیں انہیں تنگی زمین اور کھلے آسمان کے نیچے بیچ دیا گیا اور ڈراڈور ایک مکان کے سائے میں سستاتے سپائی نے راتھل کا میٹرزین اتار کر گولیاں گھنیں اور اپنے قریب لینے سپاہی کو مخاطب کر کے بولا "کیا تم نے زندگی میں ایسے لوگ دیکھے ہیں جو مسلسل چور و زنیہ بغیر سوئے لڑتے رہے ہوں؟" دوسرے

سپاہی نے ہاتھ سے آنکھیں صاف کیں اور بولا "کیا تم نے پہلے کبھی ایسا منظر دیکھا کہ ایک شخص گلہ شہادت کا لہرہ لگاتے ہوئے اور اپنا سینہ گولیوں کے استقبال کے لئے پیش کر دے۔" پہلے سپاہی نے بھی آنکھیں صاف کیں اور بولا "بس یار ہم تو حکم کے غلام ہیں۔" اور زرا دور پولیس کا ایک اعلیٰ افسر نعشوں پر کھڑا ڈائریس پر مرنے والوں کا حلیہ بیان کر رہا تھا اور کچھ دور اسلامی دنیا کے سب سے بڑے ملک کے دارالحکومت میں بیٹھے چند لوگ پوری دنیا کو "آپریشن از اور" آپریشن از اور" کے پیغامات دے رہے تھے۔

اگلے روز جب قاہرہ کے ایک اخبار نے ان سرے ہوئے "دہشت گردوں" کی تصویر شائع کی تو ایک نوجوان نے اخبار ہوا میں اچھال کر پہلو میں سوئے بت کا بوسا لیا اور بولا "تھینک گاڈ میں اس کی باتوں میں نہیں آیا نہیں تو آج میں بھی..... چلو چھوڑو ابھی بہت صبح ہے۔"..... دور یونیورسٹی کے کیفے میرا میں ایک نوجوان کو کافی کا گرم کپ نگ کر رہا تھا لیکن وہ اس پر توجہ دینے بغیر مسلسل سوچ رہا تھا شاید وہ واقعی لطف میں رہا ہو مگر تو میں نے بھی جانا ہے ایکسٹنٹ میں کسی ان دیکھے مہلک مرض سے یا ہڑحاپے میں بچوں کی تو جی سے لیکن وہ ہاں شاید ہمیشہ کے لیے زندہ ہو گیا ہو۔" ادھر جب تا جک قبائل ٹخروں پر مٹکیں کسنے لگے تو ایک چھوٹا سا بچہ بھاگتا ہوا آیا اور سردار کا دامن تھام کر بولا: "میرا بھائی اللہ کی راہ میں شہید ہو گیا بابا کیا میں بھی شہادت کا درجہ پاؤں گا؟" تو مستقبل میں جھانکنے کی صلاحیت سے لہر بڑھار نے جبک کر بچے کے گال پر بوسا دیا اور بولا "یہ سعادت ہر کسی کو نصیب نہیں ہوتی۔" اور جب ماں نے اپنے سرے ہوئے بچے کی تصویر دیکھی تو آنکھوں سے لگا کر بولی: "میرا بچہ بھی شہید ہوا اب میں بھی فاطمہ ہوں۔" اور جوان میں نہایت بڑا تھا اس کے باپ نے ہاتھ اٹھائے سورۃ فاتحہ کی تلاوت کی اور پھر تسلی کے لیے آنے والوں کو مخاطب کر کے بولا: "سب نے چلے جانا ہے لیکن مبارک باد کا مقام ہے کہ میرا بچہ بارگاہ رسالت میں میرا استقبال کرے گا۔"

اور آج دنیا کبہ رہی ہے وہ جنونی تھے پاگل تھے فاتر افضل تھے کہ انھوں نے زندگی کے مقابلے میں موت کو ترجیح دی جب پولیس انہیں جان بخشی کی پیشکش کر رہی تھی انہیں گرفتاری دینے کے لیے قائل کر رہی تھی تو ہاتھ اٹھا کر باہر آ جاتے اور تھوڑا سا جبک کر زندگی کی بخشش لے لیتے۔ لیکن یہ سب سو دریاں کی اس دنیا سے تعلق رکھتے ہیں جہاں "گیو اینڈ فیک" سب سے بڑا اصول ہے جہاں صرف دینا بے وقوفی حماقت اور پاگل پن ہے اور یہ بھی تو کسی دانا نے ہی کہا تھا کہ پاگل پن میں بھی ایک مسرت ہوتی جس سے صرف ایک پاگل ہی لطف اٹھا سکتا ہے۔ اور یہی توجہ ہے ورنہ دوسرا راستہ تو حضرت حسین کے لیے بھی کھلا تھا اور اس سے پہلے حضرت موسیٰ بھی فرعون کی بات مان کر پوری قوم کو نسلِ مکاری کے عذاب سے بچا سکتے تھے اور ہاں سقراط بھی تو اپنی جان بچا سکتا تھا لیکن کیا ان لوگوں نے ان جیسے سینکڑوں ہزاروں لوگوں نے نقصانات کا سودا کیا؟ ہو سکتا ہے کیلغور نیا کے کسی آرام وہ فلیٹ میں بیٹھے کسی شخص یا لندن کے کسی کلب میں ناچتے والے "بھجڈاز" انسان کا جواب ہاں میں ہو لیکن وہ لوگ نہ صرف دنیا کو عارضی ٹھکانہ سمجھتے ہیں بلکہ مرنے کے بعد حبیب خدا کی

بارگاہ میں حاضری کو بھی اہل حقیقت جانتے ہیں وہ چند سانسوں کے بدلے لاکھوں کروڑوں سال کی شرمندگی کا سودا کیسے کر سکتے ہیں؟

اور یہ بھی تو ایک فلسفہ ہے کہ اگر نیپو سلطان گیدڑ کی سو سالہ زندگی قبول کر لیتا تو کیا اس کی سانسیں بڑھ جاتیں زندگی اس پر سارے دروازے کھول دیتی؟ نہیں ہرگز نہیں کہ خدا نے ہر شخص کی سانسیں معین کر رکھی ہیں یا پھر لوگ حادثہ یا بیماری کی موت کے بجائے عشق رسول ﷺ جہاد فی الدین اور مرگ پر رضا الہی کی دائمی زندگی کا انتخاب کیوں نہ کرتے؟ لیکن انہوں نے وہ لوگ جو گھروں سے کافروں کو مارنے یا ان کے ہاتھوں مرنے کا خواب لے کر نکلے وہ اپنوں ہی کی گولیوں کا شکار ہو گئے اور اس میں قصور وار کون ہے؟ آئیے اس کا جواب تاریخ پر چھوڑ دیں لیکن اس سر زمین پر بسنے والے ہر مسلمان سے میری اپیل ہے وہ بارگاہ الہی میں گزرا کر اس گناہ کی معافی ضرور مانگے کہ جب ایک خاندان اپنے مقتول کے جواب میں ہوا بگلتا ہے تو خدا اپنے شہید کا قتل کیسے معاف کر دے گا؟

معافی یا رسول اللہ ﷺ معافی..... مجاہد بدر دشمن کے صدمے..... شہداء کربلا کے صدمے۔

Kashif Azad @ OneUrdu.com

نیک نیتی

ان دنوں نواب آف کالا باغ امیر محمد خان پورے مغربی پاکستان کے گورنر تھے۔ بعض سرکاری معاملات پر بات چیت کے لیے بھارت جانا ہوا، دہلی میں جب بھارت کی صف اول کی قیادت سے ملاقات ہوئی تو نہرو سمیت تمام بڑے رہنماؤں نے جان بوجھ کر بھارت کی زرعی اور صنعتی ترقی کا تذکرہ چھیڑ دیا، جسے سن کر نواب صاحب کو کمتری کا احساس سا ہوا۔ چنانچہ دورے کے اختتام پر انہوں نے میزبانوں سے مشرقی پنجاب کے ذاتی دورے کی اجازت مانگی، جس پر ظاہر ہے بھارتی حکومت کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ یوں نواب آف کالا باغ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ گاڑیوں پر مشرقی پنجاب کی ہریالی میں اتر گئے اور یہ دیکھ کر واقعی حیران رہ گئے کہ جو زمینیں قیام پاکستان سے قبل صرف جھلائیوں، کانٹے اور میم پیدا کرتی تھیں، اب ان پر صحت مند، قد آور اور ہری بھری فصلیں کھڑی ہیں۔ وہ ہریانہ کے قریب جب حیرت کے ایک گہرے احساس کے ساتھ ایک ایسے ہرے بھرے نیلے پرکڑے ہو گئے جو چند برس تک ”مہ“ کہلاتا تھا اور گزرنے والوں کو اس کی دہرائی، خشکی اور بخر پن سے وحشت ہوتی تھی، تو میزبان نے انہیں ٹوک کر کہا: ”نواب صاحب آپ نے ہمارا کمال دیکھا، ہم نے زمین کے ایک ایک انچ کو پیداواری بنا دیا۔“ نواب صاحب نے ایک گہرا سانس لیا اور پھر اس برہمن سیکرٹری سے پوچھا: ”لیکن آپ نے یہ سب کچھ کیا کیسے؟“ سیکرٹری نے تقاضے سے سینہ ہچکایا اور پاکستانی وفد پر نفرت کی ایک نگاہ ڈال کر بولا: ”یہ سارا چنگار ہمارے انجینئرز کا ہے۔“ نواب صاحب نے اپنے مخصوص انداز سے مونچھیں دونوں صفیوں میں جکڑیں اور انہیں مل دے کر بولے: ”پر کیسے؟“ برہمن سیکرٹری مسکرایا اور پھر آہستہ سے بولا: ”ہم نے دیکھا، ہمارے پاس سانڈہ کروڑ بھو کے پیٹ اور تھوڑی سی قابل کاشت زمین ہے، ہم نے دیکھا، ہم نے اس زمین سے ان سارے بھوکوں کے پیٹ پالنے ہیں، ہم نے سوچا، ہم یہ کیسے کر سکتے ہیں تو ہم نے فیصلہ کیا، ہم اپنی قابل کاشت زمین کے ایک ایک انچ سے فائدہ اٹھائیں گے اور پھر دنیا نے دیکھا، ہم نے ریت، نیلے اور گھائوں میں گیہوں اگائے، چنے، مکئی اور کدو کی فصلیں کاشت کیں۔“ نواب صاحب نے مونچھوں کو ایک بار پھر مل دے کر دوبارہ پوچھا: ”پر کیسے؟“ برہمن سیکرٹری پھر مسکرایا اور بولا: ”نواب صاحب، ہمارے انجینئروں نے ایسی مشینیں ایجاد کیں جنہوں نے پہاڑوں تک میں

مجھے زرخیزی کھو کر باہر نکال لی۔"

اس ساری بحث کے بعد پاکستانی وفد کے دل میں وہ زردی آلات دیکھنے کی شدید خواہش پیدا ہوئی جن کی مدد سے بھوکا ننگا بھارت خوشحال ہو گیا۔ مہمانوں کے اصرار پر میزبان وفد کو زردی آلات کے ایک کارخانے میں لے گئے۔ پاکستانی وفد نے اپنے سامنے زمین ہموار کرنے، کھادیاں بنانے، سہاگہ پھیرنے، بیج ڈالنے، کھاد بکھیرنے، گودی کرنے، ادویات کے چمڑکاؤ کرنے، پکی فصلیں کاٹنے اور بھوسا اور دانے الگ کرنے کی میکنزوں، مشینیں دیکھیں تو ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ اسی حیرت، شرمندگی اور بے بسی کے احساس کے ساتھ نواب صاحب نے فیکٹری کی انتظامیہ سے ان آلات کے بروشر طلب کئے، کچھ تصاویر اور نقشے حاصل کئے اور برہمن سیکرٹری کا شکریہ ادا کر کے واپس دہلی آئے جہاں سے اگلے روز یہ لوگ لاہور پہنچ گئے۔

جتانے والے بتاتے ہیں ان دنوں جو بھی نواب آف کالا باغ سے ملے جاتا، انہیں نقشے سامنے رکھے کسی نہ کسی انجینئر سے محو گفتگو پاتا، ان آلات کے لیے کتنی بڑی فیکٹری چاہیے، کتنی افرادی قوت درکار ہے، ماہرین کی کتنی نہیں ہونی چاہئیں اس پر لاگت کتنی آئے گی اور عام کسانوں کو یہ آلات کتنے میں ملیں گے وغیرہ وغیرہ۔ نواب صاحب کا مرغوب موضوع ہوتا۔ یہ سلسلہ ایک ماہ تک جاری رہا، جس میں طویل اور مختصر دینے والی ملاقاتوں، بحثوں اور بحثوں کے بعد نواب صاحب اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ منصوبہ تقریباً ناممکن ہے کیونکہ آلات اور مشینری کے لیے جس قدر ماہرین، وسیع فیکٹری اور فیکٹریاں چاہئیں، وہ ملک میں دستیاب نہیں۔ دوسرا اگر موجودہ علاقے سے کام چلایا جائے تو تیاری کے بعد آلات اتنے مہنگے پڑیں گے کہ کسی بھی زمیندار، کسان یا کاشتکار کے لیے خریداری ممکن نہیں ہوگی اور بالفرض اگر کوئی کاشتکار ہمت کر بھی لے تو آلات کے استعمال کے بعد فصل کی قیمت میں اتنا اضافہ ہو جائے گا کہ منڈی سے عام خریدار خالی ہاتھ واپس آنے کو ترجیح دے گا۔ بہر حال قصہ مزید مختصر نواب صاحب بری طرح مایوس ہو گئے، لہذا انہوں نے پاکستان کے کاشتکاروں کو بیلوں اور روایتی ہلوں کے رحم و کرم پر چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔

انہی دنوں گورنر ہاؤس کا ایک کارندہ ایک چھوٹے سے صنعتکار کو لے کر گورنر کے آفس آیا اور اس کا یہ کہہ کر تعارف کرایا: "یہ کشمیری ہیں، لوہے کے ایک چھوٹے سے کارخانے کے مالک ہیں، نہایت ہی پرہیزگار شخص ہیں اور ان کا دعویٰ ہے کہ یہ آپ کی مشکل حل کر سکتے ہیں۔" نواب آف کالا باغ نے کچھل عمر کو دستک دیتے اس سرخ سپید رنگت کے کمزور سے شخص کو دیکھا تو انہیں کوئی خاص انپرائیشن نہ ہوئی، لہذا انہوں نے عادتاً سوچیں مٹیوں میں جکڑیں اور انہیں بل دے کر بولے: "میاں صاحب یہ ناممکن کام ہے پاکستان کے تمام بڑے انجینئر معذرت کر چکے ہیں۔ یہ آپ کے بس کی بات نہیں، اپنا پیسہ اور وقت برباد کریں اور تم میرا۔" میاں صاحب نے سنا تو بڑی شائستگی سے بولے: "نواب صاحب آپ کا فرمانا بجا، لیکن کوشش میں تو کوئی حرج

نہیں۔" نواب صاحب نے مونچھیں چھوڑ کر بلند باجگ قبچہ لگایا اور بھر بولے: "اگر آپ کی نظر میں کوشش اور محنت میں کوئی فرق نہیں تو مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔" ساتھ ہی وہ اپنے سیکرٹری کی طرف مزے اور مہمان کی طرف اشارہ کر کے بولے: "آپ انہیں آلات کے نقشے تھامو اور بروشر دے دیں۔"

واقفان حال کا کہنا ہے چند ماہ بعد جب کشمیری صنعت کار کو متعارف کرانے والے سرکاری اہلکار نے نواب صاحب کو زرعی آلات تیار ہونے کا مژدہ سنایا تو انہوں نے حیرت سے کہا: "یہ کیسے ہو سکتا ہے؟" اہلکار نے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا: "لیکن خصوصاً یہ ہو چکا ہے۔" گورنر نے معمول کی ساری مصروفیات منسوخ کر کے آلات دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ بتانے والے بتاتے ہیں جب نواب آف کالا باغ پورے ریاستی کروفر کے ساتھ لاہور کے مضافات میں قائم اس فونڈری میں داخل ہوئے تو معمولی مشینری چند مزدور اور ادھوری عمارت دیکھ کر ان کے چہرے پر طنز یہ مسکراہٹ آگئی اور انہوں نے فونڈری کے مالک کی طرف مڑ کر پوچھا: "میاں صاحب آپ کا دعویٰ ہے کہ آپ نے اس کارخانے میں دنیا کے جدید ترین آلات تیار کئے ہیں؟" مالک نے مجاز سے گردن ہچکا کر کہا: "جی حضور! اچھا نواب صاحب نے ایک طویل قبچہ لگایا بتانے والے بتاتے ہیں لیکن جب صحن میں پڑے آلات پر گورنر کی نظر پڑی تو حیرت سے ان کے قدم زمین پر گر گئے اور ان کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ انہوں نے مالک کی طرف دیکھا اور شرمندگی حیرت اور خوشی کے ملے جلے احساس کے ساتھ بولے: "کیا یہ سب کچھ آپ نے بنایا ہے؟" کشمیری مالک نے اٹلی اوپر آسمان کی طرف اٹھائی اور مجاز سے بولا: "میں نے کچھ نہیں کیا، صرف اس کی توفیق نے کیا۔" بتانے والے بتاتے ہیں جب گورنر نے اس انجینئر سے ملنے کی خواہش ظاہر کی جس کی نگرانی میں یہ آلات تیار ہوئے تھے تو کشمیری مالک نے اپنے کارخانے کے چالیس پچاس مزدور سامنے کھڑے کر دیے اور عرض کیا: "اس سارے منصوبے کے ماہرین انجینئر اور تکنیک کار یہی لوگ ہیں۔" گورنر مزید مرعوب ہو گیا، رخصتی سے ذرا دیر پہلے نواب صاحب کشمیری مالک کو ایک طرف لے گئے اور اس سے سرگوشی میں کہا: "میں حیران ہوں آپ تو زیادہ پڑھے لکھے ہیں نہ ہی بڑے کارخانے کے مالک ہیں انجینئر آپ کے پاس نہیں ہیں چہرہ بھی نہیں ہے پھر آپ نے وہ آلات آدھی سے کم لاگت میں کیسے بنائے جنہیں اس ملک کے بڑے بڑے انجینئر ہاتھ لگانے کے لیے تیار نہیں تھے۔" میاں صاحب نے دوبارہ مجاز سے سر جھکا دیا اور آہستہ سے بولے: "نیک نیتی سے بڑی کوئی طاقت نہیں ہوتی۔" یہ میاں صاحب میاں نواز شریف وزیر اعظم پاکستان اور میاں شہباز شریف وزیر اعلیٰ پنجاب کے والد میاں محمد شریف ہیں۔

جب ہم لوگ آپس میں گفتگو کرتے ہیں کہ وہ کون سی طاقت ہے جس سے ایک چھوٹی سی فونڈری کے مالک کو پاکستان کا بڑا صنعتکار بنا دیا۔ وہ کون سی طاقت ہے جس نے گمنامی کے پردوں میں چھپے اس خاندان کو عالمی میڈیا کا مرغوب ترین موضوع بنا دیا۔ وہ کون سی طاقت ہے جس نے عام فنی سطح اور واجبی تعلیم کے مالک اس کشمیری خاندان کو پاکستان کا کامیاب ترین سیاسی گھرانہ بنا دیا تو یقیناً جاننے والے طویل بحث

وہاٹے کے باوجود ہم کسی نتیجے پر نہیں پہنچ پاتے۔

آخر میں میں بے اختیار کہتا ہوں "ہو سکتا ہے وہ طاقت نیک نیتی ہی ہو۔" سب سنتے ہیں آہستہ آہستہ گردن ہلاتے ہیں اور ایک دوسرے کو خدا حافظ کہہ کر اپنے گھروں کو لوٹ جاتے ہیں۔



کاشف آزاد

Kashif Azad @ OneUrdu.com

فرہاد

وہ سکاٹش تھا، ایک درمیانے درجے کا سول انجینئر جو چھوٹے موٹے ٹھیکے لے کر اپنے خاندان کا پیٹ پالتا تھا۔ آمدن کے ذرائع بہت ہی محدود تھے لہذا گھر کے تمام افراد مہینے میں ایک بار ریستورنٹ میں کھانا کھاتے، پندرہ دن بعد پینک پر جاتے اور دن میں صرف دو بار ڈائننگ ٹیبل پر آتے تھے۔ ڈور تھی اس کی بیوی کو سیاحت کا بہت شوق تھا لیکن اتنی محدود آمدنی جس میں ایک ڈبل روٹی خریدنے کے لیے بجٹ پر بار بار نظر ثانی کرنا پڑے، اس اتنا مہنگا شوق پاگل بن لگتا تھا، لیکن خاتون تھی بڑی کفایت شعار وہ ہر ماہ کسی نہ کسی طریقے سے چند ڈالر بچا لیتی تھی جو سال بعد سو سو ڈالر بن جاتے تھے لہذا انیس سال بعد جب وہ لوگ ”مفتیس“ سے باہر نکلتے تو یہ ان کے لیے بڑا یادگار دن ہوتا۔

Kashif Azad @ Onelibrary

۱۹۵۱ء میں بھی جب وہ لوگ ڈور تھی کی کفایت شعاری کے طفیل واشنگٹن ریلوے سٹیشن پر اترے تو کیونز ان درجنوں سیاحتی کتابوں کی مدد سے جن کا وہ دوران سفر مطالعہ کرتا رہا، ایک ایسا ہوٹل تلاش کر چکا تھا جو قابل فخر حد تک آرام دہ اور پرساسکس تو نہیں تھا لیکن واشنگٹن بھر میں ایسے لوگوں کے لیے اس سے بہتر شاید ہی کوئی ہوٹل ہو جو چند سینٹ خرچ کرنے کے بعد بار بار ساری رقم جھٹکتے ہوں۔ بہر حال ہوٹل کا کرایہ سفر کے اخراجات اور کھانے پینے کے خرچ کی طویل جمع تفریق کے بعد خاندان نے اندازہ لگایا کہ وہ چار روز تک باآسانی واشنگٹن میں قیام کر سکتے ہیں چنانچہ کیونز نے اس ہوٹل میں رہنے کا اعلان کر دیا جس کے بعد تمام لوگوں نے سامان کھولا اور بستروں میں اونٹن لیت گئے۔ آخر سفر مسافروں کو تھکا تو دیتا ہے۔

چار روز بعد جب وہ لوگ اپنے سامان کے ساتھ تفریح کی حسین یادیں بھی باندھ رہے تھے تو ہوٹل کا ڈیرائل لے حاضر ہوا، کیونز نے جستی ٹرے سے بل اٹھایا تو اس کے منہ سے سسکی نکلی اور اس نے بل سوٹ کیس کے ہیکل درست کرتی ڈور تھی کے سامنے رکھ دیا، جس نے جب کاغذ کے اس ٹکڑے پر نظر ڈالی تو اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ وہ دونوں پینک کا ”ماسک“ ترک کر کے ویٹر کی طرف سڑ سے جوان دونوں پر گزرتی قیامت سے لا تعلق اپنی کالی بھدی اور سوکھی انگلیوں سے ٹرے بجا رہا تھا: ”آپ لوگ ۸ ڈالر کمرائے کے کمرے کا ۲۲ ڈالر یومیہ کیوں وصول کر رہے ہیں؟“ کیونز نے تھوک نھکتے ہوئے پوچھا: ”سر واشنگٹن کے تمام ہوٹل

کرائے کے ملاوہ میہ دو ڈالر فی پچ وصول کرتے ہیں آپ کے ساتھ ۵ بچے ہیں لہذا ۸۱ جمع ۱۰ = ۱۸ ڈالر باقی ۳ ڈالر ٹیلی ویژن دیکھنے ہال میں میوزک سنے گرم پانی استعمال کرنے اور کافی شاپ جانے کا کرایہ وغیرہ کل ملا کر ۲۲ ڈالر میہ بن جاتے ہیں۔" وین نے غصے پر انگلیاں بجاتے ہوئے کہا۔ "ہوٹل انتظامیہ کی اس کھلی دھاندلی پر کیونز کا خون کھول اٹھا لیکن کیونکہ جھگڑا کرنا اس کی فطرت نہیں تھا لہذا اس نے خون کے گھونٹ بھرے اور پلٹ کر کمرے میں چمکنے لگا جبکہ ڈور تھی نے قہوڑی دیر کی تکرار کے بعد کانپتے ہاتھوں سے وین کو ادائیگی کر دی۔

رخصتی سے ذرا پہلے کیونز نے کمرے میں جھلنا ترک کیا اور اپنے بیوی کے قریب کھڑے ہو کر کہا: "ڈور تھی میں دنیا میں انتہائی جدید پراسٹاش اور سستے ہوٹل بناؤں گا جن میں سوانگ پول ہوں گے ہر کمرے میں ٹیلیفون ٹی وی اور میوزک چینل ہوگا ہر کمرے کا اپنا علیحدہ آرامتہ روم ہوگا ہوٹل میں چوبیس گھنٹے ڈانسر اور ڈیسٹس ہوگا اور جہاں بچوں کا الگ کرایہ وصول نہیں کیا جائے گا۔" ڈور تھی نے تھیلی پر پڑے سینٹ گھنٹے کا کام ترک کیا اور شے سے بھری نظروں سے اپنے خاوند کو دیکھ کر بولی: "کیونز سٹ بی جو کنگ" کیونز واپس مڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کھڑکی کے قریب گیا اور باہر جھانک کر بولا: "ڈور تھی میں ۴۰۰ ہوٹلوں کی چیمن بنا کر ثابت کروں گا کیونز ہی ہوٹل کے بزنس کا ہر کولیس ہے۔"

اور وہ جب بیوی اور پانچ بچوں کے ہمراہ اپنے شہر کے نمیشن پر اترتا تو اس کا چہرہ جذبات سے تپ رہا تھا اس کی سائیس گرم اور ہنسیلیاں پسینے سے تر تھیں۔۔۔۔۔ اور آخر امیہ جیوں نہ بولتا کہ اس کی جیب میں دنیا کے جدید ترین ہوٹل کا نقش تھا۔ وہ نقش جس میں وہ ریل کے تھکا دینے والے سفر میں مسلسل دو دن تک رگد بھرتا رہا اور جب اس شام وہ اپنے دیرینہ دوست "ایڈی بلوشین" کے پاس پلان لے کر گیا تو اس نے قہقہہ لگا کر کہا: "گویا تم۔۔۔۔۔ بنانا چاہتے ہو۔" کیونز نے سنا تو جج کر بولا: "ہاں میرے ہوٹل کی پین کا یہی نام ہو گا۔" اور ایک طویل عرصے بعد جب اس نے اپنے ہوٹل کی گیارہ سوویں براؤچ کا افتتاح اسی دوست سے کرایا تو بوڑھے ایڈی نے روندمی بولی آواز میں صحافیوں سے کہا: "یہ نام تو میں نے انگریزی فلم میں سنا تھا اور صرف کیونز کا مذاق اڑانے کے لیے دہرایا تھا مجھے کیا پتا تھا میں جس شخص کا مذاق اڑا رہا ہوں وہ اپنی محنت حوصلے سے دنیا فتح کر لے گا۔"

کیونز کا پہلا ہوٹل ۱۹۵۲ء میں ممبیس میں کھلا تو لوگ اس پر نوٹ پڑے۔ اس کامیابی پر اس نے اسی برس شہر کے دوسرے تینوں کولوں میں بھی ہوٹل کھول دیئے جس کے بعد شہر کے سارے ہوٹل ویران ہو گئے۔ سرمایہ آیا کامیابی کا شہرہ دور دور تک پھیلا تو اس نے اپنے ۲۰۰ ہوٹل کی چیمن کے منصوبے میں رگد بھرتا شروع کر دیا۔ دوستوں سے مشورے کئے سرمایہ داروں سے ملاقاتیں کیں منصوبہ سازوں سے ملا اور آخر کار فیصلہ ہوا ہوٹل کی اس پین کے لیے حصص کا اعلان کیا جائے لہذا اگلے ہی روز ایک لاکھ ۳۰ ہزار شیئرز کا اعلان کر دیا گیا۔ ہر شیئر ۵۵.۷۹ امریکی ڈالر کا تھا۔ ساکھ بن چکی تھی لہذا ایک ہی ہفتے میں سرمایہ جمع ہو گیا اور منصوبے پر عملی کام

صرف چھ برس بعد ۱۹۵۸ء میں یہی بھوکا جنگ انجینئر ڈائیز برگ میں اپنے ۵۰ ویں ہونٹ کا افتتاح کر رہا تھا۔ اس کا سودا ہونٹ ۵۹ء میں کھلا۔ جبکہ امریکہ سے باہر اس کا پہلا ہونٹ ۱۹۶۰ء میں مائٹریال میں بنا اور پانچ سودا ہونٹ جاسن لائن میں ۶۱ء میں شروع ہوا۔ ۲۸ برس کی چھ سلسل کے بعد جب ہونٹ کے ایک کوریڈر میں اسے چکر سا گیا تو اس نے دیوار کا سہارا لے کر سوچا: ”ہاں کیونز اب تم بوڑھے ہو چکے ہو۔“ اس نے وہیں کھڑے اپنے تینوں بیٹوں کو بلایا اور دنیا بھر میں پھیلا دیوڑوں ڈالر کا پرنس ان کے حوالے کر کے ہونٹ سے باہر آ گیا۔ پوریچ میں ابھی اس نے گاڑی کے دروازے پر ہاتھ رکھا تھا کہ اس کے پرسنل سیکرٹری نے آکر کہا: ”ایک سیکنڈ می سڑکل ہم دنیا میں ۱۷۵ ہونٹ کے مالک بن جائیں گے۔“ کیونز نے ایک بیجاری کے عالم میں یہ خوشخبری سنی اور کالر جھارتے ہوئے بولا: ”جان کرسی پر بیٹھے بیٹھے میری کرسی پر نشان آچکے ہیں آج ۲۸ برس بعد ستر پر بیٹھا چاہتا ہوں۔“

اگست ۷۹ء کی آخری ساتوں میں جب دنیا کے نقشے پر پھیلے دو ہزار ایک سو ستر ”ہالی ڈے ان“ ہونٹز کا مالک یہ بوڑھا کیونز ولسن اپنی زندگی کا پہلا اور آخری بیگھر دینے کے لیے بلا کالج کے آڈیٹوریم میں داخل ہوا تو دنیا بھر کے تاجروں نے کھڑے ہو کر اس کا استقبال کیا ہال دنیا کے اس کامیاب ترین انسان کے لیے ۱۳ منٹ تک تالیوں سے گونجتا رہا اور پھر اس کے برائے مسافروں کو مخاطب کر کے کہا: ”مجھے اس اعتراف میں کوئی شرمندگی نہیں کہ جب میں اپنے پہلے ”ہالی ڈے ان“ کا نقشہ لے کر ایڈی کے گھر آیا تو واپسی پر میری جیب میں خرام کا کرایہ نہیں تھا لیکن آج زندگی کے طویل اور کامیاب سفر کے بعد میں اعلان کرتا ہوں کامیابی کے لیے پیسے نہیں جذبے کی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ پوچھیں گے میں نے زندگی کا یہ ہمالیہ کیسے سر کیا تو جو انویں میری کامیابی کے صرف تین اصول تھے۔ میں نے کبھی کسی ناکامی پر حوصلہ نہیں ہارا میں کبھی کسی غلطی پر پشیمان نہیں ہوا اور میں نے کبھی ایک سیکنڈ ضائع نہیں کیا۔ آپ یقین کریں مجھے پوری زندگی خدا سے یہی گلہ رہا کہ اس نے دن کو ۹۰ گھنٹے کا کیوں نہیں بنایا۔“

اور جب وہ بوڑھا پرنس مین ہال سے رخصت ہونے لگا تو ایک صحافی نے روک کر پوچھا: ”مسٹر ولسن زندگی میں آپ کبھی تھکے ہوں۔“ وہ چند لمحوں کے لیے رکا اور پھر گردن موڑ کر بولا: ”میرے بیچے اگر مالی تھک جائے تو پودوں پر پھل نہیں لگا کرتے۔“

اور جب میں اس بوڑھے کیونز کی داستان پڑھ رہا تھا تو میں نے اپنے آپ سے سوال کیا ”کیا ہر شخص فریاد بن سکتا ہے؟“ تو جواب آیا: ”ہاں اگر اسے کوئی شیریں جیسی تحریک مل جائے۔“



ہذا حرام

لوگ اسے کسی بس شاپ، بک شاپ یا شاؤنگ سنٹر میں پا کر رک جاتے ہیں، ایک دوسرے کی ہیلیوں میں کہنیاں چھو کر اس کی طرف اشارے کرتے ہیں اور پھر سرگوشیوں میں ایک دوسرے کو بتاتے ہیں: وہ دیکھو، "اینڈریو" کھڑا ہے اور پھر بچے ادب سے جھک کر سلام کرتے ہیں۔ خواتین "ہائے سنڈریو" کہہ کر ہاتھ ہلاتی ہیں اور نو جوان بڑے رشک سے ساتھیوں سے پوچھتے ہیں: "کیا ہم بھی اینڈریو کو دیکھنی ترقی کر سکتے ہیں؟" اس لمحے وہ اس طرح چونک کر آگے پیچھے دیکھتا ہے جیسے پورا نیو یارک کسی دوسرے شخص سے مخاطب ہو اور وہ یہ سوچنے میں ہے بھی حق بجانب کہ ایک ایسا شخص جس کا باپ گوالا اور ماں کلرک تھی، غربت جس کی تعلیم کی راہ میں کھڑی ہوئی، جس نے حکم کی آگ بھڑکی کرنے کے لیے ۱۳ برس کی عمر میں مزدوری شروع کی، جو آج تک اچھی انگریزی نہیں بول سکتا، جو سب لیتے ہوئے قیص پر جوں مرادیتا ہے، وسیع لائوں اور پتھریں کمر میں جس کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے، جسے اپنی تعریف سن کر پسینہ آ جاتا ہے اور جو عموماً خریدی ہوئی چیزیں دکان پر ہی بھول آتا ہے وہ خود کو دنیا کی ساتویں بڑی فرم کا "مالک" کیسے سمجھ سکتا ہے خود کو ۹۷ء کا سب سے بڑا شخص اور بیسویں صدی کا انتہائی دماغ کیسے مان سکتا ہے؟

دسمبر ۲۵ء کی وہ رات آج تک اس کے حافظے سے چپکی ہے جب رومی بنگری میں داخل ہوئے اور وہ اپنے ایک دوست کے ساتھ فرار ہو کر آسٹریا آ گیا، جہاں سے وہ ایک گروپ میں شامل ہو کر نیو یارک چلا آیا، شہر انجینی تھا، لوگ اور ماحول پریشان کن اور خود وہ اس قدر نالائق کہ کسی سے نام تک نہیں پوچھ سکتا تھا لہذا بے چارگی، بے بسی اور مسافرت تھی، بغیر کچھ کھائے، بے چار چار دن گزر جاتے تھے، ہفت ہفتہ ہونے ہوئے پانچوں، پلوں اور متر وک مدارتوں میں گزرتا، یہ فاقہ مستی پورے سات ماہ تک اس کے ساتھ رہی۔ یہاں تک کہ ۵۷ء۔ بکرو وسط تک اسے بس کنڈیکٹری کی نوکری مل گئی۔ اس کے بعد وہ خود کو خوشحال اور سرمایہ دار سمجھنے لگا۔ جیب میں کچھ پیسے آئے تو اس نے سوچا: "کیا اس نے زندگی بھر مسافروں کی گالیاں ہی سنی ہیں؟" اندر سے آواز آئی، نہیں، زندگی اس سے کہیں زیادہ کا تقاضا کرتی ہے، پھر سوچا کیا کیا جائے، جواب آیا ترقی اور کامیابی کے زیادہ تر راستے علم سے نکلتے ہیں۔ پھر سوچا، تعلیم کے لیے رقم کہاں سے آئے گی، جواب آیا اگر دن میں

ایک بار کھانا کھا لیا جائے، کافی کا ایک کپ پیا جائے اور ریل کے بجائے پیدل سفر کیا جائے تو انسان مروت نہیں جانتا؟ چنانچہ اس منصوبہ بندی پر عمل درآمد شروع ہوا تو چھ ہی ماہ میں عکے کے نیچے اتنے میسے جمع ہو گئے جن سے سٹی کالج نیویارک میں داخلہ لیا جاسکتا تھا۔

کالج میں پہلا دن بھی کم دلچسپ نہیں تھا۔ اینڈریو گروہ کی انگریزی بہت واجبی اور سائنس کا علم نہ ہونے کے برابر تھا۔ وہ مثلث، زاویے اور عمودی خطوط میں تفریق نہیں کر سکتا تھا، لیکن اس کو تاہ علمی کے باوجود وہ "ماڈرن سائنسز" رکھنے پر مصر تھا، جب اصرار ضد بن گیا تو پرنسپل اپنے ساتھیوں کی طرف مڑ کر بولا: "اگر کوئی چارٹ کا پوتا دس فٹ اونچی چھلانگ لگانا چاہے تو ہم اسے روکنے والے کون ہوتے ہیں؟" پرنسپل کا یہ فقرہ بھی اس کے دماغ سے چپک گیا، لہذا آنے والے دنوں میں جب بھی وہ نوٹس بنانا یا تھک جاتا، کتابوں پر سرخ بیخ کر دیتا ہو جاتا، عامل پذیر فارمولوں اور ناقابل فہم تراکیب سے الجھ الجھ کر بور ہو جاتا تو اس کے اندر سے آواز آتی: "چارٹ کے ہونے کو دس فٹ اونچی چھلانگ لگانے کے لیے یہ سب کچھ تو سہنا پڑے گا۔" اور وہ سر جھٹک کر دوبارہ کتابوں میں غرق ہو جاتا۔ ہونے اور چھلانگ کی یہ ترکیب پالی ایج ڈی تک اس کے ساتھ رہی، بلکہ نہیں، اس کے بعد بھی جب زندگی اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی تو وہ اسی فقرے سے ہدایت لیتا۔

۶۳ء کی وہ رات بھی اس کے حافظے میں ابھی تک زندہ ہے جب وہ ایوا (اس کی وٹرس گرل فرینڈ) کے ساتھ ایک ٹھیکرے سے نکلا اور دونوں ڈرامے کے مکالمے دہراتے ہوئے پیدل ہی گھر کی طرف چل پڑے۔ اس رات فٹ پاتھ پر بیٹز کے خالی ٹن اور فاسٹ فوڈ کے کچلے ہوئے ڈبے بکھرے پڑے تھے۔ اس نے ایک بیچکے ہوئے ٹن کو ٹھوکر ماری اور رک کر ایوا پر نظریں گاڑ کر بولا: "سوٹ پارٹ تم جانتی ہو میں کیا بننا چاہتا ہوں۔" ایوا نے گھبرا کر اسے دیکھا اور فوراً نفی میں سر ہلا دیا۔ "ہوں" اس نے ہنسا کر ابھرا اور ساتھ ہی دونوں بازو پھیلا کر بولا: "دنیا کا سب سے بڑا انسان۔" ایوا نے سنا تو پورا منہ کھول کر قہقہہ لگایا اور دیر تک ہنسی چلی گئی اور وہ چہرے پر مسکراہٹ سجائے اسے دیکھتا رہا یہاں تک کہ ایوا کی، ہونٹ سکیڑے اور پھر تھبتھا ڈرا سنجیدگی سے بولی: "اینڈریو ماڈرنٹ ایڈرسٹ اونچی تو برج نہیں، آخر بڑے لوگ بھی تو انسان ہی ہوتے ہیں، ڈیڑھ سو پاؤنڈ وزنی، دو آنکھوں، دو ہاتھوں اور ایک پاؤ دماغ والے انسان، پھر میرا اینڈریو ان میں سے ایک کیوں نہیں ہو سکتا؟" اس نے فوراً ہاتھ نیچے گرائے اور ایوا کی ٹھوڑی چھو کر کہا: "ہاں ایوا صرف عقل اور محنت ہی لوگوں کو بڑا بناتی ہے اور میرے پاس یہ دونوں ہیں۔"

۶۸ء میں اس کی زندگی نے ایک اور کروٹ لی اس نے گاؤن سور اور رابرٹ ٹائیس کے ساتھ مل کر "اینٹل" کی بنیاد رکھی (یہ اب دنیا میں کمپیوٹر کی سب سے بڑی فرم ہے) اس وقت اس چھوٹے سے دفتر کو دیکھ کر دنیا کا کوئی شخص پیشین گوئی نہیں کر سکتا تھا کہ صرف آٹھ برس بعد (۱۹۷۶ء) میں اینٹل امریکہ میں بزنس کا ریکارڈ توڑ دے گی، لیکن اینڈریو گروہ کو یہ یقین تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اسے عقل اور محنت دونوں سے نوازا رکھا تھا۔

اینڈریو گروڈ کا نام آج دنیا کی ساتویں بڑی فرم کے ساتھ آتا ہے۔ ایک ایسی کمپنی جس کے اثاثے ۵۰ بلین ڈالر سے تجاوز کر چکے ہیں (پاکستان کے کل بیرونی قرضے ۳۲ بلین ڈالر ہیں) یہ کمپنی ہر سال ۵۱ بلین ڈالر منافع کماتی ہے۔ (پاکستان کا کل بجٹ ۵۶ بلین ڈالر ہے) اینڈریو کے ذاتی اکاؤنٹ میں ۳۰۰ ملین ڈالر ہیں۔ اس کمپنی نے پچھلے تیس برسوں میں ساڑھے تین ہزار لوگوں کو کروڑ پتی بنایا۔ ایک سروے کے مطابق ۹۷ میں دنیا بھر پر ۳۳ ملین کمپیوٹر فروخت ہوئے جن میں سے ۹۰ فیصد کمپیوٹر میں اینڈریو کی کمپنی کے مائیکرو پراسیسر نصب ہیں، لیکن اس تمام تر کاروباری لاش پش کے باوجود وہ ابھی تک ۲.۷۵ × ۲.۷۵ میٹر کے دفتر میں کام کرتا ہے۔ اس کا ذاتی مٹلا فقط تین افراد پر مشتمل ہے، اس کے پاس کوئی بڑی گاڑی نہیں، کوئی بڑا گھر، کوئی قیمتی چیز نہیں، وہ اپنا کپ خود دھوتا ہے، وہ کمپنی ہی کی کینٹین پر عام ٹکڑوں، انجینئروں، چپرائیسیوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتا ہے، نرے لینے کے لیے خود کا ڈنٹر پر جاتا ہے۔

اس اینڈریو گروڈ نے ۹۷ میں مائیکرو چپ "پینٹیم نو" بنا کر ڈیجیٹل کی دنیا میں انہی دھماکا کر دیا۔ ہاتھ کی چھوئی انگلی کے پور پر ساجانے والے اس مائیکرو چپ کو دیکھ کر کون یقین کرے گا کہ اس نصف انچ کے ٹکڑے پر ۵۰ بلین (۵ لاکھ) ٹرانسزسٹرز نصب ہیں اور یہ ایک منٹ میں ۵۰۰ ملین ہدایات بجالاتا ہے اور جس کے بارے میں ماہرین کا خیال ہے پینٹیم نو کے بعد یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ہم آج تک زمانہ قبل مسیح میں زندگی گزار رہے ہیں جبکہ اینڈریو گروڈ کا دعویٰ ہے کہ میں اس مائیکرو چپ سے ثابت کروں گا انسان اس نصف انچ کے ٹکڑے کے بغیر ادھورا ہے۔"

"نام" کی نیم نے جب اس سال کے آغاز میں اینڈریو پر گورنشوری چھاپنے کا فیصلہ کیا اور درجنوں صحافی اینڈریو گروڈ کی جیب میں لگ گئے تو اس کے اسٹنٹ جان ڈائر نے صحافیوں کو مخاطب کر کے کہا: "واٹ اے ٹھیکس باس ہی اڑ، میں نے اس کے ساتھ چھ برس کام کیا، میں نے اس سے عجیب و غریب باس پوسے امریکہ میں نہیں پایا۔ یہ آپ کو قتل تک معاف کر دے گا لیکن اس کے نزدیک کام میں کوتاہی، وقت کے ضیاع اور دوران ڈیوٹی فضول گپ شپ کی کوئی معافی نہیں۔" اے اس کی بیوی نے مسکرا کر جواب دیا: "اینڈریو گروڈ کسی شخص نہیں ایک جدوجہد کا نام ہے۔" اس کے بچوں نے کہا: "ہم نے تو اسے ایک شفیق انسان پایا جو بڑی سے بڑی بات نہیں کر لیتی جاتا ہے۔" اس کے اکاؤنٹ نے کندھے اچکا کر کہا: "یہ شخص ناقابل فہم ہے، اس نے اپنی ساری آمدنی فلاحی کاموں کے لیے وقف کر رکھی ہے، ہر سال یکم ستمبر کے دن وہ تحفے جاری کرتا ہے، ہنگری سے آنے والے لوجوانوں کو تلاش کر کے سیٹل کراتا ہے، خیراتی اداروں کو فنڈز دیتا ہے، انٹرنیشنل ریسلمنٹ کمپنی کو رقم فراہم کرتا ہے اور پراسٹیت کیسز کے مریضوں کا علاج کراتا ہے۔"

اور جب اسے "مین آف دی ۹۷" کے ٹائٹل کی اطلاع دی گئی تو وہ اپنی لیبارٹری میں کام کر رہا تھا۔ وہ ایک لمبے کے لیے رکھا، چشمہ اتار کر میز پر رکھا، ایک ادھورا سانس لیا اور پھر مسکرا کر بولا: "ٹھیک ہے لیکن ابھی

ایڈز یو کا مشن پورا نہیں ہوا، چھینک یو دیری بچ جاتے ہوئے دروازہ بند کر دیجئے گا، میں کام کے دوران شور پسند نہیں کرتا۔"

جب "نائم" کی ٹیم نے اس کا انٹرویو شروع کیا تو وہ انک انک کر بول رہا تھا اور اس کے لہجے میں ہنگری کے دیہاتیوں کا غموار پن تھا، وہ جب پینٹیم نو کا نقشہ اٹھانے کے لیے مڑا تو خاتون صحافی نے اپنے ساتھی سے سرگوشی میں پوچھا: "کیا واقعی یہی وہ شخص ہے جسے مین آف دی ایئر کہا جاتا ہے؟" اس کے حساس کانوں نے یہ سرگوشی سن لی، وہ وہیں سے مڑا اور خاتون کو مخاطب کر کے بولا: "میڈم ایڈز یو گر دو کو ایڈز یو گر دو اس کی زبان نے نہیں اس کے ہاتھوں نے بنایا ہے۔"

اور پھر جب پوچھنے والوں نے پوچھا: "کیا آپ دنیا بھر کے بیروزگاروں کو کوئی پیغام دینا چاہیں گے؟" اس نے ایک لمحے کے لیے آنکھیں بند کیں، لمبا سانس لیا اور پھر صحافیوں سے مخاطب ہوا: "میرا خیال ہے دنیا میں کوئی بیروزگار نہیں کہ جس شخص کو قدرت نے عقل سے نوازا ہو، وہ ہاتھ دیتے ہوں، وہ بیروزگار کیسے رہ سکتا ہے، محروم، نادار اور مسکین کیسے ہو سکتا ہے؟" خاتون صحافی نے پوچھا: "لیکن اس وقت دنیا میں بیروزگاروں کی تعداد کروڑوں میں ہے۔" اس نے تہقیر لگایا اور پھر چمکتی ہوئی نظریں خاتون صحافی پر گاڑ کر بولا: "آپ غالباً پست حوصلہ اور ہڈ حرام لوگوں کو بیروزگار کہہ رہی ہیں۔"

Kashif Azad @ OneUrdu.com



اعتماد

وہ پڑھاتے پڑھاتے تھک جاتا تو اکتا کر کیمپس سے باہر آ جاتا، باہر چٹا گاؤں کے دیہات تھے، غربت، مصیبت اور بیماری کے مارے دیہات جن کی کھاریوں میں بھوک اُگتی اور مشقت کاشت ہوتی تھی۔ وہ کھیتوں سے گزرتا اور باریک پیلیوں پر منڈھی سیاہ جلد کی قریر پڑھتا جاتا، زرد، سیلی اور بے زار آنکھوں کے شکوے جمع کرتا جاتا، زندگی کی ارزانی اور بے قدری کے نوے چٹا جاتا اور سوچتا جاتا: "میں محمد یونس چٹا گاؤں یونیورسٹی کے شعبہ معاشیات کا پروفیسر، لوگوں کو معاشیات کی تعلیم دیتا جس کا کام ہے، عملی طور پر ان لوگوں کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔ میری زندگی اور میرے اقوال میں کتنا تضاد ہے" یہاں پہنچ کر ایک گھبراہٹ سے آنکھیں کھلتی ہیں وہ گھبرا کر واپس پلٹتا اور تیز نیزہ قدم اٹھاتا وہ بارہ کیمپس میں پہنچ کر ٹوٹ پھوٹتا ہے۔ اہل کیمپس نے اسے گھبراہٹ سے آنکھیں کھلتی ہیں

ایک روز جب تھکا ہارا سورج شیش بنگال پر جھک کر اپنا منہ دیکھ رہا تھا، تو وہ حسب معمول کیمپس کے ایک قریبی گاؤں میں داخل ہوا اور آہستہ آہستہ بو جھل قدموں سے چلتے لگا، آج پھر وہ فیصلہ کر کے آیا تھا، وہ فیصلہ جو وہ پچھلے چند ماہ سے مسلسل باندھ رہا تھا، لیکن بوڑھیا کی ڈیوڑھی آتے ہی توڑ کر آگے نکل جاتا، بوڑھیا آج بھی معمول کے مطابق کھروڑے بان کے موڑھے بنا رہی تھی، آج بھی اس کی کچی ڈیوڑھی میں جتنا ہوا کڑوے تیل کا چراغ غنما کر شام غریباں کا پیغام دے رہا تھا، پروفیسر کا کھنگارہ کھنگارہ صاف کیا اور سلام کر کے بوڑھیا کے قریب کھڑا ہو گیا۔ بوڑھیا نے چونک کر اوپر دیکھا، اس کے مشین کی طرح چلتے ہاتھ ایک نلچے کے لیے رکے اور آنکھوں میں وحشت بجلی کی طرح کوند گئی، پروفیسر فوراً گھبرا گیا، اس نے پراسٹری کے کندھ بن پے کی طرح شکست لہجے میں پوچھا: "اس تم اتنے موڑھوں کا کیا کرتی ہو؟" بوڑھیا نے اطمینان کا سانس لیا اور اس کے ہاتھ دوبارہ چلتے گئے، چند ساتیس گزر گئیں، بوڑھیا کی اور نہ ہی پروفیسر ٹلا، یہاں تک کہ موڑھے کا پینڈا کھل ہو گیا۔ بوڑھیا نے اسے پرے پھینکا اور ٹانگیں سپار کر بولی: "کرتا کیا ہے، شام کو ٹھیکیدار کو دے دیتی ہوں۔" پروفیسر وہیں چوکھٹ پر بیٹھ گیا۔ "ٹھیکیدار آپ کو کتنے پیسے دیتا ہے؟" اس نے پوچھا۔ "دو کتے" بوڑھیا نے مختصر سا جواب دیا۔ "ٹھیکیدار یہ کتنے کا پتہ ہے؟" "میں کتے کا" بوڑھیا نے فوراً جواب دیا۔ "اس طرح تو ۱۸ کتے ٹھیکیدار لے جاتا ہے" اس کی آواز میں لرزش تھی "ہاں لے جاتا ہے۔" بوڑھیا نے اکتا کر کہا "آپ

بازار میں خود موڑھے کیوں نہیں بیچتیں؟“ لڑکش کی جگہ حیرت نے لے لی ”میں سوڑھے بناؤں یا بیچوں؟“ بوڑھیا نے دوبارہ ٹانگیں تہہ کیس اور موڑھا اٹھا کر تیزی سے ہاتھ چلانے لگی۔

اس روز پرہیزگار واپس آیا تو خوشی سے اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں اور ہاتھوں میں سنسنابٹ تھی، اس نے آتے ہی کمرہ اندر سے بند کیا اور کاغذ کلم لے کر معاشی دنیا کا نیا فارمولا تیار کرنے لگا، اس نے لکھا بوڑھیا اس لیے ۲۰ ٹکے کا موڑھا ۲ ٹکے میں فروخت کرنے پر مجبور ہے کہ اسے شام کو روٹی کے لیے پیسے چاہئیں۔ اگر کوئی شخص اسے بیٹے بھر کے راشن کے پیسے دے دے تو وہ مال تیار کر کے شہر لے جائے اور سینکڑوں روپے کما کر واپس آئے۔ اس رات وہ دیر تک کام کرتا رہا، یہاں تک کہ صبح صادق کی کرلوں نے اس کی کھڑکی پر دستک دی۔ اس نے چونک کر آسمان کے کناروں سے منعکس ہوتی روشنی پر نگاہیں گاڑ دیں اور ایک مسرت سے بھرپور سانس لے کر کہا ”حقیک گاؤب میں بنی نوع انسان کے لیے کچھ کر سکتا ہوں۔“

اس نے آئندہ چند روز میں اس گاؤں کے ایسے ۳۲ خواتین و حضرات کی فہرست بنائی جو موڑھے بنا کر ٹھیکیداروں کو فروخت کرتے تھے، اس نے ان لوگوں کے انٹرویوز کئے، ان کے اقتصادی مسائل سنے تو پتا چلا اگر کوئی شخص ان لوگوں کو ۳۰ روپے قرض دے دے تو یہ لوگ ٹھیکیداروں کے چنگل سے ہمیشہ کے لیے رہائی پاسکتے ہیں۔ اس نے اپنی جمع پونجی مٹی تو وہ کچھ اتنی ہی نکلی، اس نے پیسے لیے اور اس گاؤں چلا گیا۔ ۳۲ لوگوں کو جمع کیا، ان کی ایک ”فرم“ بنائی اور ۳۰ ڈالر ان کے حوالے کر دیے۔ زبانی ایک سمجھوتا طے پایا کہ وہ لوگ موڑھے بنا کر براہ راست مارکیٹ میں بیچیں گے ۸۰۰ فیصد منافع اپنے پاس رکھیں گے اور ۲۰ فیصد اسے ادا کریں گے، فریقین نے گرونیس بلا کر سمجھوتے کی تصدیق کر دی۔

کام شروع ہوا تو دونوں ہی میں نہ صرف ڈاکٹر یونس کے ۳۰ ڈالر واپس آگئے بلکہ ان ۳۲ لوگوں کے چہروں پر بھی خوشحالی ٹھاٹھیں مارنے لگی، مکان بکے ہونے لگے، گھروں میں تین تین وقت روٹی پکتنے لگی، بچوں اور خواتین کے چار چار جوڑے کپڑے بننے لگے، تجربہ کامیاب ہو گیا۔

۱۹۷۶ء کے آخر میں ڈاکٹر یونس نے بینکوں میں ملازم اپنے پرانے طالب علموں کو چائے کی دعوت دی، سارے طالب علم خوشی حاضر ہو گئے، چائے سرو ہوئی جب سب آدھا آدھا کپ ”سپ“ کر چکے تو ڈاکٹر یونس نے یہ قصہ سنایا، سب نے لچکپی سے سنا آخر میں ڈاکٹر نے انہیں بتایا کہ نہ صرف اس کے ۳۰ ڈالر واپس مل چکے ہیں بلکہ اسے روزانہ چالیس پچاس ٹکے بھی موصول ہو رہے ہیں۔ سب نے سانس کی نظروں سے اسے دیکھا، ڈاکٹر خوش ہوا اور اپنا پلان ان کے سامنے رکھ دیا۔ ”صاحبو اگر میری جگہ کوئی ادارہ یا بینک لے لے تو اگلے ۲۰ برسوں میں ۶۸ ہزار دیہات کی تقدیر بدل سکتی ہے۔“ طالب علموں نے سنا تو قہقہہ لگا کر بولے: ”سر آپ کس خیالی دنیا میں رہ رہے ہیں، دنیا کا کوئی بینک اتنا بڑا رسک نہیں لے گا۔ آپ پڑھانے پر توجہ دیں، اکانومسٹ نہ بنیں۔“ ڈاکٹر یونس کو ان کا مذاق برا لگا، لہذا اس نے اپنا پلان کامیاب بنانے کا فیصلہ کر لیا، ہر

قیمت پر ہر صورت میں۔

ڈاکٹر یونس نے طالب علموں سے مایوس ہو کر بیٹکوں کے اعلیٰ عہدیداروں سے ملاقاتیں شروع کر دیں۔ وہ ان سے ملتا، اپنا پلان ان کے سامنے رکھتا، انہیں بتاتا "جتنا ایماندار غریب آدمی ہوتا ہے، اتنا کوئی امیر نہیں ہو سکتا۔ آپ اس پر اعتماد کر کے دیکھیں، وہ آپ کو مایوس نہیں کرے گا۔" لیکن کوئی بینک ۳۰ ڈالر سے کئے گئے تجربے کی بنیاد پر اتنا بڑا رسک لینے کے لیے تیار نہیں تھا۔ ڈاکٹر یونس مسلسل ۶ ماہ تک ایک بینک سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے میں دھکے کھاتا رہا، لیکن کوئی کامیابی نہ ہوئی۔

۷۷ء کے شروع میں ایک بینک نے اس کی ذاتی گارنٹی پر کسانوں کو قرضے دینے کی حامی بھری۔ ڈاکٹر یونس تیار ہو گیا، اس نے ایک پسماندہ گاؤں منتخب کیا اور اپنی گارنٹی پر لوگوں کو آسان شرائط پر قرضے لے دیے، چھ ماہ بعد بڑے حیرت انگیز نتائج برآمد ہوئے، تمام کسانوں نے نہ صرف بروقت قسطیں ادا کر دیں بلکہ خوشحال بھی ہو گئے۔ بینک کو حوصلہ ہوا اور اس نے مزید دو تین دیہات کے لوگوں کو قرضے جاری کر دیئے۔ اس بار بھی نتائج حوصلہ افزا نکلے۔ بینک کے اعلیٰ عہدیداروں نے ڈاکٹر یونس کو بلایا اور دیر تک تالیاں بجا کر اس کی خدمات کا اعتراف کیا۔ ڈاکٹر یونس اپنی کرسی پر براجمان ہوا اور بنگلہ دیش کے بڑے بڑے بینکاروں کو مخاطب کر کے بولا: "حضرات آپ لوگ ایک ایسا بینک کیوں نہیں بناتے، جو صرف غریب دیہاتیوں کو قرضے دے۔" بینکاروں نے تجویز کی تائید کر دی۔

۱۹۷۷ء کی وہ صبح ڈاکٹر یونس کے لیے عظمت کا پیغام لے کر طلوع ہوئی کیونکہ دنیا میں غریبوں کا پہلا بینک قائم ہو چکا تھا۔ "دی گرامین بینک" ایک ایسا بینک جس کے نوے فیصد شیئرز ان غریب دیہاتیوں کے پاس تھے جنہوں نے گرامین سے قرض لے کر زندگی کے دیے میں تیل ڈلوایا (حکومت کے پاس صرف دس فیصد شیئر ہیں) ایک ایسا بینک جو قرض دیتے ہوئے کوئی گارنٹی طلب نہیں کرتا، جس کی شرح سود نہ ہونے کے برابر ہے، جو قارم پر دستخط اور انگوٹھا بھی نہیں لگواتا، صرف اعتماد کرتا ہے اور جواب میں اعتماد پاتا ہے۔

گرامین بینک صرف ۱۰۰ ڈالر قرضہ دیتا ہے، قرضہ لینے کی دو شرطیں ہیں۔ ایک، آپ غریب ہوں، دوسرا آپ اپنا کوئی "بزنس" سیٹ کرنا چاہتے ہوں۔ ریڑھی لگانا چاہتے ہوں، سائیکل رکشہ خریدنا چاہتے ہوں یا دستکاری کی چھوٹی ورکشاپ بنانا چاہتے ہوں یا پھر کوئی بھی ایسا کام کرنا چاہتے ہوں جو آپ کے حالات بدل دے۔

ان ۳۱ برسوں میں بنگلہ دیش میں گرامین کی ۱۰۳۱ برانچیں قائم ہوئیں، جن میں ۱۱ ہزار لوگ ملازم ہیں، ان ۱۱ ہزار لوگوں نے بنگلہ دیش کے ۳۳ ہزار دیہاتوں کے ۲۰ لاکھوں بنگالیوں کی تقدیر بدل دی۔ انہیں غربت کے جہنم سے نکال کر باوقار زندگی کے راستے پر کھڑا کر دیا۔

گرامین دنیا کا واحد بینک ہے، جس میں کوئی نادہندہ نہیں، جس کے برنس میں ہر سال دو گنا اضافہ ہوتا ہے جس کے بورڈ آف گورنرز کے ۱۳ میں سے ۹ ممبر عام الٹا پنڈھ دیہاتی ہیں۔

عظیم ہے ڈاکٹر یونس، جس نے دنیا کے غریب کا اعتماد بحال کیا اور عظیم تر ہیں چنا گانگ کے دو دیہاتی جنہوں نے ڈاکٹر یونس کے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچا کر دنیا بھر کے غریبوں، اقتصادی معذوروں اور ناداروں کے لیے نیا راستہ کھول دیا، کامیابی اور روزگار کا راستہ۔

لیکن نظر سوال کرتی ہے، کیا پاکستان کی ۱۵ کروڑ کی آبادی میں ایک بھی ڈاکٹر یونس نہیں جو ایدھی کی طرح جھولی پھیلا کر نکلے اور ایک نئے "گرا مین" کی بنیاد رکھے کہ غریب خواہ بنگلہ دیش کا ہو یا پاکستان کا جاگیردار، سرمایہ دار اور بزنس مین سے کہیں زیادہ ایماندار ہوتا ہے۔ کوئی ہے جو پاکستان کے غریب پر بھی اعتماد کرے؟



Kashif Azad @ OneUrdu.com

مجزے

جونی، بحرِ اکال کی بخ بستہ ہوائیں طیارے کے پروں سے کھراتی ہیں، سرخ بتیاں آن ہو جاتی ہیں، مسافر سگریٹ بجھانا شروع کر دیتے ہیں، فضائی میزبان گلاس، بوتلیں اور گتے کی پٹنیں سمیٹتے لگتے ہیں، سیفٹی بیلٹس کی کلک، ٹک اور شیٹ کی آوازیں ابھرنے لگتی ہیں، اچانک اس کروت لیتے ماحول میں ایک سریلی، مدہم اور روح تک اثر کرنے والی نفرتی آواز گونجتی ہے۔ "خواتین و حضرات ہم چند لمحوں میں اوسا کا پہنچنے والے ہیں، اگر آپ اپنی نظریں کھاک کے ڈائل پر مرکوز کر لیں تو ٹھیک دس سیکنڈ بعد آپ اپنی کھڑکی سے دنیا کا حیرت انگیز ایئر پورٹ دیکھنے کے قابل ہو جائیں گے۔ پانی پر بنا دنیا کا پہلا ایئر پورٹ، خواتین و حضرات وقت کی آواز سنیں۔" نفرتی آواز خاموش ہو جاتی ہے جس کے ساتھ ہی پیکر سے گھڑی کی سوئیوں کی ٹنگ ٹنگ نشر ہونے لگتی ہے، ٹھیک پانچ سیکنڈ بعد سارے مسافر اپنی ناک کھڑکیوں کے شیشوں سے جوڑ لیتے ہیں اور پھر آنکھوں میں حیرت نمی بن کر تیرنے لگتی ہے، چہرے خوف اور استعجاب سے پیلے پڑ جاتے ہیں اور ہونٹوں پر سسکیاں چپک جاتی ہیں۔

گھرے، نیلے اور ٹھنڈے سمندر میں گھرا "اوسا کا" جاپان کا ایسا شہر ہے جسے جب بین الاقوامی ہوائی اڈے کی ضرورت پڑی تو شہر میں طویل دن وے، لاکھوں مسافروں کے لیے سینکڑوں ایکڑ پر پھیلے لاؤنج، ریستورانس، بنگلے آفیسر، شاہجگ سفنز اور ٹیکسی شینڈز کے لیے ایک چپڑ زمین نہیں تھی لیکن جب سیاہ آنکھوں اور پست ناکوں والے زرد رو جاپانی سر جوڑ کر بیٹھے تو انہوں نے سوچا زمین بھی نہیں اور ایئر پورٹ بنانا بھی ضروری ہے، کیا کیا جائے؟ نقشے سامنے پھیلا دیئے گئے، محمد ب عدے اور کاربن پھلسفیں نکال لی گئیں، تھرماس میں گرم کافی بھری گئی اور پھر گفتگو شروع ہو گئی، دلیل کے جواب میں دلیل اور سوال کے مقابلے میں سوال اٹھنے لگا۔ ایک ٹھنڈے گزرا، دوسرا گزرا، تیسرا گزرا، یہاں تک کہ شام ہو گئی، لیکن کاربن پھلسفیں چلتی رہیں، کافی کے کپ خالی ہوتے رہے گفتگو کا سلسلہ جاری رہا، جب بات کسی نتیجے پر پہنچتی نظر نہ آئی تو اچانک چیف انجینئر نے ہاتھ اٹھائے اور سب کو مخاطب کر کے بولا: "بس طے ہو گیا ہم شہر سے پانچ کلومیٹر دور زمین سمندر میں ہوائی اڈہ تعمیر کریں گے۔" سننے والوں کے چہرے دھواں ہو گئے، ایک نو جوان انجینئر نے کپکپاتے لہجے میں پوچھا

"لیکن سر یہ کیسے ممکن ہے؟" چیف انجینئر مسکرایا، کافی کا ایک گھونٹ بھرا اور بولا: "جب اتنی لمبی چوڑی دنیا پانی پر قائم رہ سکتی ہے تو چند میل لمبا رن وے کیوں نہیں بن سکتا، اپنی انجیکشن" سب انجینئر جاپانی روایات کے مطابق رکوع میں جھکے اور ایک آواز ہو کر بولے "تو تو سر۔"

پھر دنیا کا یہ حیرت انگیز پراجیکٹ شروع ہو گیا، مولے مولے غبارے رسیوں کے ساتھ ہاندھ کر پانی میں "مارکنگ" کی گئی بڑے بڑے بحری جہازوں پر چین سے پھرلائے گئے، اوسا کا کے ساحل پر نصب کرش مشینوں کے ذریعے ان کی بحری ہائی گنی، مارکنگ والی جگہ کو ایک سانچے کی شکل دی گئی۔ جب یہ کام مکمل ہو گیا تو اس سانچے کو سینٹ، تارکول اور ٹیمپل سے بھرنے کا موقع آیا، جاپانی اٹھنے اور سینکڑوں ایکڑ طویل سانچے میں ۲۰ میٹر گہرائی تک کرش بھرتے چلے گئے۔ یہاں تک کہ پانی میں خشکی کا ایک طویل، مضبوط اور ہموار ٹکڑا بھر آیا۔

ایک روز جب اوسا کا شہر کی آسمان بوس عمارتیں پانی میں ٹھہرے خشکی کے اس ٹکڑے کو حیرت سے دیکھ رہی تھیں تو پست قامت چیف انجینئر جو اس پر چہل قدمی کر رہا تھا، مڑا اور پھر قریب کھڑے جوئیئر کو مخاطب کر کے بولا: "فیوڈ سو تو جب ہماری تخلیق کردہ اس زمین کا شہر سے رابطہ ہوگا اور دنیا بھر کے مسافر یہاں سے وہاں اور وہاں سے یہاں آئیں گے تو انسانی عقل پانی پر قائم اس معنوی شہر کا وجود کیسے تسلیم کرے گی۔" فیوڈ موتو نے عقیدت سے آنکھیں جھکا کر کہا "سر کا انسانی ایئر پورٹ انسانی زندگی کے عظیم معجزوں میں سے عظیم ترین معجزہ ہے۔"

اور پھر بحری، سینٹ اور تارکول سے تخلیق کردہ خشکی کے اس ٹکڑے پر ایئر پورٹ کی تعمیر شروع ہو گئی، لاؤنج بنائے گئے، برآمدے بنائے گئے، رہنمونت اور بنگلہ آفسز بنائے گئے، کارگو کے گودام اور ٹیکسی سٹینڈ بنائے گئے، آگ بجھانے کے سنٹرز اور سمندری طوفان سے بچاؤ کے لیے حفاظتی بند ہاندھے گئے، ڈزلوں سے حفاظت کے لیے خصوصی نظام تشکیل دیئے گئے، جہازوں کو سمندری ہواؤں، بردباری اور بارش سے بچانے کے لیے خصوصی شیڈ بنائے گئے، جب یہ سب کچھ مکمل ہو گیا تو اسے "موٹروے" اور ریلوے کے خصوصی نظام کے ذریعے شہر سے ملا دیا گیا اور اب دنیا کے اس عجیب و غریب ایئر پورٹ پر بیک وقت ۴۱ طیارے "پارک" ہو سکتے ہیں۔ (اسلام آباد ایئر پورٹ جبکہ کراچی ایئر پورٹ پر ۴۴ طیاروں کی پارکنگ کی گنجائش ہے)۔ دنیا بھر سے ایک لاکھ مسافر روزانہ آ اور جاسکتے ہیں جبکہ اوسا کا شہر کے کسی بھی کونے سے ریل کے ڈبے، بس یا ٹیکسی کے ذریعے کوئی بھی شخص ۳۰ منٹ میں کا انسانی ایئر پورٹ کے گیٹ پر پہنچ سکتا ہے۔

۱۹۹۴ء میں جب یہ ایئر پورٹ مسافروں کے لیے کھولا گیا، تو پہلی امریکی فلائٹ سے اوسا کا پہنچنے والے مسافروں نے منصوبے کے "خائق" سے ملنے کی آرزو کی۔ پراجیکٹ منیجر مسکرا کر بولا: "آؤ میرے پیچھے آؤ" حیرت زدہ امریکی اس زرد رو جاپانی کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ منیجر انہیں رن وے کی دیوار کے قریب

لے گیا جہاں ایک پست قدم زدو جاپانی سر پر آہنی ٹوپی رکھے کام کا جائزہ لے رہا تھا۔ میجر نے تالی بجا کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا اور ہجوم کی طرف اشارہ کر کے کہا: ”یہ لوگ آپ سے ملنے آئے ہیں۔“ اس نے خوش دلی سے سر سے آہنی ٹوپی اتار کر جاپانی لہجے میں پوچھا: ”میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟“ ایک امریکی نے آگے بڑھ کر تعارف کرایا: ”میں پیشے کے لحاظ سے صحافی ہوں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں آپ نے پرائیکٹ کتنے عرصے میں مکمل کیا۔“ جاپانی انجینئر عجز سے جھکا، پھر سیدھا ہوا اور گردن اکڑا کر بولا: ”سکس ایئرڈ“ ”اوہ نو۔“ ہجوم کے منہ سے سسکی نکلی۔

”لیکن آپ نے یہ کیا کیسے؟“ ایک امریکی خاتون بولی: ”ویری سہیل۔“ انجینئر مسکرا کر بولا: ”ویری سہیل“ اس نے شہادت کی انگلی سے اپنی کینفی پر دستک دی اور بولا: ”اس سے۔“ پھر شہادت کی انگلی اٹھانی پچھل کھول کر ہوا میں لہرایا اور پھر بولا: ”اور اس سے۔“ تھوڑا سا توقف کیا اور پھر ہجوم پر نظریں جما کر بولا: ”دنیا کے سارے معجزے انہی دونوں جگہوں میں چھپے ہیں۔ خواتین و حضرات اگر آپ جاپانی قوم سے کہیں تو وہ چھ برس میں آپ کے سامنے ایک نیا اٹالیہ کھڑا کر سکتی ہے۔“ ساتھ ہی اس نے دوبارہ ہوا میں پچھل لہرایا اور کہا: ”کیونکہ اس کا یہ“ پھر ہاتھ تہہ کر کے شہادت کی انگلی سے کینفی پر دستک دی اور بولا: ”اور اس کا یہ، دونوں کام کرتے ہیں۔“

جونہی میں فیض آباد فلائی اور پر پہنچا، ایک ٹھکے کے ساتھ چاروں بائزرکنڈے میں گھرے، میں سیٹ سے اچھلا اور میرا سر گاڑی کی چھت سے جا ٹکرایا، ساتھ ہی آنکھوں میں تارے چمکنے لگے، میں نے فوراً بریک لگائی چرچاہٹ کی آوازیں اٹھیں اور میں نیم بے ہوشی کے عالم میں سنیزنگ پر گر گیا، میرے ساتھ بیٹھے آفتاب نے میرے گال چھپتھپائے۔ میرے کندھوں کو جھٹکے دیئے، میرا سر سہلایا تو میں نے آنکھیں کھول کر ایک لمبا سانس لیا اور پھر آفتاب کو مخاطب کر کے کہا: ”چودھری میں چوٹ سے نہیں بلکہ یہ سوچ کر بے ہوش ہوا ہوں کہ ایک قوم چھ برس میں سمندر پر خشکی اگا دیتی ہے، لیکن دوسری قوم، جو تعداد اور عقل میں اس سے کئی گنا بڑی ہے ساڑھے چھ برس میں ایک فلائی اور مکمل نہیں کر سکتی، آخر کیوں؟“ آفتاب نے ایک طویل تہجد لگایا اور پھر شہادت کی انگلی سے کینفی پر دستک دے کر بولا: ”کیونکہ اس کا یہ“ ساتھ ہی ہاتھ کھول کر پچھل لہرایا اور بولا: ”اس کا یہ کام نہیں کرتا۔“ میں نے چابی ہتھما کر گاڑی شارٹ کی ایکسیلیٹر پر ہلکا سا دباؤ ڈالا اور جاپانی گاڑی آہستہ آہستہ سرکے لگی۔ میں نے دایاں ہاتھ سنیزنگ سے اٹھایا اور ہتھیلی سے دل کی جگہ چھپتا کر بولا: ”نہیں چودھری آفتاب اس کا صرف یہ کام نہیں کرتا۔“

ہاں جس قوم کے سینے میں دل نہیں ہوتا اس کی عقل اور اس کے ہاتھوں میں معجزے نہیں ہوتے۔



نگے پاؤں

میری بیوی اس فیصلے کی تشبیہ نہیں چاہتی، اس کا کہنا ہے اظہار سے نیکیاں برباد ہو جاتی ہیں، انسان کو نیت کا پھل نہیں ملتا لیکن مجھے اس سے اتفاق نہیں کیونکہ میری ناقص رائے میں نیکیاں دو قسم کی ہوتی ہیں، ایک وہ جو کسی خاص شخص یا ادارے سے متعلق ہوں، دوسری وہ جو پورے معاشرے پر اثر انداز ہوتی ہیں، پہلی قسم کی نیکیاں یقیناً پوشیدہ دینی چائیس کہ ان کے اظہار سے خدا کے بندوں کی عزت لفس پر زو پڑتی ہے جبکہ دوسری قسم کی نیکیاں چھپائے رکھنا ”گمنام“ ہے کیونکہ یہ تو چھوٹے موٹے احساسات، جذبات اور بھٹک پڑنے والے لمبے ہوتے ہیں جو پورے معاشرے کا مزاج طے کرتے ہیں، ایک چراغ سے دوسرا چراغ جلاتے ہیں، ایک پھول سے دوسرا پھول کھلاتے ہیں، اگر یہ جذبہ ہے یہ اتسوا و احساس سے بچنے کے لیے کچھ بھی بیوقوف نہیں دیک کر رہ جائیں تو شاید معاشرے میں نیکی کی نمود رک جائے، معاشرے میں بے حسی بڑھ جائے اصلاح احوال کی تحریک دم توڑ جائے، لیکن میری بیوی کو میرے اس فلسفے سے اتفاق نہیں۔

کل اسلام آباد کا ایک گرم دن تھا، سورج کی شعاعیں تیر کی طرح جسم میں اتر رہی تھیں۔ پسینہ سانپ کی طرح چوٹی سے ٹکڑوں کی طرف رینگ رہا تھا، حلق بارش کو ترستی چٹان کی طرح چٹ رہا تھا اور روح بدن کی گرمی سے تو بے پروا کی بوند کی طرح سسک رہی تھی، میں بیوی بچوں کے ساتھ ہاسٹل کیمپس سے بلیو ایریا کی طرف جا رہا تھا، گاڑی میں چٹچ و پکار اور ہا ہا کار مچی تھی، بیوی شکوہ کر رہی تھی، میں نے گاڑی پارک کرتے ہوئے احتیاط نہیں برتی لہذا آدھ گھنٹے میں گاڑی دوزخ بن گئی، بچے بھی مجھے ہی الزام دے رہے تھے، ان سب کا خیال تھا اس جس، چش اور پسینے کا واحد مجرم میں ہوں کیونکہ میری روایتی سستی سے انہیں ”یہ دن دیکھنا پڑا“ لیکن میں معمول کے مطابق اس احتجاج پر توجہ دیئے بغیر کان لپٹنے گاڑی چلا رہا تھا، جب ہم لوگ شاہراہ فیصل کے اس چوراہے پر پہنچے، جہاں سے ایک سڑک زیر پواخت، دوسری فیصل مسجد اور تیسری بلیو ایریا کی طرف جاتی ہے تو سٹپل ریڈ ہو گیا، ہم بھی دوسری گاڑیوں کے ساتھ رک گئے۔ میں اس فرصت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نشو سے گردن کا پسینہ خشک کرنے لگا، میرے دونوں بچے کچھل سیٹ پر چاکلیٹ کے لیے دست و گریباں تھے جبکہ بیوی اخبار سے ”اسے سی“ کا کام لینے کی کوشش کر رہی تھی، باہر واقعی بہت گرمی تھی۔ یونہی گردن پر نشو

رگڑتے رگڑتے میری نظر سامنے گاڑیوں کی دوسری قطار پر پڑی میرا ہاتھ وہیں رک گیا، نظریں ٹھہر گئیں اور دل حلق میں آ گیا، میرے سامنے، بالکل سامنے ایک بچہ تھا، پانچ ساڑھے برس کا بچہ، میرے بڑے بیٹے کا ہم عمر، ہراس سے زیادہ خوبصورت اور زیادہ پرکشش، لیکن اس میں ایک کی تھی میرے بیٹے کے برعکس اس کے پاؤں میں جوتا نہیں تھا، وہ میرے محسوسات سے لاطعلق پچھلے ہوئے تارکول پر پاؤں رکھتا ہوا ایک گاڑی کے قریب پہنچا، انگلی سے اس کے شیشے پر دستک دی، صاحب کار اس کی طرف متوجہ ہوا تو اس نے بھیک کے لیے دونوں ہاتھ جوڑ دیئے، یقیناً اس لئے اس کی آنکھوں میں بھوک، چہرے پر بے چارگی اور آواز میں رحم کی اپیل ہوگی لیکن میں یہ پورے دھوکے سے نہیں کہہ سکتا کیونکہ میں تو اس کے چہرے کی طرف دیکھ ہی نہیں رہا تھا، میری نظروں کا محور اس کے چھوٹے چھوٹے پاؤں تھے جن پر مٹی، دھول اور میل کے دھبوں کے ساتھ ساتھ پچھلے ہوئے تارکول کے داغ تھے، اس کی انگلیاں سوجھی ہوئی تھیں اور پیروں کے کوبانوں پر خون کی لکیریں رینگ رہی تھیں، وہ نامہربان دہکتی زمین سے بچنے کے لیے کبھی ایزلیوں کے بل کھڑا ہوتا، کبھی بچپوں پر زندہ جسم کا جنازہ اٹھاتا اور کبھی پورے معاشرے کی بے حسی کا بوجھ ٹکڑوں پر ڈال دیتا، لیکن چشم تو پیش ہوتی ہے، آگ تو آگ ہوتی ہے، وہ ایزلیوں کو بھی اتنا ہی جلاتی ہے جتنا بچوں اور ٹکڑوں کو۔

میں نے غور کیا بچہ شیشوں پر دستک دیتا ہے، ہاتھ باندھتا ہے لیکن اس سے پہلے کہ گاڑی سے کوئی جواب آئے، نیزی سے دوسری گاڑی کی طرف بڑھ جاتا ہے، میں نے اندازہ لگایا اس "اقل مکانی" سے یقیناً اس کے پاؤں کو آرام ملتا ہوگا یا ہو سکتا ہے اسے گاڑی "والوں" کے جواب کا ادراک ہو ٹھیک اسی لمحے میری بیوی نے گرمی کی شکایت کی تو میں نے انگلی سے باہر کی طرف اشارہ کر دیا، بیوی نے چونک کر میری طرف دیکھا پھر حیرانی سے اس اشارے کی طرف متوجہ ہوئی تو اس کا ہاتھ بھی رک گیا، آنکھیں پھیل گئیں اور چہرے پر دکھ ٹھاٹھیں مارنے لگا۔

میری بیوی عام بچابی عورتوں کی طرح بڑی دقیق القلب ہے، اسے بھی رونے کے لیے کسی خاص واقعے یا سامنے کی ضرورت نہیں ہوتی، یہ بھی حسب ضرورت ماچس نہ ملنے، ترکاری جل جانے یا استری سے کپڑے خراب ہو جانے پر سارا دن رو سکتی ہے لیکن یہ منظر تو واقعی سامنے سے کم نہیں تھا، اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا، میرے بیٹوں کی جنگ بدستور جاری تھی غالباً چھوٹے نے بڑے کے بال کھینچ لیے تھے جس کے جواب میں وہ زور و شور سے چلا رہا تھا جبکہ چھوٹا دانٹوں سے چاکلیٹ کی بیکنگ پھانسنے میں مصروف تھا، بیوی نے میری طرف دیکھا اور اس کے منہ سے سسکی نکلی "یہ تو ہمارے فیضی جتنا ہے" اور پھر اس کی دونوں آنکھیں "نیا گرا" بن گئیں، میں نے بچے کو بلانے کے لیے ہاتھ باہر نکالا لیکن سگنل گرین ہو چکا تھا پوری کائنات ہارنوں سے گونج اٹھی تھی ٹریفک کی چیونٹی آگے سر کئے لگی اور بچہ دوڑ کر دوسرے سگنل پر کھڑی گاڑیوں میں گم ہو گیا۔

میں نے بیوی سے، ایوان صدر سے شاہراہ دستور کی طرف مڑتے ہوئے کہا "ہم ساری دنیا کے

بچوں کے دکھ دور نہیں کر سکتے، ہم اس ملک کے سارے محروم بچوں کو کپڑے، جوتے اور کھلونے نہیں دے سکتے، ہم اس شہر کے سارے غریب بچوں کی خواہشیں بھی پوری نہیں کر سکتے لیکن اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہم اپنی استطاعت کے مطابق چند بچوں کو چند کھلونوں کے لیے بھی خوش نہیں کر سکتے؟" بیوی نے نشتر سے آنکھیں صاف کیں اور سستے ہوئے لہجے میں پوچھا "کیا مطلب؟" میں نے کہا "ہم ہفتے میں ایک بار ریسٹورنٹ میں کھانا کھاتے ہیں، اگر نہ کھائیں تو کیا مر جائیں گے، ہم ہر مہینے بچوں کے لیے کپڑے خریدتے ہیں، اگر نہیں خریدیں گے تو کیا بچے تنگ رہیں گے؟ ہر تین ماہ بعد نئے جوتے لیتے ہیں اگر نہیں لیں گے تو کیا تنگ پاؤں پھریں گے؟ مہمانوں کے لیے پانچ پانچ ڈشیں تیار کرتے ہیں، اگر ایک آدھ کم ہو جائے تو کیا مہمان بھوکے رہیں گے؟ ہر چھٹی پر "آؤ تنگ" کے لیے جاتے ہیں اگر ایک آؤ تنگ نہیں جائیں گے تو کیا زندگی ختم ہو جائے گی؟ دو ماہ بعد لاہور کا پتھر لگاتے ہیں اگر دو کی بجائے چار ماہ بعد چلے جائیں گے تو کیا حج کا ثواب مارا جائے گا اور روزانہ آٹس کریم کھاتے ہیں اگر ایک دن چھوڑ کر کھالیا کریں گے تو کیا قیامت آجائے گی؟" میری آواز میں خلاف معمول حرارت تھی، بیوی نے صبر سے میری طرف دیکھا اور نفی میں ہلا دیا۔

"ہم ہر ماہ یہ پیسے بچا کر چند بچوں، ہاں چار پانچ ایسے بچوں کو جوتے خرید کر نہیں دے سکتے، انہیں کپڑے، کھلونے، خباہے لے کر نہیں دے سکتے، ان کی فیسیں ادا نہیں کر سکتے؟" میں خاموش ہوا تو میری بیوی کی آنکھیں چمک اٹھیں۔

ہم نے کل سے یہ فیصلہ کیا ہے کہ ہم ہر ماہ اپنی تنخواہ سے ایسے ہی بچوں کے لیے ایک ہزار روپے کے جوتے خریدیں گے، (خواہ جتنے بھی آئیں) انہیں گاڑی میں رکھیں گے اور شہر سے ایسے تین چار بچوں کا انتخاب کر کے یہ جوتے خود اپنے ہاتھوں سے انہیں پہنائیں گے، یہ سلسلہ یہیں نہیں رکے گا جوں جوں ہماری آمدنی میں اضافہ ہوتا جائے گا ہمارے اس "این جی او" کا سائز بھی بڑھتا جائے گا، یہاں تک کہ آئندہ برسوں میں (انشاء اللہ) ہم اس کا دائرہ کار کپڑوں، کھلونوں اور کتابوں تک بڑھا لیں گے۔

یہ سچ ہے کل شب جب ہم میاں بیوی اس فنڈ کی "تفصیل" پر غور کر رہے تھے تو ایسی شبیوں چیزیں ہمارے سامنے آئیں جنہیں ہم ترک کر دیں تو ہمارا "لائف سٹائل" متاثر نہیں ہوگا۔

جب رات کمر کیوں سے اندر آئی اور میں بتیاں جلانے کے لیے اٹھا تو میں نے سوچا اگر اس ملک کے میرے جیسے ہزاروں بلکہ لاکھوں لوگ اپنے اپنے گھر میں ایسے بچوں کے لیے ایک ایک ہزار روپے ماہانہ کا "این جی او" بنالیں تو کیا پھر بھی ہمیں سڑکوں پر تنگے پاؤں چلتے بچے نظر آئیں؟ جواب آیا نہیں! محترم قارئین! اس ہزار میل لمبی مسافت کا آغاز چھ اونچے پاؤں سے ہوتا ہے، آئیے آپ اور میں اس مسافت کا آغاز کر دیں کہ سڑک ہی جائے گا، منزل کبھی نہ کبھی آجی جائے گی۔



ماچس کی تیلی

اس بار میدان پر لالہ موسیٰ جانا ہوا تو ایک بزرگ ملاقات کے لیے تشریف لائے۔ عمر بیک کوئی پچاس بچپن برس ہوگی۔ چہرے پر سفید داڑھی اور بات چیت میں ایک خاص نفاست تھی۔ گفتگو شروع ہوئی تو معلوم ہوا وہ چھ جوان خنیوں کے باپ ہیں۔ جگہ رزق کا شکار ہیں۔ کبھی فوج میں جونیئر آفیسر تھے کسی غلط فہمی کی بنا پر وہاں سے فارغ کر دیے گئے۔ سینئر آفیسر نے ان کی فاکس میں بعض ایسے ریمارکس لکھ دیئے جن کے باعث ان کے بٹایا جات اور فیشن رک گئی اور اب وہ کئی برسوں سے اپنے حق کے لیے اس دروازے سے اس دروازے اور اس دفتر سے اس دفتر مارے مارے بھر رہے ہیں۔ میں نے انہیں مقدور بھر مدد کی یقین دہائی کرائی لیکن انہیں یقین نہ آیا لہذا انہوں نے میرے ساتھ ایک عجیب حرکت کی۔ وہ میرے گھنٹے پر ہاتھ رکھ کر بولے "جاوید صاحب میں آپ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں اگر آئندہ دو ماہ تک مجھے میرا حق نہ ملا تو میں اپنی چھ بچیوں سمیت خود سوزی کر لوں گا۔" ان کے یہ الفاظ میری سماعت پر کتنے گراں گزرے آپ اس کا اندازہ نہیں کر سکتے، میں نے انہیں تو تسلی دے کر جیسے جیسے رخصت کر دیا لیکن خود اندر بیٹھ کر دیر تک وہ وجوہات تلاش کرتا رہا جن کے باعث ہم میں سے ہر شخص عام معمولی سی رکاوٹ اور جھوٹی سے تکلیف پر "جن زب" کی طرح سوچنے لگتا ہے، اپنے دماغ کو گولی سے اڑانے، تیل چھڑک کر خود کو آگ لگانے، بیڑی پر لینے اور زہر پی لینے کے منصوبے بنانے لگتا ہے۔ میں دیر تک سوچتا رہا، آخر ہمارے خون سے وہ جذبے نکل کر کہاں چلے گئے جو انسان کو زندہ رکھتے ہیں جو تکلیفیں برداشت کرنے، دکھ سہنے اور آزمائش پر پورا اترنے کا حوصلہ دیتے ہیں۔

میں نے بہت پہلے طالب علمی کے دور میں روسی مصنف دو سو فسکی کا عظیم شہکار "ایڈیٹ" پڑھا تھا، جب میں گیارہ بارہ سو صفحات کا یہ ضخیم ناول پڑھ چکا تو میں نے اسے دوبارہ پڑھا اور پھر تیسری بار پڑھا اور اس کے بعد اسے اتنی بار پڑھا کہ یہ عمل آج تک جاری ہے۔ دو سو فسکی اور اس کا "ایڈیٹ" دونوں ایک طویل کتاب کے مستحق ہیں کبھی موقع ملا تو اس پر بھی کچھ نہ کچھ لکھوں گا بہر حال یہاں مختصر اس ناول کے ایک چھوٹے سے کردار کا ذکر کر رہا ہوں۔ اس کا نام "ایپولیت" تھا ایپولیت ٹی بی کا مریض تھا، اسے ڈاکٹر چند روز کا مہمان قرار دے دیتے ہیں، وہ بیماری سے اس قدر لاغر ہو چکا ہے کہ اپنی چار پائی پر ڈھیر ہو کر موت کا انتظار کرتا اس کا

مشغلہ بن جاتا ہے، جب وہ اس انتظار سے تھک جاتا تو اپنی کھڑکی کے سامنے کھڑی اونچی عمارت پر پڑنے والے سایوں سے وقت کا تعین کرتا رہتا، یہ ایپولیت مرنے سے پہلے ناول کے ہیرو پرئس میکشن کے نام ساٹھ ستر صفحات کا ایک خط لکھتا ہے، آپ یقین فرمائیں، ایپولیت اپنے اس خط میں زندگی کا جتنا شاندار تجربہ کرتا ہے اتنا عظیم Analysis میں نے آج تک کہیں نہیں پڑھا، اس خط کی چند ایک لائیں تو اتنی امید افزا ہیں کہ انہیں اگر صحرا میں پھینک دیا جائے تو وہاں بھی ہنرہ آگ آئے، ایپولیت کہتا ہے "دوستو! آپ کے پاس زندگی نام کا ایک ایسا ہتھیار ہے جس کی مدد سے آپ اپنی ساری محرومیوں، ساری کیوں کو کامیابیوں میں بدل سکتے ہیں، غریب ہیں تو امیر بن سکتے ہیں، جاہل ہیں تو عالم ہو سکتے ہیں، کمزور ہیں تو پہلوان بن سکتے ہیں، بد صورت ہیں تو خوبصورت ہو سکتے ہیں، لیکن میں وہ بد نصیب ہوں جو خواہش کے باوجود اپنی محرومیوں کو فتح اور اپنی ناکامیوں کو کامیابیوں میں نہیں بدل سکتا کیونکہ میرے پاس زندگی ہی نہیں۔"

اگر اپنے حواس میں رہ کر دیکھا جائے اور اپنے آپ کو مخاطب کر کے پوچھا جائے کہ جب اللہ نے ایک شخص کو زندگی سے نوازا رکھا ہے، اسے صحت دے رکھی ہے، اس کے پیچھے پورا سانس لیتے ہیں، اس کی رگوں کا خون پورا سفر طے کرتا ہے، اس کے ہاتھوں میں طاقت اور اس کے بدن میں چستی ہے لیکن اس کے باوجود وہ غموں سے بھرا ہے، کیوں؟ وہ اپنی محرومی، اپنی ناکامی اور اپنی کمی کا حوصلے، تدبیر اور عنایت سے مقابلہ کرنے کی بجائے جل مرنے، پھاٹک لگا دینے اور زہر پی لینے کے منصوبے کیوں بناتا ہے۔ تو ہمارے حواس ہمارا باطن کیا جواب دے گا؟ میرا خیال ہے میرے یہ بزرگ اور ان جیسے دوسرے ہزاروں لاکھوں "جن ذریعہ" اگر اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے صرف ایک لمحے کے لیے اپنے ارد گرد آبادان لوگوں پر ایک نظر ڈال لیں جو چند برس پہلے تک کچھ نہیں تھے لیکن انہوں نے اپنی کوششوں سے دنوں میں اپنے حالات کو پچھلا کر ایسے سانچے میں ڈھال لیا کہ اب ان کا شمار کروڑ پتیوں میں ہوتا ہے، لوگ ان کے لیے جھک کر دروازہ کھولتے ہیں، ان کے احرام میں کھڑے رہتے ہیں تو شاید وہ واپس زندگی کی طرف لوٹ جائیں، میری اپنی زندگی میں ایسے درجنوں لوگ ہیں، جنہوں نے سفر کا آغاز بڑھی، خواہنے، تھڑے یا پھیری سے کیا لیکن چند ہی برسوں میں وہ کئی کئی پلازوں، فیکٹریوں اور ملوں کے مالک بن گئے، ذرا سوچنے پر یہ لوگ اگر برے وقتوں میں مایوس ہو جاتے تو ان کا مستقبل کیا ہوتا، تیلی کی دو بوتلیں، ماچس کی ایک تیلی، ہسپتال کا ایک کمرہ، کچھ چھین اور بھدردی کے چند بول لیکن انہوں نے ماچس کی تیلی کی بجائے اس راستے کا انتخاب کیا جس میں زندگی تھی، جو اصل اور سیدھا راستہ تھا۔

اگر ہم زندہ ہیں تو یہ ہمارے لیے خدا کی طرف سے ایک کھلا اور واضح پیغام ہے کہ ہم زندگی کے بل سے اس کیاری میں اپنی پسند کے پھول اگانے کی پوری صلاحیت رکھتے ہیں بس اس کے لیے ذرا سی مشقت درکار ہے، پوچھنے والے نے پوچھا "اللہ کے نزدیک کتنے گناہ ناقابل معافی ہیں۔" بتانے والے نے بتایا "وہ"

پوچھنے والے نے پوچھا "یا رسول اللہ ﷺ کون کون سے؟" حبیب خدا ﷺ نے فرمایا "کسی دوسرے کو خدا کی ذات میں شریک کرنا اور نا امید ہونا۔"

میرا ذاتی خیال ہے اگر دل میں زندہ رہنے کی امید قائم ہو تو سمندر میں تیرتے بچکے بھی جہاز کا کام دیتے ہیں لیکن دل اگر مایوس ہونے کا فیصلہ کر چکا ہو تو پھر ان نکلن کو مایوس کی تیلی بننے دیر نہیں لگتی اور اگر انسان ایک بار مایوس کی تیلیوں کی تلاش میں نکل کھڑا ہو تو پھر نائی نینک جیسے انسان بھی ساحل سے سینکڑوں میل دور خشکی پر ڈوب جاتے ہیں۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

محبت اور آزادی

آخر میں شاہ جی بولے:

"یہ جنوری کی ایک سب سے تاریک رات تھی کائنات کی ہر چیز منجمد ہو چکی تھی، برفوں کی سرد لہریں، سمندر کی ٹمکن ہوا، عروسی اہلاد کی مدھم روشنیاں، سب کچھ کی چادر اوڑھے ہوئے تھی، اس سب کے خلاف کی سردی میں میرے سمجھنے نے مجھے حکم دیا کیپٹن ضمیر۔"

"ایک منٹ، ایک منٹ شاہ جی۔" اقبال نے اپنی روایتی بے چینی سے شاہ جی کو ٹوک دیا۔ ہم نے اسے گھور کر دیکھا، وہ کھسیاتا سا ہو کر بولا "بھئی ایک سوال ہے بعد میں بھول جاؤں گا۔"

"پوچھیں، پوچھیں، پوچھیں، پوچھیں۔" شاہ جی نے پچکار کر کہا، "شاہ جی یہ کس سن کی بات ہے؟" اقبال نے سوال داغ کر ہم سب کو فاتحانہ نظروں سے دیکھا: "میرے بچے یہ ۴۷ء کی جنوری کی بات ہے پاکستان بننے سے پہلے کی سردیاں، ہماری یونٹ تازہ تازہ کراچی آئی تھی، اس وقت کراچی اتنا بڑا شہر نہیں تھا چند سڑکیں۔" شاہ جی اصل واقعہ بھول کر کراچی کے جغرافیے پر الجھ گئے لیکن اس سے قبل کہ بات ہاتھ سے نکل جاتی، خان صاحب نے ان کے چہرے کے سامنے ہاتھ لہرا کر کہا "شاہ جی، شاہ جی، پھر سمجھنے آپ کو کیا حکم دیا؟" شاہ جی چونک کر رکے، خان صاحب کو گھور کر دیکھا، پھر ذرا اونچی آواز میں بولے "کون سمجھ؟" خان صاحب گزبڑا گئے، میں نے فوراً شاہ جی کو یاد دلایا "آپ جنوری کی سب سے تاریک رات کا قصہ سن رہے تھے۔" شاہ جی نے اپنے پوئلے منہ پر ہاتھ رکھا اور کھی کھی کر کے ہنستے چلے گئے، ہم سر جھکا کر بیٹھ گئے، وہ رکے، میں ٹینک کے وینٹیشنوں سے جھانک کر دیکھا اور بولے "لو، بھگو میں کہاں کی بات کہاں لے گیا، بڑھا پا ہے نا بھائیو! معاف کرنا، ہاں تو میں کہہ رہا تھا، سمجھنے نے مجھے حکم دیا، کیپٹن ضمیر تم ابھی جاؤ اور میجر جنرل پنڈت کو یہ چٹھی دے آؤ، ان دنوں پاکستان اور بھارت کی فوج برٹش آرمی کھلاتی تھی اور اس کے بڑے افسر انگریز ہوتے تھے۔ بہر حال تم میری بات سمجھ رہے ہوتا؟" شاہ جی نے رک کر ہماری طرف دیکھا، ہم نے فوراً گردن ہلا کر تائید کر دی "ہوں" انہوں نے اطمینان سے بنگارہ بھرا "ابھی میں اس کڑا کے دائرہ سردی میں جیب پر نکل کھڑا ہوا، جنرل پنڈت کا گھر بہت دور تھا مجھے پورے ۴۵ منٹ ڈرائیو کرنا پڑی، بہر حال قصہ مختصر، میں آخر کار غصہ مٹا ہوا جنرل کے گھر پہنچ

گیا، وہاں ہو کا عالم تھا، سٹریٹ لائٹس کا رواج تھا نہیں، سردی اس قدر تھی کہ دربان کا امکان بھی مفقود تھا۔ بس وہاں میں تھا اور جزل کا ریچھ جتنا اونچا کتا، جو سامنے کھڑا مجھے گھور رہا تھا، میں جونہی پاؤں نیچے رکھتا وہ "ہوں" کر کے مجھے پاؤں واپس اٹھا لینے پر مجبور کر دیتا، تم لوگ پور تو نہیں ہو رہے۔" شاہ جی نے ایک بار پھر رک کر پوچھا:

"نہیں، نہیں، ہرگز نہیں۔" ہم بیک آواز بولے "چلو پھر ٹھیک ہے۔" شاہ جی نے اطمینان سے گردن ہلاتی "بہر حال بھائیو میں نے کتے کو بھگانے کے سوچتے کئے لیکن وہ بس سے مس نہ ہوا، ہوتا بھی کیوں آخر انگریز جرنیل کا کتا تھا، میں نے رنج ہو کر ہارن بجانا شروع کر دیا، یہ تھک کار آمد ثابت ہوا، صاحب کے سرونٹ کو ارثر سے ان کا دیسی بٹر دھوتی سنبھال ہوا نکلا اور "ٹائی، ٹائی" پکارتا ہوا ہر آگیا۔ میں نے اسے جھٹی دکھا کر جزل سے ملنے کی درخواست کی، اس نے میرے کندھے کے پھول دیکھے، ایک ادھورا سلیوٹ کیا اور "ٹائی" کو ساتھ لے کر اندر چلا گیا، میں جب سے اتر اور لیفٹ رائٹ، لیفٹ رائٹ کرتا ہوا رہا کٹی ایریج کے سامنے کھڑا ہوا۔" شاہ جی ایک لمحے کے لیے پھر رکے ہمیں دیکھا اور استقبالیہ انداز میں بولے: "تمہیں پتا ہے میں اس سردی میں وہاں کتنی دیر کھڑا رہا؟" ہم نے فوراً گردن لگی میں ہلا دی "ہوں" شاہ جی نے ہنکار بھرا "پورے ۳۵ منٹ جنٹلمین، تمہاری فائیو منٹس، اس ہڈیوں میں سرمایت کر جانے والی سردی میں کھڑا رہا، میں کیپٹن خمیر، اس دوران گورڈ جزل باہر آئے کی تیاری کرتا رہا، اس نے جراثیم پھینکیں، زیر جامہ پہنا، کپڑے پہنے، گرم کوٹ چڑھایا، گردن کے گرد منظر لپیٹا اور پھر ذرا سادہ وازہ کھول کر پوچھا: "وٹ از دی میٹر کیپٹن" میں نے ایڑھیاں بجا کر کہا "بیر از اسے لیٹر فار یوسر" گورے جزل نے بغیر کچھ کہے سے ایک ہاتھ باہر نکالا، میں نے جھک کر ٹخافہ اس کی طرف بڑھا دیا، اس نے خطا چک کر دروازہ بند کیا اور میں لکڑی کے بند کواڑوں کو سلیوٹ کر کے واپس آگیا۔" شاہ جی خاموش ہو گئے، ہم سب ٹھوڑیاں تھیلیوں پر بجا کر بیٹھے رہے، وہ چند لمحوں تک ہمیں گھورتے رہے، پھر رنج ہو کر بولے: "تمہیں پتا ہے اس جرنیل نے مجھے اندر آنے کی آفر کیوں نہیں کی، کیوں اس ہڈیوں میں اترنے والی سردی سے چائے کے ایک کپ تک کی پیشکش نہیں کی؟" ہم نے فوراً گردن ہلا دی، شاہ جی نے ایک لمبا اور خنڈا سانس لیا "ہاں تم اندازہ کر ہی نہیں سکتے۔" وہ رک کر بولے: "اس لیے میرے بچو کہ میں غلام تھا اور غلاموں کو گھروں میں گھسنے کی اجازت نہیں دی جاتی، چائے، کافی سرو نہیں کی جاتی، ان کے لیے بھٹکیں نہیں کھولی جاتیں۔" شاہ جی نے گہرے دکھ سے آنکھیں میچ لیں۔

"پر شاہ جی۔۔۔" میں نے گلوگیر لہجے میں ان کی توجہ ہٹانے کی کوشش کی، انہیں کرنٹ سالنگا اور وہ پوری آنکھیں کھول کر بولے: "نہیں ابھی یہ کہانی ادھوری ہے، اس کا آخری حصہ تو ابھی سنانا باقی ہے۔" انہوں نے سر جھٹک کر دکھ بھگانے کی کوشش کی، جب ناکام رہے تو اسی زہریلے لہجے میں بولے: "اس جنوری میں جب میں امریکہ سے لوٹا تو ایئر پورٹ پر مجھے میرے بریگیڈ تیر بیٹے نے ریسو کیا، میں اس کے ساتھ سرکاری

جیب میں بیٹھ گیا، ہم نے ہاتھ شروع کر دیں، جیب چلتی رہی، چلتی رہی، جب رکی تو میں حیران ہو گیا کیونکہ میں جزل پتھر کے اسی گھر کے سامنے کھڑا تھا، جہاں میں ۵۱ برس پہلے سخت سردی میں ٹھہرتا رہا تھا، سامنے میری بہو، میرے پوتے پوتیاں کھڑے تھے، ہاں میرے بچہ تم لقیں کرو میں نے اپنے بچوں کے ساتھ برآمدے میں پاؤں رکھے، وہاں سے دروازہ عبور کیا، اندر گھن میں آیا، ایک ایک کمرہ پھر کر دیکھا، پورے اعتماد کے ساتھ ہر چیز چھو کر دیکھی، لیکن مجھے کہیں خوف، مروجیت اور کسری کا احساس نہیں ہوا، میرے دل کی دھڑکنیں بے قابو نہیں ہوئیں، میری کتینوں میں آگ نہیں لگی، میرے ہاتھوں میں پسینہ نہیں آیا، میری گردن نہیں جھکی، میری پٹلیں نہیں کانپیں۔ ”شاہ جی رکے، ہمیں دیکھا اور پھر ہنس کر بولے: ”میرے بچو! ایسا کیوں ہوا، صرف اس لیے کہ اب میں برٹش آرمی کا ایک غلام کپتین نہیں تھا، پاک آرمی کے ایک بریگیڈیئر کا باپ تھا اور ہاں تم لوگ پوچھ رہے تھے اس آزادی نے ہمیں کیا دیا؟ تو میرے بچو! اس آزادی نے ہمیں آقاؤں کے برآمدوں پر چڑھنے کا حوصلہ دیا۔ ”شاہ جی پھر رکے، چند لمحوں تک کچھ سوچا اور پھر نسبتاً اونچی آواز میں بولے: ”پر یار تم لوگوں کا بھی کوئی قصور نہیں، یہ آزادی کم بخت ہوتی ایسی ہے، جتنی بھی ہو کم لگتی ہے، جو محبت اور جو آزادی انسان کو قناعت سکھا دے، اسے محض دو رہنے، صابر رہنے پر مجبور کر دے، وہ محبت ہی کب ہوتی ہے، وہ آزادی ہی کب ہوتی ہے۔ یارو! تم لوگ جو آزادی پر شاکی ہو، یہی تو اس کے آزاد ہونے کی نشانی ہے، کبھی غلاموں نے بھی کہا ہے: ”اس آزادی نے ہمیں کیا دیا؟“

Kashif Azad @ Onalirad.com

(نوٹ:- اس کالم کے شاہ جی معروف شاعر اور ادیب سید حمیر جعفری مرحوم ہیں، خان صاحب خوشنود علی خان اور اقبال جین الاقوی شہرت یافتہ ماہر اقتصادیات اقبال لطیف ہیں۔)



ہیلپ می گاڈ

وہ چھاتی کے کینسر میں مبتلا تھی اور ڈاکٹروں نے اسے لاعلاج قرار دے دیا تھا۔
سسر سرج رائونڈ سے ذرا پہلے آکر پردہ کھینچتی تو نرم، سنہری اور متنا کے گرم احساس جیسی دھوپ اس کے پیٹوں پر دستک دیتی، چمکیں لرزتی ہیں اور نیلے بلور دیدوں کی حیرت کمرے میں بکھر جاتی۔ "یہ آنکھیں کتنی خوبصورت تھیں۔" وہ سوچتی: "نیل، چمکدار، میس" سینے کا درد انگڑائی لیتا اور وہ ایک اذیت ناک "اف" کے ساتھ آنکھیں بند کر لیتی، جس کے ساتھ ہی سارا منظر اندھا ہو جاتا، لیکن نہیں، کچھ منظر تو اس کے اندر بھی تھے، ایسے منظر جو صرف آنکھیں بند ہونے کے بعد ہی دکھائی دیتے تھے۔ ان میں پال تھا، جوزف پال، اس کا فرست ہوائے قریب۔ وہ ایک اس کے کان پر جھک کر کہتا "کیتھی، شہزادی آنکھیں بہت خوبصورت ہیں، نیل چمکدار اور گہری۔" پال کے مضبوط بازوؤں پر ناخن گاڑ کر وہ چلاتی "بکواس" اور پال تہتہ لگا۔ اس کی ٹھوکی ٹھوکی چٹکی میں دبا ہوا اور کہتا: "کیتھی، ڈارلنگ، ڈارلنگ یہ آنکھیں نہیں ہیں، دودھ کے سمندر میں نیلی جھاگ کے جزیرے ہیں۔"

انہی منظر میں ایک منظر سینٹ لوئیس کے پھولوں کا ہے، ہوا جن سے گزرتے ہوئے سرسراہتی تھی اور جب یہ ہوا اس کی کھڑکی پر دستک دیتی تو کمرے میں خوشبو ذریعے ڈال دیتی۔ اس کا فلیٹ بھی خوشبو کے رخ پر تھا۔ ادھر سے آئے یا ادھر سے، ہوا خوشبو کی خیرات دیئے بغیر جا نہیں سکتی۔ ایک اور منظر بھی تھا، سینٹ لوئیس کے ڈسکو..... کتنے لوگ تھے جو چند لمحوں کے رقص کے لیے ساری شام اس کا انتظار کرتے۔ ان میں جیری بھی تھا، جو کہتا تھا: "کیتھی، جب تک تم گلاس میں انگلی نہ ڈبو دو، وائن پانی لگتی ہے۔"

اور ان منظر میں،..... وہ رکتی، ایک طویل اور اذیت ناک سانس کھینچتی اور سینے پر کراس بنا کر سوچتی، نہیں کینسر کی ایک ایسی مرید کو، جو چند دنوں کی مہمان ہو، یہ سب نہیں سوچنا چاہیے۔ "ہیلپ می گاڈ" وہ سسکاری بھرتی اور ذہن کے پردے پر ایک باریک سا نقطہ ابھرتا، وہ اسے دیکھتی، غور سے دیکھتی تو نقطہ پھیلنے لگتا۔ گیند بن جاتا، پھر اس گیند پر آنکھیں نہیں، آنکھوں کے گرد جلد کے پھنوس اٹھتے، پھر ایک ٹکٹی ہوئی ناک ظاہر ہوتی، ناک کے نیچے سڑکا چھوڑنا سا دھانا ابھرتا تو وہ چلاتی "مگرینڈ ما آپ" اور یہ بوڑھی نانی کے خیال کی

سکمرانی ہوتی۔ وہ نانی سے اکثر پوچھتی تھی "مام آپ چکے چکے کیا پڑھتی رہتی ہیں؟" نانی کی آنکھوں کے منہ پر مہرے ہو جاتے، ہونٹ لٹک جاتے اور موم کی ناک لرزے لگتی۔ وہ مسکراتی اور کہتی: "میرے بچے خدا کو جب بھی یاد کرو، چکے چکے یاد کرو، اپنے اندر جذب کرتے رہو۔"

وہ حیرت سے پوچھتی: "پر کیوں مام؟" بوڑھی نانی اس کے سر پر ہاتھ پھیرتی ہوئی کہتی: "کیونکہ بچے خدا کی یاد بھی خوراک ہوتی ہے، روح کی خوراک، یہ نہ ملے تو روح بیمار ہو جاتی ہے اور بیمار روحوں والے جسم زیادہ دن صحت مند نہیں رہتے، تم بھی چکے چکے خدا کو یاد کیا کرو، ورنہ کروڑوں لوگوں کی طرح اندر سے گل جاؤ گی۔" پھر وہ سوچتی: "خدا کو کیسے یاد کیا جاتا ہے؟" اس کا ذہن جواب دے جاتا۔ سارے منظر دم توڑ جاتے۔

یہ روز کا معمول تھا۔ ہر آنے والے روز کا معمول، جو اسے موت کے قریب تر لے جا رہا تھا۔
دیکھ کر ایک سر درج، اس نے اپنے آپ سے سوال کیا: "خدا کو کیسے یاد کیا جاتا ہے؟" تو منظر تحلیل نہ ہوا، ذہن لا جواب نہ ہوا، اس نے سوچا "خدا سے مدد مانگنا ہی اسے یاد کرنا ہے۔" "ہیلپ می گاڈ" اور پھر "گاڈ" اس کے ذہن سے ہی چپک گیا، حتیٰ کہ وہ ہر سانس کے ساتھ آسمان سے سفید دودھیا روشنی کی ایک لکیر اترتے دیکھتی اور بے اختیار دہراتی "ہیلپ می گاڈ"

یہ تین لفظ اس نے کتنی بار دہرائے، اسے نہیں یاد۔ بس یاد ہے تو اتنا کہ جب تک جانتی "ہیلپ می گاڈ" کے الفاظ دہرائی چلی جاتی۔ جب سو جاتی تو اس کا دل دہراتا رہتا۔ بالکل اسی طرح جس طرح اس کی نبلی، چمکدار اور عمیق آنکھیں چہرے کا حصہ تھیں، جس طرح تیز دھار ہونٹ اس کے وجود میں شامل تھے، جس طرح وہ اپنے سنہری بالوں کے بغیر ادھوری تھی اور جس طرح وہ اپنی نرم آواز کے بغیر ناکمل تھی۔

مارچ کی اس صبح میڈیکل سائنس کی دنیا دھماکے سے لرز اٹھی۔ سینٹ لوئیس کے اس ہسپتال نے کیتھرائن کو مکمل طور پر صحت یاب قرار دے دیا۔ کیتھرائن ایک ایسی مریدہ جو تین ماہ سے موت کی طرف بھاگ رہی تھی اور جو امید کھو چکی تھی، الوداع کہنے سے پہلے کیتھرائن نے امریکی ڈاکٹروں کو صحت کا نسخہ بتا دیا "ہیلپ می گاڈ" ڈاکٹروں نے حیرت سے پوچھا: "ڈاؤن مین" کیتھرائن نے بتایا: "جب اس نے تین لفظوں کا ورد شروع کیا تو سب سے پہلے اس کا درد ختم ہوا، پھر زخم پر کھرٹہ بنے، پھر کھرٹہ اترے اور آخر میں ایک نئی اور صحت مند جلد نے زخم کے نشان تک مٹا دیے۔ اب میں سیدھی پال کے پاس جاؤں گی۔" اس نے کہا اور پوچھوں گی: "کیا اب بھی میرے چہرے پر نبلی بھاگ کے جڑے ہیں؟"

کیتھرائن نے کیس نے میڈیکل سائنس کو نئی "ڈاؤن مینشن" دے دی، پورے امریکہ میں سروے کیا گیا، پتا چلا، خدا پر مضبوط یقین رکھنے والے سر ایض "نان بیورز" کے مقابلے میں جلد صحت یاب ہو جاتے ہیں، فیصلہ ہوا طبی ماہرین بیورز اور نان بیورز کی مگرانی کریں۔ تین مہینے بعد امریکہ کے تمام ماڈل ہسپتالوں سے موصول ہونے والے نتائج نے کیتھرائن کی تصدیق کر دی جس کے بعد "پازیٹو ٹھنک" کی تعمیر آئی اور دنیا بھر

کے مریضوں کو شفا یابی کی خوشخبری سنا دی گئی۔

وہ جو اس ملک کے مستقبل سے مایوس ہیں، ان سب کی ایک ہی رٹ ہے، یہ ملک نہیں چل سکتا، یہ نوٹ جائے گا، دیوالیہ ہو جائے گا، یہاں خات جنگی ہوگی، خون کی ندیاں بہیں گی، بارود کی بارش ہوگی، سروں کی فصل کئے گی، لوگ دانے دانے کو ترسیں گے، ملک بک جائے گا، بھارت قبضہ کر لے گا تو مجھے کیسی کی کہانی یاد آ جاتی ہے اور میں خود سے سوال کرتا ہوں جب تین سادہ سے لفظ ایک سیکلر سوسائٹی کی سٹریٹ گرل کو موت سے نجات دلا سکتے ہیں تو کیا ۱۴ کروڑ لوگوں کی دعائیں اس ملک کو نہیں بچا سکتیں؟

کیا خدا بے خبر ہے؟

نعموٰہ باللہ، کیا وہ سوراہا ہے؟ کیا اب وہ دعائیں نہیں سنتا؟



Kashif Azad @ OneUrdu.com

مجھے بچائیں

ہاں میں نے ایک گہری اور طویل نیند کے ذریعے یہ تکلیف بھلانے کی کوشش کی، کتابوں کے مورچے میں سر چھپا کر اس خوف سے بچنے کی سعی کی، اپنے آپ سے فرار ہونے کے لیے پشاور کا چکر لگایا، ان تمام دوستوں سے کپ شپ کے لیے گیا جنہیں میں عرصے سے بھول چکا تھا، صبح شام جو گنگ کی لیکن احساسات کی یہ آگ شعلہ نہیں ہوئی۔ بے چینی، بے کلی اور اضطراب کا گراف نیچے نہیں آیا، اندیشوں کے زہریلے ڈنک کندھیں ہوئے، آنکھوں کی ہم خشک نہیں ہوئی۔

کاش بہاولنگر کا درمیانی عمر کا یہ شخص فقط ایک کہانی ہوتا، اس کی کہر سے ماری سروس جیسی بیوی ایک کردار ہوتی، اس کے چھ ساتھی بچے خیالی دنیا کے باسی ہوتے، کاش اس کے پیارے والدین لوہا دار بہن بھائی کسی افسانوی افق کے عیشاتے ستارے ہوتے تو میں، ہاں تو میں یہ داستان کہنے کے بعد خود کو کتنا بکا بھونکا محسوس کرتا، یہ کہانی لکھتے ہوئے، یہ افسانہ "ایجاد" کرتے ہوئے خود کو کتنا معجز سمجھتا، لیکن افسوس یہ شخص کہانی ہے اور نہ ہی اس کی بیوی ایک کردار، اس کے بچے خیالی ہیں اور نہ ہی اس کے والدین افسانوی، بھوک، تنگ، اور سفید پوشی کا بھرم ایک ڈرامہ ہے اور نہ ہی اس کے گلے میں دہلی چھینیں کسی پلاٹ کا حصہ ہیں، یہ ایک تنگی کھردری اور ٹھیکلی حقیقت ہے۔

میں نے ڈاکٹر اقبال سے پوچھا: "ڈاکٹر صاحب آپ کی کہنی کے کتنے براؤچ آفیس ہیں؟" ڈاکٹر نے سینہ پھلا کر جواب دیا: "پاکستان میں نو اور امریکہ میں تین۔" میں نے پوچھا: "اندازاً آپ کا ماہانہ بجٹ کیا ہوگا؟" کاروباری احتیاط سے بولے: "بہی کوئی تین چار کروڑ روپے۔" میں نے پوچھا: "آپ کی فرم کرتی کیا ہے؟" مزید احتیاط سے بولے: "موٹر وے جیسے منصوبوں کے ٹھیکے لیتی ہے۔" میں نے پوچھا: "پھر تو آپ پر اللہ تعالیٰ کا بڑا کرم ہے۔" خوش دلی سے بولے: "ہاں ہاں بہت۔" یہ تو بہت ہی اچھا ہے۔" میں نے انہیں ستائشی نظروں سے دیکھا، انہوں نے تقاریر سے گردن ہلائی۔ "ڈاکٹر صاحب مجھے ایک لاکھ روپے چاہئیں۔" میں مطلب پر آگیا۔ ڈاکٹر صاحب کا رنگ فق ہو گیا۔ چند لمحوں تک مجھے تنگی باندھ کر دیکھتے رہے، پھر چہرے پر مصنوعی سنجیدگی جان کر بولے: "کیوں اچانک اتنی بڑی رقم کی کیا ضرورت پڑ گئی؟" میں نے سائبریا کی بگ بوا

جیسے لہجے میں جواب دیا: "تیرہ افراد کے ایک خاندان کو اجتماعی خودکشی سے بچانا ہے۔" ڈاکٹر کی آنکھوں میں بجلی سی چمکی اور وہ آگے جھک کر بولا: "ذرا تفصیل سے بتاؤ۔" ہاں، کیوں نہیں۔" میں نے اپنے کانپتے ہوئے جسم کو حوصلے کی زنجیروں سے باندھنے کی کوشش کی۔ "بہاؤنگر کا ایک سفید پوش معاشی بد حالی کا شکار ہے، آٹھ سال سے بیروزگار ہے، گھر کی ہر چیز بیک چکی ہے۔ مگر خاندانی شرافت کسی شخص کے سامنے ہاتھ پھیلانے کی اجازت نہیں دیتی، اب وہی راستے ہیں، کوئی صاحب ثروت خاموشی سے کاروبار کے لیے ایک لاکھ روپے قرض حث دے دے یا یہ ۱۳ افراد ہر کھا کر زندگی کے زہریلے تالاب سے باہر آجائیں۔ ڈاکٹر صاحب کیا آپ ان لوگوں کی مدد کریں گے، اس رب، جس نے آپ کو آپ کی استطاعت سے بڑھ کر دیا، کے کرم سے لوگوں کو ان کا حصہ دیں گے؟" ڈاکٹر چند لمحوں تک سر جھکا کر سوچتا رہا، پھر سیدھا ہوا، میری طرف دیکھا اور شرمندہ لہجے میں بولا: "چودھری صاحب مائنڈ نہ کیجیے گا، آج کل ہاتھ ذرا تنگ ہے۔"

میں نے میاں محمود سے پوچھا: "آپ نے بیٹوں سے کتنا لون لے رکھا ہے؟" میاں صاحب گھبرا کر بولے: "لیکن میں تو وقت پر قسطیں ادا کرتا ہوں۔" مجھے فنی آگئی۔ "میں بری نیت سے نہیں پوچھ رہا۔" میاں صاحب نے اطمینان کا سانس لیا۔ "میری کوئی ستر اسی کروڑ روپے۔" مجھے آپ سے کام ہے۔" میں آگے جھکا، وہ ہمدن گوش ہو گئے۔ "آپ ان ستر اسی کروڑ میں سے کسی کو ایک لاکھ روپے قرض دے سکتے ہیں۔" وہ فوراً سیدھے ہو کر بیٹھ گئے، "چودھری صاحب کیوں مذاق کرتے ہیں۔ یقین کریں میرا سارا پیسہ کائن میں پھنسا ہوا ہے، میں تو اپنے بچوں کی فیسیں تک نہیں دے سکتا۔ ایک لاکھ روپے کہاں سے لاؤں گا؟"

میں نے ایک وفاقی وزیر سے پوچھا: "معاشی صورتحال کیا ہے؟" قہقہہ لگا کر بولا: "وزیر اعظم سعودی عرب جا رہے ہیں، کچھ نہ کچھ لے کر ہی آئیں گے۔" میں نے قہقہہ ختم ہوتے ہی کہا: "کیا خزانے میں ایک لاکھ روپے بھی نہیں؟" پھر قہقہہ لگا کر بولے: "خیر ہماری حکومت اتنی بھی گلی گزری نہیں۔" رکے، چونک کر میری طرف دیکھا اور پھر سنجیدگی سے بولے: "پر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟" میں نے فوراً مدعا بیان کر دیا۔ بولے: "جاوید یقین کرو اگر تم کہو تو میں دو لاکھ کی منظوری دے دیتا ہوں، لیکن اس منظوری سے چیک بننے تک اتنے مراحل ہیں کہ شاید وہ خاندان پیسوں کی آس ہی میں گزر جائے۔" میرا خون کھول اٹھا: "پھر یہ لوگ کیا کریں؟" وفاقی وزیر تھوڑے سے گھبرائے، چند لمحوں تک آگے پیچھے دیکھا پھر مدغم لہجے میں بولے: "جاوید میں اپنے دوست احباب سے بات کرتا ہوں، انشاء اللہ چند روز میں کچھ نہ کچھ ہو جائے گا، تم فکر نہ کرو۔" اور میں بے فکر ہو کر واپس آ گیا، لیکن اگلے روز وہ وفاقی وزیر غیر ملکی دورے پر روانہ ہو گئے۔

میں نے لاہور میں اپنے تاجر دوستوں سے رابطہ کیا، ادھر اسلام آباد میں بیوا میریا کے سینھوں سے بات کی، بلوچستان کے چند سرداروں کو فون کئے، چودھری شجاعت کے آفس پیغام چھوڑا، لیکن سب کے پیسے کائن میں پھنسے ہوتے ہیں، سب کے ہاتھ تنگ ہیں، سب اس نظام کے "کل آچکے" سے تنگ ہیں، سب اپنے

اپنے دوست احباب سے بات کر رہے ہیں اور میں ہاں، ادھر میں گہری اور طویل نیند کے ذریعے اپنی تکلیف بھلانے کی کوشش کر رہا ہوں، کتابوں کے مورچے میں سر دیے لیٹا ہوں، شہر سے باہر بھاگ کر جاتا ہوں، گپ شپ کے لیے دوستوں کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہوں، صبح و شام جو گنگ کرتا ہوں، لیکن آگ ہے کہ خنڈی ہی نہیں ہوتی، بے چینی، بے کچی اور اضطراب چچھا ہی نہیں چھوڑتا، اندیشوں کے زہریلے ڈنک بیٹھنے ہی نہیں دیتے اور آنکھوں کی سیم خشک ہی نہیں ہوتی۔

مجھے یوں محسوس ہوتا ہے، ان ۱۳ افراد کے کنبے سے پہلے میں مر جاؤں گا..... اگر اس معاشرے میں ابھی کچھ لوگ زندہ ہیں تو خدا کے لیے مجھے بچائیں۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

تھینک یو ملک صاحب!

آج اتوار ہے اور میں اتوار کو عموماً کالم نہیں لکھتا، اس کی ایک ہی وجہ ہے اور وہ ہے میرے بچے۔ ہم نے (میں نے اور میرے بچوں نے) آپس میں ایک ”ایم او یو“ کر رکھا ہے وہ مجھے ہفتے کے چھ دن اسٹریب نہیں کرتے۔ میرے کانڈ، میری کتابیں اور میری جنسلیں نہیں چھیڑتے، میرے ساتھ مارکیٹ جانے، کوئی چیز خریدنے اور کسی کے گھر جانے کی ضد نہیں کرتے۔ جس کے جواب میں میں اس ”حسن سلوک“ پر انہیں اتوار کا پورا دن دیتا ہوں۔ صبح اٹھ کر شیو نہیں کرتا، کالم نہیں لکھتا، اخباروں کو ہاتھ نہیں لگاتا، دفتر نہیں جاتا، کسی کو فون نہیں کرتا، کسی سے ملنے نہیں جاتا، بس ان کے ساتھ کرکٹ کھیلتا ہوں، انہیں کہانیاں سناتا ہوں، ان کے ساتھ جوگنگ کرتا ہوں، دھیرہ دھیرہ۔

میرے بچے بڑی حد تک اس سمجھوتے پر قائم ہیں البتہ مجھ سے کبھی بھارو وعدہ خلافی ہو جاتی ہے، تاہم وہ میری بھول چوک پر مجھے معاف کر دیتے ہیں لیکن ایک بات ملے ہے کہ میں اس سمجھوتے کے احترام میں اتوار کو کالم نہیں لکھتا۔

مگر آج ایک ایسا واقعہ پیش آیا، جس نے مجھے یہ توڑنے پر مجبور کر دیا لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اس وعدہ خلافی پر میرے ضمیر پر کوئی بوجھ ہے اور نہ میرے بچے دل گرفتہ، بلکہ اگر دیکھا جائے تو یہ کالم تو مجھ سے لکھوایا ہی میرے بچوں نے ہے، کانڈ میری بیوی نے لا کر دیئے، چنل میرا بڑا بیٹا لایا اور چائے کے کپ میرا چھوٹا بیٹا لاتا رہا، یوں ہم سب مل کر اس وعدہ خلافی میں شریک ہو گئے۔

یہ کالم ”مجھے بچائیں“ کا رد عمل ہے، میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ جس شخص کو اکثر اقبال اور میاں محمود سمیت نصف درجن دوستوں سے سوائے مایوسی، دل گرہلی اور توہین کے کچھ نہیں ملا، اسے یوں بیسیوں لوگ اتنی عزت اتنی توقیر بخشیں گے، جی ہاں اتوار کی صبح کالم شائع ہونے کے صرف ۲ گھنٹے کے اندر مجھے ۳۰ نیلی فون کا کارموصول ہوئیں، ان میں چھوٹے بچے تھے، گھریلو خواتین تھیں، چھوٹے موٹے دکاندار اور سرکاری ملازمین تھے، چند سماجی تنقیدوں کے کارندے اور ایک آدھ بیکار تھا۔

ان سب کا کہنا تھا، ہم بہاؤنگر کے اس خاندان کی مدد کرنا چاہتے ہیں، کچھ نے زیورات کی پیشکش

کی، چند ایک نے سونہرے سانگے، فی دی اور فریج بیچنے کے عزم کا اظہار کیا، ایک صاحب نے چھ ماہ کی بچت جمع کرانے کی آفر کی لیکن میں نے ان تمام خواتین و حضرات کی پیشکش قبول کرنے سے معذرت کر لی کیونکہ اس میں دور کا وہیں تھیں، اول ان لوگوں سے پیسے جمع کون کرے گا، دوم، اس ساری کارروائی میں وقت بہت برباد ہوگا جبکہ اس خاندان کو فوری "ریلیف" کی ضرورت ہے، لہذا میں ان باضمیر لوگوں کے فون نمبر لکھتے ہوئے سوچ رہا تھا، کیا اس ملک میں ایک بھی ایسا صاحب دل والدہ شخص نہیں بچا جو ۱۳ افراد کو موت کے منہ سے نکالنے کے لیے ایک لاکھ روپے "ضائع" کرنے کا حوصلہ رکھتا ہو، یہ سوچ ہو کہ بن کر میرے جسم سے اٹھ رہی تھی۔

صبح نو بجے خوشنود صاحب کا فون آیا، کہنے لگے مجھے ابھی ابھی ملک ریاض نے بنگایا ہے، میں نے پوچھا: "کون ملک ریاض؟" خوشنود صاحب نے بھائی لی "بحریہ ٹاؤن والے ملک ریاض۔" "اچھا!" میں نے بات آگے بڑھائی، خوشنود صاحب نے اسی نیند سے بھرے لہجے میں کہا: "ملک ریاض فون پر رو رہا تھا۔" میں نے پوچھا: "کیوں؟" کہنے لگے: "یہ تو میں تمہیں مل کر بتاؤں گا، بس تم بہانے کے اس خاندان کو اطلاع کرو پنڈی آکر ملک ریاض سے ایک لاکھ روپے لے جائیں اگر وہ یہاں نہیں آسکتے تو شام تک موبائل پر اسے اطلاع کرو، وہ خود ان کے گھر جا کر رقم پہنچا آئے گا۔"

میں نے اطمینان کا سانس لیا۔

آپ یقین فرمائیے میں کبھی ملک ریاض سے نہیں ملا، کبھی ملنے کی خواہش ہی پیدا نہیں ہوئی۔ ہاں، البتہ میں نے خوشنود صاحب سے اس کا ذکر بہت سنا، بالخصوص پاکستانی جیلوں میں بند بنگلہ دیشی قیدیوں کی وطن والہی کے سلسلے میں تو خوشنود صاحب کی زبان ملک ریاض کے تذکرے سے ٹھکتی ہی نہیں تھی لیکن اس کے باوجود اس سے ملاقات کی خواہش پیدا نہ ہو سکی، لیکن آج میرا جی چاہ رہا ہے میں اس شخص سے ملوں، اس کے ہاتھ چوم کر اسے سلوٹ کروں اور کہوں: "خدا کی اس زمین پر صرف انہی لوگوں کو رہنے کا حق ہے، جو اس کی مخلوق پر زندگی کا سفر آسان کرتے ہیں۔" کاش ملک صاحب! آپ جیسے چند لوگ اور بھی ہوں۔"

ہاں، میرے بہانے والے بھائی، مجھے یقین ہے، یہ غیبی مدد تمہارے رزق کے دروازے پر پڑے کے واحد ہمارا شخص سے ملو اور نئے سرے سے زندگی کا سفر شروع کرو، اپنے بیوی بچوں کے لیے رزق جمع کرو، ان کی پرورش کرو، انہیں ملک ریاض بناؤ!

ہاں، میرے بہانے والے بھائی، مجھے یقین ہے، یہ غیبی مدد تمہارے رزق کے دروازے پر پڑے کے لیے چابی ثابت ہوگی۔ میرا رب تم پر کشادگی کے سارے دروازے کھول دے گا، ہاں مجھے یقین ہے یہ ایک لاکھ روپے تمہاری محنت، تمہاری ایمانداری سے ایک کروڑ بننے میں نہیں لگائیں گے، تمہارے بچے پرانے کپڑے، جسمیں نیکسٹل مل کا مالک بنائیں گے، ہاں اگلے بیس برسوں میں تمہارا شمار بھی اس ملک کے متول لوگوں میں ہوگا۔ لیکن جب تم سرمائے کی معراج کو پہنچ جاؤ تو خدا کے لیے اپنے کروڑوں روپے کا فن

میں پھنسا کر نہ بیٹھ جاتا، ہاتھ تنگ ہونے کا شکوہ زبان پر نہ لانا ”اچھا کرتے ہیں۔“ کو اپنی پالیسی نہ بناتا۔ ہاں خدا کے لیے ملک ریاض بننا، ڈاکٹر اقبال اور میاں محمود نہ بننا۔

تھینک یو ملک صاحب! آپ نے مجھے بچا لیا، میری گردن پر آپ کا قرض ہے، آپ میرے محسن ہیں۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

روشنی ہی روشنی

ابھی انقلاب کی چنگاری کو شعلہ بننے میں کچھ وقت تھا۔

شاہ ایران کا ایک جرنیل درویش صفت شہنشاہ کے پاس آیا، تعلیم کی اور روزانوہو کر بیٹھ گیا۔ درویش نے پوچھا: ”کیسے آتا ہوا؟“ جرنیل بولا: ”حضور ایلچی بن کر آیا ہوں۔“ درویش نے کہا: ”جی فرمائیے میں ہر تن گوش ہوں۔“ جرنیل نے سر جھکا کر کہا: ”حضور شاہ ایران نے پیشکش کی ہے اگر آپ ہجرت کر جائیں تو آپ کے ہاں نقد کے لیے ۲ ملین ڈالر پیش کیے جاسکتے ہیں۔“ درویش کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی، اس نے چپکٹی آنکھوں سے جرنیل کو دیکھا اور سرگوشی میں بولا: ”میری طرف سے شاہ کا شکریہ ادا کر دیجیے گا۔“ درویش ایک لمحے کے لیے رکا اور پھر ذرا بلند آواز میں بولا: ”شاہ سے کہیے گا اگر وہ نقل مکانی کر جائیں تو انہیں میں بھی اتنی ہی رقم پیش کروں گا۔“ جرنیل جھکا، آداب کیا اور چلا گیا۔

دوسرے روز ابھی ظہر غنڈی نہیں ہوئی تھی کہ وہی جرنیل واپس آیا اور ہاتھ باندھ کر درویش کے سامنے کھڑا ہو گیا، درویش نے سر اٹھا کر دیکھا، کچھ دیر توقف کیا اور پھر پوچھا: ”شاہ نے آج آپ کو کیا حکم دے کر بھیجا ہے۔“ جرنیل نے کانپتے ہوئے لہجے میں عرض کیا: ”حضور شاہ ایران پوچھتے ہیں اگر ہم یہ پیشکش قبول کر لیں تو آپ ۲ ملین ڈالر کہاں سے لائیں گے؟“ درویش کا چہرہ غصے سے تھما گیا، وہ کھڑا ہوا، شہادت کی انگلی سے جرنیل کی ٹھوڑی اوپر اٹھائی اور کہا: ”جا کر شاہ سے کہہ دینا میں ایران کی کسی شاہراہ پر کھڑا ہو کر لوگوں کو آواز دوں گا، اسے اہل ایران اگر تم شاہ سے نجات چاہتے ہو تو دو، دو تھمن لے کر میرے پاس آ جاؤ، میں تمہیں ہزاروں برس کی غلامی سے آزاد کرادوں گا۔“ درویش رکا، ٹھوڑی کے نیچے سے انگلی کھینچی اور واپس مڑ کر بولا: ”بال کمانڈ۔ مجھے یقین ہے شام تک ۲ ملین نہیں، ۴ ملین ڈالر جمع ہو جائیں گے۔“

مجھے اب تک بہاؤنگر کے فاقہ زدہ خاندان کے لیے ۴۲ ٹیلی فون کالز موصول ہو چکی ہیں، جن میں ”مبارہ حضرات نے ایک، ایک لاکھ روپے، نو اشخاص نے پچاس، پچاس ہزار اور باقی بائیس خواتین و حضرات نے پانچ سے تیس ہزار روپے کی پیشکش کی۔ یہ سب میرے اور آپ جیسے لوگ تھے، عام ملازمین، چھوٹے دکاندار، معمولی بزنس مین، ان میں نہیں تھا تو ۲۱ ارکان قومی اسمبلی میں سے کوئی نہیں تھا، ۱۳ وفاقی و صوبائی

وزراء سے کوئی نہیں تھا، ۳۸۳ ارکان صوبائی اسمبلی سے کوئی نہیں تھا، ۸ سینٹروں سے کوئی نہیں تھا، ۱۵ ہزار راشی بیورو کزنس سے کوئی نہیں تھا، ملک کے ۸۰ فیصد وسائل پر قابض ۲۷ ہزار سرمایہ داروں سے کوئی نہیں تھا، ۴۰ ہزار چھوٹے بڑے سیاستدانوں سے کوئی نہیں تھا، ۲ ہزار جاگیرداروں سے کوئی نہیں تھا، نج کاری کی دلالی سے ہاتھ منہ کالا کرنے والے ۱۹ ایجنٹوں سے کوئی نہیں تھا، فیصل آباد کے موٹے تاجروں اور ہال روڈ کے پھولی گردنوں والے بزنس مینوں سے کوئی نہیں تھا، ہاں ان ۳۴ لوگوں میں اشرافیہ، حکمران طبقے اور مالدار اسامیوں سے کوئی نہیں تھا، یہ سب میرے اور آپ جیسے لوگ تھے، عام ملازمین، چھوٹے دکاندار، معمولی بزنس مین۔

آپ نے نجاشی کے دربار میں حضرت جعفر علیاؤ کی تقریر ضرور پڑھی ہوگی، جب حضرت جعفر کی خطابت نے صحنوں کے دل بکھلا دیئے تو نجاشی نے سوال کیا، معزز مہمان آپ کے سننے میں جتنے بھی غلطیوں سے پہلے کن لوگوں نے قبول کیا، حضرت جعفر علیاؤ نے جواب دیا: ”اے بادشاہ حضرت محمد ﷺ پر ایمان لانے والے عام لوگ ہیں، غلام ابن غلام ہیں“ نجاشی نے سنا تو بلا خوف تردد بولا: ”اے مہمان تمہارا نبی ﷺ سچا ہے۔“

میں نے جب یہ واقعہ پڑھا تو طویل عرصے تک اس سوچ میں غلطیاں رہا کہ آخر چنانچہ کا غلاموں کے قبول اسلام سے کیا تعلق ہے، مدت بعد پتا چلا، معاشروں کو تو عام شخص ہی زندہ رکھتا ہے۔ تبدیلیاں دو اطراف سے معاشروں پر اترتی ہیں۔ ایک اوپر سے دوسری نیچے سے، بالائی طبقے سے جو کہ نیچے آنے والی تبدیلی جھوٹی ہوتی ہے جبکہ نیچے طبقے سے اوپر آنے والی تبدیلی سچی ہوتی ہے، انقلابی ہوتی ہے۔ اور یہ بھی کہ جب تک عام شخص اچھائی اور برائی پر رد عمل ظاہر کرتا ہے، معاشرے کو موت نہیں آتی، تو میں مرنی نہیں۔

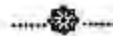
آپ نجاشی کے اس فلسفے کو ایک دوسرے زاویے سے بھی پرکھ سکتے ہیں، آپ پاکستان میں چھپنے والے انگریزی اخبارات اور جرائد اٹھا کر دیکھیں، ان میں اسلام، پاکستان، علمائے کرام اور قائد اعظم اور ملا۔ اقبال جیسے اکابر کے خلاف کیا کچھ شائع نہیں ہوتا، لیکن اس پر کبھی کوئی رد عمل سامنے آیا؟ جبکہ اس کے مقابلے میں آپ اس قسم کا اعشار یہ ایک فیصد مواد اردو اخبار میں چھاپ کر دکھا دیں لوگ سڑکوں پر آجائیں گے، ہر چیز جس میں جس کر دیں گے، کیوں؟ کیونکہ جتنا عام شخص اسلام، اس ملک اور اس کے اکابرین سے کبھی ہے، خاص شخص اس کا عشر عشر بھی نہیں اور یہی وہ چیز ہے جو ثابت کرتی ہے یہ معاشرہ ابھی نہیں مرا، اس میں ابھی ۹۰ فیصد لوگ زندہ ہیں۔

دوسری ”الارنگ“ بات یہ ہے کہ ہمارا بالائی طبقہ ہمارے زیریں، محروم اور پسے ہوئے طبقے سے اتنا دور جا چکا ہے کہ اس کی ”فیلنگ“ تک تبدیلی ہو چکی ہیں۔ جس بات پر عام شخص چیخ اٹھتا ہے، مگر کامان تک سچ کر امداد کے لیے نکل کھڑا ہوتا ہے، اس پر ہمارے امراء، حکمران اور ”سقراط و بقرط“ ایڈیٹیڈ پریس پر بیٹھ کر فقط مسکراتے رہتے ہیں، عام شخص کی اس حرکت کو ٹھہر دیکھنا اس جذبہ باتیت بے ساختہ رد عمل اور خود کشی جیسی حماقت قرار دیتے ہیں۔

ہاں ایک کروڑ بے حس لوگوں کے باوجود یہ معاشرہ ابھی مرا نہیں کہ اب بھی لوگ پاکستانی کرکٹ ٹیم کی شکست قبول نہیں کرتے، سبز ہلالی پرچم نیچے نہیں مگرنے دیتے، قادیان کی توہین پر تھملا اٹھتے ہیں، پاک فوج کے جوان کا اٹھ کر استقبال کرتے ہیں، ہاں آج بھی پاکستان زندہ باد کے نعرے پر جان دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں، ایک خاندان کی بھوک پر اپنا سارا جمع جھٹالے کر حاضر ہو جاتے ہیں۔

ہاں، یقین فرمائیے مجھے یہ ۳۲ میلی فون کالیں ہم کی تک تک محسوس ہو رہی ہیں، مجھے یوں لگتا ہے اگر ان لوگوں کو کوئی ایسا شخص مل گیا جو شاہراہ دستور پر کھڑا ہو کر یہ اعلان کر سکے ”اے لوگو! اگر تم حکمرانوں سے جان چھڑانا چاہتے ہو، اس نظام کو اٹھا کر بحرحرب میں پھینکنا چاہتے ہو، تو دو، دو روپے لے کر میرے پاس آ جاؤ میں تمہیں ہمیشہ کے لیے نجات دلا دوں گا۔“ تو یہ لوگ اپنا سارا اثاثہ لے کر اس کے گرد جمع ہو جائیں گے۔

مجھے محسوس ہوتا ہے، جیسے میں صبح صادق کے روشن دھندلکے میں اپنا بیٹھا ہوں، ابھی چند لمبے بعد صبح کی پہلی کرن پھوٹے گی اور اس کو نے سے اس کو نے تک روشنی ہوگی۔ روشنی ہی روشنی۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

قوم تو بری نہیں

قوموں کی زندگی میں اس سے زیادہ برے وقت گزرے ہیں۔

آپ جاپان کی مثال لیں، اس جاپان کی مثال جس کے بارے میں لطیف مشہور ہے جب نیل آرم سڑانگ چاند پر اترتا تو اسے وہاں ایک رنگ آلود مشین ملی وہاں نے حیرانی سے مشین کو الٹ پلٹ کر دیکھا تو مشین کی پشت پر ”میزان جاپان“ کا شیکر چپکا ہوا تھا، لیکن اس جاپان میں آج سے دو صدیاں پہلے کشتی بنانے والے کاریگر کو پھانسی چڑھا دیا جاتا تھا جبکہ جاپانوں پر اٹھارویں صدی تک سمندری سفر اور غیر ملکوں سے تجارت پر پابندی تھی، جاپانی شہنشاہ کس قدر جاہل اور غیر سائنسی نظریات کے حامل تھے اس کا اندازہ ۱۶۳۶ء کے اس شاہی فرمان سے لگایا جاسکتا ہے جس کے ذریعے جاپان میں بحری جہازوں کی تیاری کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا تھا لیکن آج نہ صرف دنیا میں سب سے زیادہ سائنس دان اور انجینئر جاپان میں ہیں بلکہ یہی دنیا کی سب سے بڑی تجارتی طاقت بھی سمجھا جاتا ہے۔

آپ چین کی مثال لیں، دنیا اس ”سپر پاور“ کو سزا ہی برس پہلے تک ”افنی ریاست“ پکارتی تھی، چین میں بھی سمندر پار تجارت اور مادی گیری پر پابندی تھی، اس کے شہنشاہوں نے بھی سائنسی ترقی کا راستہ روکنے کے لیے ۱۷۶۶ء میں ملک بھر کی بھٹیاں بجھا دی تھیں، انقلاب کے بعد کی صورت حال بھی کچھ اتنی حوصلہ افزا نہیں تھی کیونکہ ماؤزے تنک نے نہ صرف میاں بیوی کے ”تعلقات“ پر پابندی عائد کر دی تھی بلکہ تعلیمی ادارے بھی بند کر دیئے تھے جو برسوں بند رہے لیکن آج بھی چین دنیا کی جدید ترین اقوام کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہے۔

آپ برطانیہ کی مثال لیں، اس ملک میں فکری آزادی کا یہ عالم تھا کہ ولیم ٹیل کو بائبل کا ترجمہ کرنے کے جرم میں زندہ جلا دیا گیا تھا، سیاسی شعور کی یہ حالت تھی کہ طوائفوں کی سفارش پر سردار ہٹ واپول کو وزیراعظم بنادیا گیا تھا، ہا انصاف تو ۲۰ ویں صدی کے وسط تک گورے کے ہاتھوں کالے کے قتل کی سزا فقط ۱۶ روپے جرمانہ تھا جن میں سے ۱۳ روپے سرکاری خزانے میں جمع کرائے جاتے تھے، باقی رہی صنعتی پیداوار تو ۱۸۹۳ء میں اس ”صنعتی جن“ کی شرح پیداوار ایک اشاریہ پانچ فیصد تھی لیکن آج بھی برطانیہ سلیمان رشتہ

اور سلیہ نسرین جیسے شخصوں کی شخصی آزادی کے لیے تڑپ رہا ہے، دنیا جہاں کے میرر سٹوں کو سیاسی پناہ دے رہا ہے۔

آپ پورے یورپ کی مثال لیں، اس یورپ کی مثال جس میں ۱۷ ویں صدی تک ارسطو اور افلاطون کے نظریات سے اختلاف کی سزا، سزائے موت تھی، اس اٹلی پر نظر ڈالیں جو آج ڈاکٹر عبدالسلام کی سائنسی خدمات کے اعتراف میں اپنی ایک جدید ترین لیبارٹری ان کے نام منسوب کر دیتا ہے اس میں گلیلیو جیسے سائنس دان کو "زمین سورج کے گرد گھومتی ہے" کے اعلان پر سزائے موت کا حکم سنا دیا گیا تھا، اس سائنز ریلینڈ کو دیکھیے جسے آج دنیا کی جنت قرار دیا جاتا ہے وہ کل تک کرائے کے فوجیوں کا کیمپ تھا، اس فرانس کو لیجے آج جس کا جی این پی ۵۲ اسلامی ممالک کے مجموعی جی این پی سے زیادہ ہے اس کے شہنشاہ لوئیس XVI نے اپنی ملکہ میری اینٹونیٹی کو سرے محل سے ہزاروں گنا قیمتی محل "پیٹ ٹریاٹن" گفٹ کیا تھا، انھارویں صدی کی آخری ساتوں تک شاہ فرانس تنگای دربار میں آجاتا تھا جبکہ امراء اور وزراء دربار ہی میں پیشاب "فرما" دیتے تھے۔ پرنسپل کو دیکھیے، بحری قزاقوں کے اس ملک میں آج بھی ایک ایسی مارکیٹ موجود ہے جس میں چوری کے مال کی خرید و فروخت کو قانونی تحفظ حاصل ہے، باقی ری یورپ کی مذہبی رواداری تو جتنے چرچ پریسٹس اور ایکسٹریکٹس کی جنگ میں جلائے گئے اور جتنے مذہبی رہنما یورپ کی اس "ڈاکٹر ایچ" میں نقل ہوئے، اس کی مثال دنیا کی پوری تاریخ میں نہیں ملتی۔

آپ امریکہ کی مثال لیں، غلاموں کی جتنی بڑی تجارت اس ملک نے کی اتنا "کریڈٹ" کسی دوسری قوم کو نہیں جاتا لیکن آج انسانی حقوق کا تحفظ تو رہا ایک طرف امریکہ ہر سال کتوں کی خوراک اور ادویات پر ۱۷ ارب ڈالر خرچ کرتا ہے۔

جی ہاں قوموں کی زندگی میں تو اس سے بڑے وقت بھی گزرے ہیں، پاکستانی معاشرے کا زوال تو کوئی زوال ہی نہیں، ہمارا بحران تو تاریخ کے بحرانوں میں کوئی معافی ہی نہیں رکھتا، درست ہے ہماری شرح خواندگی ۴۰ فیصد ہے لیکن پھر بھی ہم ان ملکوں سے تو بہتر ہیں جن کے تعلیمی ادارے بحرانوں میں برسوں تک بند رہے، ٹھیک ہے یہاں غربت انتہائی پستی کو چھو رہی ہے لیکن پھر بھی ہم ان "مہذب معاشروں" سے تو بڑا درجے بہتر ہیں جن میں سفید فام سیاہ فاموں کے بچے بھون کر کھا گئے تھے، صحیح ہے یہاں شخصی آزادیوں کی پاسداری نہیں ہوتی لیکن پھر بھی ہم ان گوروں سے تو بڑا رہنا بہتر ہیں جو ہٹلر کا ترجر کرنے والوں کو زندہ جلا دیا کرتے تھے، سچ ہے یہاں انصاف نہیں لیکن پھر بھی ہم ان مشفقوں سے تو لاکھ درجے بہتر ہیں جن کے نزدیک انسانی زندگی کی قیمت فقط دو روپے تھی، حق ہے یہاں بے ایمان سیاسی قیادت ہی برسرِ اقتدار آتی ہے لیکن پھر بھی ہم طوائفوں کی سفارش پر وزیرِ اعظم بنانے والوں سے تو بہتر ہی ہیں، درست ہے یہاں فرقوں میں وسعت قلبی نہیں لیکن پھر بھی ہم درجہ حرارت اور اکھاڑا "ناغہ" کے رقص کرنے والے کیتھولکس سے تو بہتر ہیں۔

یہ بھی سچ ہے حالات بہتر نہیں، قوم قدم قدم پیچھے کھسک رہی ہے لیکن اس کے باوجود ہم ابھی ان بحرانوں سے کوسوں دور ہیں جن سے امریکہ، جاپان، چین، برطانیہ، روس، جرمنی، فرانس اور اٹلی جیسے ملک گزرے تھے، ابھی شام کو بہت دیر باقی ہے کیونکہ ابھی ہم خدا سے اور خدا ہم سے مایوس نہیں ہوا۔ دوسری جنگ عظیم میں چرچل نے کہا تھا: "ہم جنگ نہیں ہاریں گے کیونکہ ہمارے پاس ابھی خون، پیسہ، محنت اور آنسو باقی ہیں۔" لہذا قارئین کرام میں بھی جب "سو کالڈ" دانشوروں کے منہ سے اس ملک کی بربادی کی "وعید" سنتا ہوں تو ناچانے کیوں میرا دل گواہی دیتا ہے، نہیں ایسا کبھی نہیں ہوگا کیونکہ ابھی اس ملک کے ۳۴ کروڑ عوام کی رمگوں میں غیرت مند لہو، تخلیق کے لیے پیسہ، کوشش کے لیے محنت اور بارگاہ الہی میں پیش کرنے کے لیے آنسو موجود ہیں لہذا ہم بالکل نہیں ہاریں گے، کیا ہوا سیاستدان برے ہیں لیکن قوم تو بری نہیں۔ میرا دعویٰ ہے اس قوم کو آنے والے چند برسوں میں ایک ایسا نجات دہندہ ضرور ملے گا جو اسے ان اقوام کی قطار میں لاکھڑا کرے گا جن کی ترقی دیکھتے ہوئے آج ہمارے سروں سے ٹوپیاں گر جاتی ہیں کیونکہ جب خدا قوموں کا مقدر بدلتا ہے تو وہ بکریاں چرانے والے گڈریوں تک کو پیغمبر بنا کر بستیوں میں اتار دیتا ہے۔



Kashif Azad @ OneUrdu.com

آئیے سوچیں

دیئے تو گاؤں شہر سے صرف تین کلومیٹر تھا لیکن سڑک نہ ہونے کے باعث تیس چالیس میل دور محسوس ہوتا تھا۔ بارشوں کے موسم میں تو اس فاصلے میں بھی کئی گنا اضافہ ہو جاتا تھا۔ پورے گاؤں میں کوئی ٹریکٹر، کوئی ٹیوب ویل نہیں تھا، زمین کھودنے سے کٹائی تک اور کٹائی سے صفائی تک سارے کام بیلوں ہی سے لیے جاتے تھے، ان بیلوں کو ہم اپنی زبان میں ”جوڑی“ یا ”جوڑی“ کہتے تھے، جن کسانوں کا آبپاشی کے لیے اپنا کٹواں نہیں ہوتا تھا وہ اپنے کھیت کے لیے کسی دوسرے سے پانی مانگ لیتے تھے، ہاں البتہ انہیں اس کام کے لیے اپنے بیل لانے پڑتے تھے لیکن بد قسمتی سے جن لوگوں کے قرب وجوار میں کوئی کٹواں نہیں ہوتا تھا وہ زمین ہموار کرتے اس پر بچ بکھیرتے اور بارش کے لیے دوبارہ پر چڑھاؤ چڑھاتے چلے جاتے، ان دنوں چڑھاؤں میں بھی بڑی برکت ہوتی تھی، وہاں میں بھی عموماً قبول ہو جاتی تھیں چنانچہ اکثر بیج ضائع ہونے سے پہلے پہلے دو تین بارشیں ہو جاتیں جن کے نتیجے میں ہر گھر میں سال بھر کے لیے غلہ جمع ہو جاتا۔

گاؤں میں کیونکہ بجلی نہیں تھی۔ چنانچہ مغرب سے فورا بعد پورا گاؤں تاریکی میں دفن ہو جاتا، لوگ ضرورت پڑنے پر مٹی کے تیل کی لائٹیں یا سروس کے تیل کا دیا جلا لیتے تھے تاہم اس فضول خرچی کو اچھا تصور نہیں کیا جاتا تھا۔ لوگوں کے پاس کپڑے بھی نہیں ہوتے تھے ہنڈا چھوٹوں سے لے کر بڑوں تک تمام لوگ دھوٹی یا جینز ہی میں لباس نظر آتے، گاؤں میں دو تین لوگوں کے پاس کرتے بھی تھے لیکن وہ انہیں عموماً موسم تبدیل ہونے پر ہوا لگوانے یا کسی شادی بیاہ یا پھر گاؤں میں تھانیدار کی آمد پر ہی باہر نکالتے تھے، کبھی لمبی، باجرے کی سوئی روٹی اور چار گاؤں بھر کا بریک فاسٹ ہوتا تھا اور لچ بھی۔ رہا ڈنر تو اس میں لمبی کی جگہ کچے دودھ کا پیالہ لے لیتا تھا لیکن اس کا ہرگز ہرگز یہ مطلب نہیں کہ گاؤں میں مرغی یا ترکاری کبھی ہی نہیں تھی۔ یقیناً ایسا حادثہ بھی کبھی کبھار ہو جاتا تھا لیکن اس کے لیے گاؤں بھر کو رانی کھیت یا سبزیوں میں دھنی مٹی کا انتظار کرنا پڑتا تھا، دو تین ہزار کی اس آبادی میں طبیب بھی نہیں تھا اگر کبھی کوئی شخص بیمار ہو جاتا تو وہ مولوی صاحب سے پھونک مروا کر یا تعویذ پڑھ کر ہی تندرست ہو جاتا۔ اگر کہیں زیادہ خراب ہوتا تو مولوی صاحب مریض کو کوئی نہ کوئی بونی ابال کر چلا دیتے، ایک آدھ بار کسی مریض کو شہر بھی لے جایا گیا لیکن مریض کی واپسی تک لواحقین اس

کے لیے قہر تیار کرنا چکے ہوتے تھے کیونکہ ان دنوں ہسپتال جانے والے مریضوں کے بارے میں لوگوں کی یہی رائے ہوتی تھی کہ ان کا وقت پورا ہو چکا ہے۔ سکول پورے ملاتے میں کوئی نہیں تھا لہذا اگر کسی کو دماغ کے خلل کے باعث تعلیم کی حاجت ہو جاتی تو اسے اپنے مبین تک پہنچنے کے لیے روزانہ آٹھ دس میل سفر کرنا پڑتا۔ اس پورے گاؤں کی کوئی گلی، کوئی نالی، کوئی چھت اور کوئی گھر بچا نہیں تھا، ایک ایک انچ سے کچی مٹی کی خوشبو آتی تھی۔

یہ آج سے بیس برس پرانا "شاہ سرست" ہے جس میں میرا پورا بچپن گزرا، اس دور میں اس گاؤں میں پیٹ بھر کر کھانا نہیں تھا، تعلیم نہیں تھی، صحت نہیں تھی، بجلی سڑک اور ٹیلی فون نہیں تھا لیکن اس کے باوجود وہاں غربت نام کی کوئی چیز نہیں تھی، میں نے اپنے پورے بچپن میں غریب، نادار، لاچار، بے چارہ اور "شہودا" جیسے لفظ نہیں سنے لیکن ۲۰ برس بعد اب اس گاؤں کی کایا پلت چکی ہے، اب اس میں شہر تک پکی سڑک ہے۔ ہر آدھ گھنٹے بعد ایک وٹن یہاں آتی ہے اور ایک یہاں سے واپس جاتی ہے ہر گھر میں بجلی کی ٹیوب لائٹس روشن ہیں۔ ہر چھت پر پی وی کا اونچا انٹینا لگا ہے، تقریباً ہر گھر میں بجلی کے پتکے، فریج اور فلیش سسٹم ہے، گاؤں میں دو درجن سے زائد ٹیوب ویل اور اتنے ہی ٹریکٹر ہیں زمین کی ایک ایک انچ پیداوار دے رہی ہے۔ ایک ایکڑ زمین کا وہ ٹکڑا جو کبھی تین چار پوری اناج دیتا تھا اب اس سے سات آٹھ پوری تک پیداوار حاصل ہوتی ہے، پورے گاؤں میں بچوں سے لے کر بوڑھوں تک ایک ایک بھی ایسا نہیں جو تین وقت سالن کے ساتھ کھانا نہ کھاتا ہو، کولڈ ڈرنکس سے مہمانوں کی تواضع ہوتی ہے۔ بیٹے عشرے میں ایک آدھ پتلون کوٹ بھی نظر آ جاتا ہے جسے دیکھ کر اب گاؤں کے کتے بھی دم ہلاتے ہیں۔ تلاش کریں تو "بھوں" پر نشو و نما بھی دستیاب ہیں۔ ایک آدھ شخص کے پاس گاڑی بھی ہے۔ موٹر سائیکل تو اکثر لوگوں کے پاس ہے لیکن اس تمام خوشحالی اور اللہ تعالیٰ کے کرم کے باوجود میں جب بھی سال چھ ماہ بعد گاؤں گیا میں نے لوگوں کو غربت، پسماندگی اور محرومی کا رونا روتے ہوئے ہی پایا، انہیں لوڈ شیڈنگ، سوئی گیس، ڈبل سڑک، اسپتالٹ ڈاکٹر، آرام دہ سواری، میٹرنی ہوم، ریسٹوران، کھیل کے میدان اور کئی سمنز ہونے پر شاک ہی پایا، تب میں اس گاؤں سے لوٹتے ہوئے ہر بار سوچتا ہوں جب یہ گاؤں مٹی کا ڈھیر تھا تو یہاں غربت نام کی کوئی چیز نہیں تھی لیکن آج جب اس میں جدید زندگی کی زیادہ تر سہولتیں موجود ہیں تو اس کا ہر پاسی غریب ہے اسے پسماندگی، محرومی اور پیچھے رہ جانے کا احساس تلک کر رہا ہے کیوں؟ آخر کیوں؟

یقین فرمائیے جب میں اس گاؤں سے نکل کر اس پورے ملک پر نظر دوڑاتا ہوں تو مجھے اس کی کہانی بھی اپنے "غریب" پسماندہ اور محروم" گاؤں سے مختلف نظر نہیں آتی، یہ تلک جب آزاد ہوا تو اس کے پاس کیا تھا صرف ۱۳ ہزار کلومیٹر سڑک، ۱۲ ہزار گاڑیاں، ۱۲ ہزار ٹیلی فون لائنیں، ایک ہزار میٹر قابل کاشت رقبہ اور ۲۵ میگا واٹ بجلی..... بس لیکن اس وقت کسی کو اس کی غربت، محرومی اور پسماندگی کا احساس نہیں ہوا، کسی نے نہیں سوچا ہم اس کمزور، نادار اور لاچار ملک میں کیسے زندگی گزاریں گے، ہمیں یہ نہیں چاہیے ہمیں تو ہمیں ٹھکاتے

یادہلی میں ہی رہتا ہے لیکن آج جبکہ اسی ملک میں سڑکوں کی لمبائی ۲۲ لاکھ ۸۰ ہزار ہو چکی ہے، گاڑیوں کی تعداد ۳۶ لاکھ ۷۰ ہزار سے تجاوز کر چکی ہے، اس میں ۲۳ لاکھ ۷۰ ہزار ٹیلی فون لائنیں، ۷۷ ہزار ۱ سو ۷۷ ڈاکٹر اور ۸۶ ہزار ۹ سو ۲۱ مریضوں کے لیے بند ہیں۔ اس میں ۱۳ ہزار ۳۷ میگا واٹ بجلی پیدا ہوتی ہے، اور اس کی برآمدات چار سو چالیس ملین ڈالر سے نو ہزار ملین ڈالر ہو چکی ہیں تو یہ ہمیں غریب، پسماندہ اور محروم نظر آنے لگا ہے، جب اس کے پاس چند نوٹی بند قوتوں اور گیلے بارود کے چند کسوں کے سوا کچھ نہیں تھا تو یہ ہمیں اتنا عزیز تھا کہ ہم اپنی بنیاں اپنی بیویاں اور اپنے بہوئیں سینکڑوں میل دور چھوڑ کر آگئے اور کبھی اس قربانی پر ملول نہیں ہوئے لیکن جب یہ ملک ایشی طاقت بن گیا، امریکہ تک اس کی رائلٹوں اور گولیوں کے خریدار بن گئے تو یہ ہمیں برا لگنے لگا، ہم اس سے بیزار ہو گئے۔ کیوں، آخر کیوں؟

آئیے آپ اور میں دونوں ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچیں کہیں ہمارے ساتھ کوئی گڑبڑ تو نہیں ہو گئی، کہیں ہم اپنے دشمنوں کے پروپیگنڈے کا شکار تو نہیں ہو گئے، آئیے سوچیں کہیں ہمارے دشمن میکاؤلے کے اس فلسفے پر تو علمدراہ نہیں کر رہے؟ اگر تم کسی قوم کو جنگ کے بغیر فتح کرنا چاہتے ہو تو اسے احساس کمتری کا شکار بنا دو، وہ ہمیشہ تمہاری غلام رہے گی۔ آئیے سوچیں جس قوم کو اس کا انہم جم بھی غریب، پسماندگی اور محرومی کے احساس سے نہیں نکال سکتا، جسے صاف پانی کی کمی اور نوٹی پھونی سڑکیں تو نظر آتی ہیں لیکن زمین اور آسمان سے نازل ہونے والے افغاناٹ و اگراناٹ دکھائی دیتے، کیا اسے زندہ رہنے کا حق حاصل ہے، آئیے سوچیں۔ آئیے مہلت ختم ہونے سے پہلے سوچیں۔





خانہ بدوش شیشوں پر اترتے ہوئے تم نے کہا تھا ”اپنے اندر کی تپتی کیم کرو، ہنسنا بھی سیکھو، ڈولڈ“ میں نے وعدہ کر لیا۔ آج اس وعدے کی نویں برسی ہے۔

تم خود دیکھ لو، میں وعدے کا کتنا پکا قول کا کتنا کھرا ہوں، میں ہنس رہا ہوں، اس کے باوجود ہنس رہا ہوں کہ حالات کا تصور میرے حلق اور نظام کی سم میری زبان تک پہنچ چکی ہے، باہر کی تپتی کیم میرے اندر کی تپتی سے مل کر تڑپ رہی ہو چکی ہے اور یہ ہر دلوں کی ہر حرکت کے ساتھ میری رگوں سے اُلجھتا اور میری سانسوں سے جھگڑتا ہے۔

میں ان نو برسوں میں کتنی کامیابیاں چکا ہوں، کڑواہٹ کا نیو پاری بن چکا ہوں، میں روز اس معاشرے سے کڑواہٹ خریدتا ہوں، اسے کاٹ کر، ہنس کر اس کی چاؤ بچاتا ہوں، تپتی کیم کی چاؤ اور... اور کھرا ہوں چاؤ کو کھونٹے چھوڑ کر اسے بے نظروں اور زندگی کی چند شرمندہ سانسوں کے بدلے اسی معاشرے کے ہاتھوں بچھ دیتا ہوں، یہ میری زندگی ہے اور یہی میرا آخر، لیکن تم تو بس اتحاد کیجھو، میں اپنے قول کا کتنا کھرا اور اپنے وعدے کا کتنا پکا ہوں۔

ایک وعدہ تم نے لیا تھا، ایک وعدہ آج میں تم سے لیتا چاہتا ہوں، اگر تم کسی ایک مثال، کسی ریلوے شیشوں کے کسی شیکس میں یہ کتاب دیکھو تو تم صرف اس صفحے، اس تصور پر اکتفا کرنا کہ جہیں اس صفحے، اس تصور کے سوا کہیں کوئی خوشخبری، کہیں کوئی خوشی نہیں ملے گی کیونکہ میں نے جب بھی یہ وعدہ نبھایا، میں جب بھی ہنسنا میری انگلیاں رو رہیں، میری پوری پہنچ لگیں۔

Rs. 500/-

علم و فن پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40- اردو بازار، لاہور۔

فون: 7232336، 7352332، فیکس: 7223584

www.ilmoirfanpublishers.com

E-mail: ilmoirfanpublishers@hotmail.com

Designed by
FAZEL KHAN